# اِنشائے ماجد

اوّل

یعنی

## مقالاتِ ماجد

جد دریابادی

## حصۂ اوّل

(جو پہلے مقالات ماجد کے نام سے شائع ہوا)

نظرثانی، ترمیم واضافہ کے بعد

عبدالماجد دریابادی

قیمت
مجلّد پانچ روپیہ

بہ اہتمام
نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ
ٹیلیفون ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۴۵۵۹

ناشر: عزیز الرحمٰن (دسمبر ۱۹۶۲ء) پرنٹر: شاہی پریس لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# عرضِ حال

خدا کی شان، ایک کم سواد، کم استعداد، قصباتی، دیہاتی کو بھی اس کا حوصلہ کہ اپنا نام ادیبوں، انشاپردازوں کی فہرست میں لکھائے اور دل میں ولولہ کہ زبان و ادب کی خدمت کرنے والوں کی صف (صفِ آخر سہی) میں جگہ پائے۔

"اس حوصلہ کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے"

اسرائیلیوں کی زبان میں لو اور سلو، میاں طالوت کا شمار بھی ہیروں میں ہونے لگا مصر کی غریب ضعیفہ کو شوق یوسفؑ کی خریداری کا چرایا۔

اہلِ کرم کی ذرہ نوازی، دوستوں کی بے جا طرح وحوصلہ افزائی اور پھر اپنا ذوقِ نمائش، یہ سب مل ملا کر جو بھی کر گزریں، تھوڑا ہے۔

پرانے اور نئے ایسے مضمون جنہیں کچھ نہ کچھ مناسبت ادب و زبان سے ہو، رائے یہ ٹھہری کہ یکجا کر لئے جائیں بعض ان میں کے نسبتۃً حال کے ہیں اور بعض ۳۰ ۳۵ سال قبل کے اتنے عرصہ میں قلم کا مذاق کچھ سے کچھ ہوگیا۔ اس لئے نظرثانی، اور وہ بھی جزئیات کی حد تک، ان قدیم تحریروں پر بھی کرلی گئی، کہ طرز و عبارت میں یکسانی کسی درجہ میں تو پیدا ہی ہو جائے مجموعہ کانٹ چھانٹ کے بعد کم سے کم تین جلدوں میں آپایا ہے۔

پہلی جلد حاضر ہے، دوسری جلد بھی انشاء اللہ جلد ہی پیش ہو جائے گی، اسکے

---

لہ نسیم بکڈپو لکھنؤ سے شائع ہوچکی

بڑے عنوانات حسب ذیل ہوں گے۔

(۱) چند مقالے (مرزا رسوا کے قصے۔ نیا آئین اکبری۔ پریم چند وغیرہ)

(۲) چند نشریے (ریڈیو سے نشر کی ہوئی تقریریں)

(۳) چند مرثیے (تعزیتی مضامین)

پھر اس کے بعد، بہ شرط زندگی نمبر تیسری جلد کا آئے گا۔ جو باکمال اس میٹھی پھیکی غذا پر منھ بنائیں گے، وہ محض اپنی خوش ذوقی اور حقیقت سنجی کا ثبوت دیں گے اور جو پردہ پوشی سے کام لیں گے وہ کرم فرمائی اور صفت ستاری کا نقش بٹھا دیں گے مقام عدل و مقام فضل دونوں اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ دوسرا پہلے سے خوب تر ہے اور اس سے اعلیٰ و برتر۔

یہ دیباچہ جلد اول کے طبع اول کا تھا جو بمبئی سے شائع ہوا تھا۔ طبع ثانی کی اشاعت لاہور سے ہوئی۔ اور کتاب نے ہندوستان اور پاکستان کی بعض یونیورسٹیوں کے کورس میں جگہ پائی اور اب یہ تیسرا ایڈیشن نسیم بکڈپو، لکھنؤ سے شائع ہو رہا ہے اگر اللہ کو منظور ہے تو جلد سوم کی نوبت اس کے بعد آئے گی۔

عبدالماجد
دریاباد۔ ضلع بارہ بنکی
فروری ۱۹۶۱ء

# فہرست مضامین

# چند مقالے

# غالب کا ایک فرنگی شاگرد[1]

## آزاد فرانسیسی

پچھلے نمبر کے شذرات (معارف) میں اُردو کے چند فرنگی شاعروں کا جو مختصر تذکرہ آگیا تھا۔ ناظرین کرام نے اس سے دلچسپی کا اظہار کیا اور احباب کو یہ داستان خوشگوار اور پرلطف معلوم ہوئی۔ ان حضرات کی ضیافت ذوق کیلئے ایک فرنگی شاعر کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

الگزینڈر ہیدرلی ایک فرانسیسی خاندان کے رکن[2] تھے۔ ولادت غالباً ہندوستان ہی میں ہوئی تھی۔ سال ولادت تقریباً ۱۸۲۹ء۔ اٹھارہ سال کی عمر سے اُردو شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ مشورہ سخن کیلئے کلام نواب زین العابدین خاں عارف[3] (شاگرد عزیز مرزا غالب) اور خود غالب کی خدمت میں بھیجنا شروع کیا۔ ان حضرات کا فیض توجہ کہئے، یا خداداد کی طباعی کہ کچھ ہی روز میں اچھی خاصی مشق حاصل کرلی اور کلام میں وہ پختگی آگئی، جو ایک غیر قوم کی فرد کے لئے بہت بڑی بات ہے۔ عمر نے وفا نہ کی۔ کل ۴۲ سال کی عمر

---

[1] معارف (اعظم گڈھ) جنوری ۱۹۲۲ء۔

[2] تذکرہ خمخانۂ جاوید، از لالہ سری رام ایم۔ اے۔

[3] یہ وہی عارف ہیں جن کی جوان مرگی پر غالب نے اپنا وہ مشہور مرثیہ کہا ہے ؎

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

(یہ مرثیہ مطبوعہ دیوان غالب (اردو) میں درج ہے)

میں ۸ جولائی ۱۸۶۱ء کو انتقال کیا۔ تاہم اس نوعمری میں کلام کا مجموعہ جس قدر ہو گیا تھا وہ اوسط ضخامت کے دیوان کیلئے کافی تھا۔ چنانچہ وفات کے دوہی برس بعد ان کے برادر کلاں طامس ہیدرلی نے اس دیوان کو شائع کر دیا۔

تخلص آزاد کرتے تھے۔ اس لئے دیوان بھی دیوان آزاد کے نام سے موسوم ہے ضخامت ۱۷۰ صفحہ ہے۔ مطبع احمدی آگرہ سے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ اب بازار میں نایاب ہے۔ میرے پیش نظر کتب خانہ سرکاری رامپور کا نسخہ ہے۔

ابتدا میں دو دیباچے ہیں۔ پہلا دیباچہ فارسی میں منشی شوکت علی ساکن شاہپور ضلع فتحپور کا ہے۔ اب یہ صاحب خود گمنام اور محتاج تعارف ہیں۔ اپنے زمانہ میں مشہور منشیوں میں شمار ہوتے ہونگے۔ طرز بیان وقت کے عام تقریظ نگاروں کے دستور کے مطابق شاعرانہ ہے اور بعض بیانات اچھے خاصے مبالغہ آمیز۔ حمد و نعت کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

"قبائے ہنرمند و گوہر ذکا پیوند، خداوند عقل و تمیز صاحب فراست و ہر دلعزیز، مستعد ازلی الگزینڈر ہیدرلی کہ ذہن و ذکا او خلعتش خمیر بود و سعادت و مروت در ضمیر جاپذیر در سن ہیزدہ سالگی بشنیدن اشعار اساتذہ متقدمین و متاخرین طبع وقادش در تحصیل کمالش توجہ نمود گاہ گاہ ہنگام فرصت، بمطالعہ تصانیف اوستاداں پرداختے، و با محتشم الدولہ امیر الملک محمد اسد اللہ خاں بہادر سہراب جنگ غالب متخلص و نواب زین العابدین خاں متخلص بہ عارف کہ ہر دو حضرات از اکابر امرا و والا دودمان دہلی بودند بذریعہ مراسلات و مکاتبات استمداد سخن داشتے۔"

آگے چل کر اسی دیباچے میں یہ ذکر ہے کہ ہیدرلی کو طب میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا مریض عموماً ان کے علاج سے شفایاب ہوتے تھے، مزاج میں سخاوت و فیاضی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ دوائیں بلا قیمت تقسیم کرتے اور دوسرے طریقوں سے بھی غریبوں کی دستگیری کرتے رہتے خود عسرت سے بسر کرتے، لیکن دوسروں کی حاجت روائی کے لئے

قرض لینے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ ریاست الور میں توپ خانہ کے کپتان مقرر ہو کر گئے۔ اسی سال وفات پائی۔

دوسرا دیباچہ اُردو میں ہے اور یہ آزاد کے بڑے بھائی طامس ہیدرلی کے قلم سے نکلا ہے۔ یہ ریاست بھرتپور میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ یہ دیباچہ ذیل میں تمام وکمال درج کیا جاتا ہے، آج سے سو سال قبل کی ایک فرانسیسی کی اردو نثر کا نمونہ بجائے خود ایک یادگار رشتے ہے۔

نیازمند درگاہ لم یزلی طامس ہیدرلی ابن مسٹر جیمس ہیدرلی مرحوم بیان کرتا ہے اور اپنا رازِ دل صاحب دلوں پر یوں عیاں کرتا ہے کہ میرا حقیقی چھوٹا بھائی کپتان الگزینڈر ہیدرلی جوان سعادتمند شیریں زبان دانش پذیر ابتدائے عمر میں شعر و سخن کا مائل ہوا اور چند روز میں جیسا چاہیئے مایۂ سخنوری و معنی گستری اس کو حاصل ہوا کیونکر نہ ہو طبیعت دراک تھی۔ فکر چالاک تھی۔ جو کچھ دل سے زبان تک اور زبان سے قلم تک آیا۔ اس نے گلہائے معنی کا ایک تختۂ خوش رنگ دکھایا رفتہ رفتہ اس کے کلام کی وہ صورت ہوئی کہ ہم فنوں کو رشک ہوا اور دانشمندوں کو حیرت ہوئی۔ نواب زین العابدین خاں دہلی کے امیرزادہ عالی خاندان جو عارف تخلص کرتے تھے اور جناب نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالب کے شاگرد تھے وہ اس کے استاد تھے اور اس نوجوان کو اپنے استاد اور اپنے استاد کے استاد کے انداز پیش نظر تھے اور اکثر ان کے اشعار یاد تھے۔ میرے برادر موصوف بہت کچھ کہنے نہ پایا تھا بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ اسکے دل میں تھا، ابھی اس کی زبان پر نہ آیا تھا کہ ناگاہ وقت ناگزیر آپہنچا اور اس سعادت مند ازلی کو پیغام اجل آپہونچا۔ چونکہ سرکار الور میں عہدۂ کپتانی پر مامور تھا۔ دنیا سے سفر کرتے وقت میری نظر سے دور تھا۔ ایسا لائق ہونہار بھائی جس نے کل دو اوپر تیس برس کی عمر پائی۔ ساتویں جولائی ۱۸۶۱ء کو اس کا کام تمام ہوا۔ اس غم کا جس قدر بیان کیجئے اس سے سوا ہے، جو اپنا حال بنا ہے۔ اور جسقدر غم کیا جائے بجا ہے۔
ع این ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد، افسوس نہ فریاد میں فائدہ دیکھا نہ رونے میں

تاثیر پائی، بہت روئے پیٹے آخر صبر کرتے بن آئی۔ اشعار اس مرحوم کے جو پریشان جا بجا پڑے پائے گویا سرنے میں زمرد اور یاقوت کے نگینے جڑے پائے۔ خیال آیا کہ جواہر کو بکھرا پڑا رہنے دیجیے اور ان سب اشعار کو ردیف وار جمع کر کے دیوان مرتب کیجیے تاکہ جو کوئی دیکھے وہ کہے کہ اگرچہ اس شخص کی تھوڑی زندگی تھی مگر واہ اس قلیل مدت میں کیا گہر افشانی تھی۔ نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے مجھ کو یہ یقین ہے کہ جو کاغذ پر سیاہی سے لکھے گئے ہیں سو اس کے ماتم میں سیہ پوش ہوئے ہیں۔ الٰہی یہ مجموعہ اشعار مقبول طبع ہر سخنور ہواور الگزینڈر ہیڈرلی کی روح کو حضرت یسوع کے قدم مبارک میں مغفرت میسر ہو"

دیوان کی ابتداء "قصیدۂ حمد و وحدت" سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد "مسدس نعت مسیح" ہے۔ انہی صفحوں میں مختلف اعزہ، احباب اور والیان ریاست کی شان میں قصیدے ہیں بعض اچھے خاصے طویل ہیں صفحہ ۵۶ تک دیوان غزلیات ہے۔ باقی صفحہ ۹۵ تک متفرق قطعہ، مخمس، مرثیہ وغیرہ ہیں، حمد میں بالکل وہی رنگ ہے جو ایک مسلمان شاعر کا ہوتا ہے۔ توحید باری کی توصیف ہر شعر میں ہے اور اس پر طرح طرح کے شاعرانہ استدلال کیے ہیں مسدس مسیحی اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس کا رنگ بالکل وہی ہے جو مسلمان شعراء کا نعت گوئی میں ہوتا ہے۔ وہی ذوق و شوق وہی تضرع و الحاح اور وہی وابستگی و اعتماد شفاعت۔

تیری رحمت حامی رزق گدایاں یا مسیح  تیری بخشش تاج بخش تاجداراں یا مسیح
تیری شفقت ہر کس و ناکس کی خواہاں یا مسیح  ہے تجھی پہ نیک و بد کی مشکل آساں یا مسیح
ساقی کونین و شاہ دو جہاں تو ہی تو ہے  یا مسیحا چارہ ساز عاصیاں تو ہی تو ہے

(زبان میں اگر کوئی ناہمواری نظر آئے تو زباندان حضرات گرفت کرنے سے پیشتر یہ یاد کرلیں کہ شاعر ایک غیر ملک اور غیر قوم کا شخص ہے۔ جس کی مادری زبان کو اردو سے کوئی مناسبت نہیں) ایک اور بند اسی مسدس کا:۔

خسروا! ازبسکہ ہیں میری خطائیں بے حساب  عاصیان دہر میں اصلا نہیں میرا جواب

قابل دوزخ ہوں میں اور لائق قہر و عتاب عین نصفت ہے جہاں تک مجھ پہ ہوں سارے عذاب
اور کچھ چارہ نظر آتا نہیں اپنا مجھے تیری الفت پر توکل ہے شفاعت کا مجھے

ایک مخمس میں مرزا غالب کی غزل "تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے" کی تضمین کی ہے پہلا بند یہ ہے:۔

بلا سے میں نہ سہی خاک بھی عدو کیا ہو تمہیں اسی کی قسم اسکی آبرو کیا ہے
زبان شوخ بیاں کا یہ حسن خو کیا ہے ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے

آخری بند یہ ہے:۔

کہا جو میں نے کہ غالب نظر نہیں آتا نیاز آپ کی خدمت میں اب نہیں لاتا
تو بولے بھید کو آزاد تو نہیں پاتا ہوا ہے شاہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ایک اور مخمس میں ناسخ کی مشہور غزل "مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا" کی بھی تضمین کر اپنے استاد نواب زین العابدین خاں عارف کا طویل مرثیہ کہا ہے اور بعض بعض شعر خوب نکالے ہیں، نمونہ حاضر ہے:۔

اے اہل دید دیکھ لو آنکھوں سے کیا ہوا آج میں کیا کہوں کہ دہر میں کیا ہو رہا ہے آج
یاں بعد مرگ حشر کا رکھتے تھے انتظار لو سر پہ جیتے جی ہی قیامت بپا ہے آج
مُردے عجب ہے گر نہ اٹھیں جی کے قبر سے ہم بانگ صور نالۂ اہل عزا ہے آج
ماتم سے کیوں نہ دہر میں پڑ جائے زلزلہ تشہیر بے ثباتی ارض و سما ہے آج
پھر ہوگا شور خلق میں طوفان نوح کا اے اہل گریہ گریہ ہی جوش بکا ہے آج
اے جذب اتحاد یہی ہے مدد کا وقت وہ غم میں ہم کو چھوڑ کے تنہا چلا ہے آج
اے جان زار جانے میں یہ دیر حیف حیف کچھ بھی سر وفا تجھے اے بے وفا ہے آج

غزلیں اکثر غالب کی زمینوں میں کہی ہیں، اور ان میں صفائی بیان اور سلاست روانی و شستگی زبان کا سررشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ کہیں کہیں مضمون بھی بہت لطیف پیدا کیا ہے۔ بعض اشعار حسن تعلیل کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ایک غزل غالب کی مشہور غزل "جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا" پر ہے ؎

میں جو وحشت میں کبھی سوئے بیابان نکلا | واں سے دلچسپ مرا خانۂ ویران نکلا
واعظوں سے جو سنا کرتے تھے جنت کا بیاں | جبکہ تحقیق کیا کوچۂ جاناں نکلا
اسکی جا آج در یار پہ بیٹھا ہے رقیب | خاک خوش ہوویں جو کل یار کا درباں نکلا
وہ رخ ہوشربا دیکھ کے کب ہوش رہا | وصل میں بھی تو نہ دل کا کوئی ارماں نکلا

اشعار ذیل ایک شاعر نامدار اور اہل زبان کیلئے بھی باعث فخر ہوسکتے ہیں۔

شکل قاصد نظر نہیں آتی | ہیں آتی خبر نہیں آتی
وہ بلا کون سی ہے صحرا میں | جو کبھو میرے گھر نہیں آتی

ایک طویل غزل کا اقتباس یہ ہے :۔

خوش ہوں مشکل سے کوئی کام جو آساں ہوتا | دور افلاک کا شرمندۂ احساں ہوتا
اب تو تا حشر نہیں ہے کوئی مرنے کا سبب | تھا مرے حق میں جو ہونا شب ہجراں ہوتا
اہل جنت سے مری روز لڑائی ہوتی | خلد بالفرض اگر کوچۂ جاناں ہوتا
ہم بھی مجنوں کی طرح خاک اڑاتے پھرتے | ہرتے دیرانے اگر گھر نہ بیاباں ہوتا
دیکھتے وہ کبھی آئینہ کے دھوکے میں اگر | میں جو بیتاب ہوا کاش کہ حیراں ہوتا
کس سے بہلائیں سگ یار کو عریانی میں | آج کام آتا وہ آزاد جو درباں ہوتا

تیسرا شعر غالباً غالب کے اس شعر کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہے۔

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی | گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

ایک اور غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں :۔

تقدیر پہ شاکر رہے راضی برضا ہم | اب کس کی شکایت کریں اور کس کا گلا ہم
مت حسن پہ بھول کہ دکھا دینگے یہ تم کو | کرتا ہے وفا حسن کہ کرتے ہیں وفا ہم
مشہور ہو سر حلقہ ارباب جفا تم | معروف ہیں منجملہ اصحاب وفا ہم
ہیں شمع صفت انجمن دہر میں آزاد | سرگرم رہ وادی اقلیم فنا ہم

غالب ہی کی زمین میں ذیل کے دو شعر بھی سننے کے قابل ہیں ؛ -

نہ دے جو بوسہ گیسو نہ دے جواب تو دے | بلا سے جو تجھے دینا ہو دے شتاب تو دے
حقیقت دل خوں گشتہ سربسر ہو عیاں | ذرا دہ طرہ پرخم کو پیچ و تاب تو دے

متانت و سنجیدگی جو اکثر دہلی والوں کا حصہ ہے ۔ آزاد کے یہاں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے ۔ وصل کے بے پردہ مضامین ، بازاری محاورہ ، ہوس پرستی اور عامیانہ الفاظ اور ترکیبوں سے ایک بڑی حد تک ان کا کلام پاک ہے ، وہ عاشق ہیں مگر شریف عاشق وہ معشوق رکھتے ہیں مگر ان کا معشوق زن بازاری نہیں ، وہ اپنی شخصیت کے لحاظ سے مغربی ہیں ۔ مگر ان کی شاعری میں مشرق کی بلند پایہ عاشقانہ شاعری کی جھلک پوری طرح موجود ہے ۔ اس کا کچھ اندازہ ان کے منقولہ بالا کلام سے ہوگا اور مزید ثبوت آئندہ اشعار سے ملے گا ۔

ہے مگر یہ نہیں ظاہر کہ کہاں | زخم پنہاں ہے کہ ہے مسکن جان
دل وہ دل ہے کہ سدا غم سے گداز | چشم وہ چشم کہ خونابہ فشاں
مے کشو دین ہے کتنا سستا | ایک ساغر ہے بہائے ایماں
ہم نے اس شوخ کو دل میں رکھا | جب نہ پایا کوئی خلوت کا مکاں
طبع کو صرف دعا کر آزاد | ہو چکا حال و حقیقت کا بیاں

مومن خاں کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے : - ؎

دلبستگی سی ہے کسی زلف دوتا کیساتھ | پالا پڑا ہے ہم کو خدا کس بلا کے ساتھ

اس زمین میں دہلی کے متعدد شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ جن میں سالک و انور کی غزلیں اپنی اپنی جگہ پر بہت خوب ہیں، مرزا غالب کی بھی غزل دیوان ناظم (نواب یوسف علی خاں ناظم والی رامپور) میں ملے گی۔ آزاد نے بھی اس زمین پر ایک باغ لگا دیا ہے۔ بعض اشعار کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔

اڑتا ہے جسم زار ہمارا ہوا کے ساتھ
چلتے ہیں تیرے کوچہ میں بادِ صبا کے ساتھ

بے اعتنائیوں میں بھی کیا کیا لگاؤ ہیں
ہیں کج ادائیاں تری کس کس ادا کے ساتھ

جو ہیں، سو بس یہی ہیں مرے مشت استخواں
ہو جا شریک اے سگ جاناں ہما کے ساتھ

گویا مرا نوشتۂ تقدیر ہو گیا
وہ ربط ہے جبیں کو ترے نقش پا کے ساتھ

میں جانتا ہوں جان سے تم کو عزیز تر
الفت ہوئی ہے جب تو ہوئی بوفا کے ساتھ

عشق بتاں میں وہم سے ہوں اپنے بدگماں
کیا ورنہ دشمنی مجھے خلق خدا کے ساتھ

غالب کی اس غزل پر "تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے" آزاد نے ایک دو غزلہ کہا ہے۔ چند شعر یہ ہیں :-

قانع ہوں اس پہ عشق میں جو خشک و تر ملے
کھانے کو داغ پینے کو خون جگر ملے

بے درد ہو نصیب مرے مدعی کو دل
بے داغ دشمنوں کو ہمارے جگر ملے

حاصل زبس خلاف تمنا ہے کام دل
جب ہو دنے زہر کی ہیں خواہش شکر ملے

آزاد کس کا شیخ و برہمن زاں سے پوچھ
بے سفت، دین جاگے بھی وہ بت اگر ملے

افسوس خاک تک نہ ہمیں بھر سر ملے
وہ لوگ بھی ہیں جن کو اڑانے کو زر ملے

بس ہو گیا یقین کہ یہی راہ یار ہے
دل جا بجا پڑے جو سر رہگذر ملے

پھرتا ہے تو تو خلق کی آنکھوں میں رات دن
روئے زمیں پہ کس کو ترا رہگذر ملے

آزاد ہم تو آج گزر جائیں جان سے
کوئے صنم میں جا پئے مدفن اگر ملے

اس میں شبہ نہیں کہ دیوان آزاد میں جا بجا لفظوں اور ترکیبوں کی غلطیاں ملتی

ہیں (کس کے ہاں یہ نہیں ملتیں؟) اور بندش تو بہت سے مقامات پر سست نظر آتی ہے۔ لیکن اس لحاظ سے کہ کلام ایک ہندی کا نہیں فرنگی کا ہے جس کو جوانمرگی نے مشاقی کا بھی پورا موقع نہ دیا، دیوان آزاد کو بحیثیت مجموعی بہت غنیمت بلکہ قابل قدر سمجھنا چاہئے۔

اُردو کے مغربی شاعروں میں ایک اور "صاحب" کا دیوان نظر سے گزرا ہے۔ دیوان شور اصل نام مسٹر جارج پیس تھا۔ غالباً میرٹھ میں قیام رہتا تھا۔ دیوان دو حصوں میں ہے پہلے حصے کی ضخامت کا خیال نہیں، دوسرا حصہ ۲۲۸ صفحوں میں آیا ہے اور ممتاز المطابع پریس میرٹھ میں خود مصنف کی حسب فرمائش ۱۸۷۸ء / ۱۲۹۵ھ میں شائع ہوا ہے۔ لیکن کلام بہت معمولی ہے۔

---

# پیامِ اکبر
## یعنی
## حضرت اکبر الٰہ آبادی کی کلیات سوم پر ایک نظر

لسان العصر حضرت اکبر مغفور زمانۂ حال کے ان چند بزرگوں میں تھے جن کا مثل و نظیر کہیں مدتوں میں جا کر پیدا ہوتا ہے۔ ان کی ذات ایک طرف شوخی و زندہ دلی، اور دوسری طرف حکمت و روحانیت کا ایک حیرت انگیز مجموعہ تھی یا یوں کہیے کہ ایک طرفہ معجون آخر آخر ان کی شاعری نہ شاعری رہی تھی، نہ ان کا فلسفہ، فلسفہ۔ ان کا سب کچھ بلکہ خود ان کا وجود مجسم حکمت و معرفت کے سانچہ میں ڈھل گیا تھا۔ ان کی گفتگو جامع تھی حکمت و ظرافت کی، انکی صحبت ایک زندہ درسگاہ تھی۔ تصوف و معرفت کی روزمرہ کے معمولی فقروں میں وہ وہ نکتے بیان کر جاتے کہ دوسروں کو غور و فکر کے بعد بھی نہ سوجھتے، اور باتوں باتوں میں ان مسائل کی گرہ کشائی کر جاتے، جو سالہا سال کے مطالعہ سے بھی نہ حل ہو پاتے۔ خوش نصیب تھے وہ جنہیں انکی خدمت میں نیازمندی کا شرف حاصل تھا جن کی رسائی اس چشمہ حیات تک نہ ہو سکی، انہیں آج اپنی نارسائی و محرومی پر حسرت ہے، اور جن کی ہو چکی تھی انہیں یہ حسرت ہے کہ وہ اور زیادہ سیراب کیوں نہ ہوئے

اکبر کے مجموعہ کلام پر تفصیلی تبصرہ کیلئے تو دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ چھپا ہوا کلام اسوقت تک تین جلدوں میں ہے اور جو حصہ ابھی غیر مطبوعہ ہے وہ بھی اتنا ہے کہ اگر دو جلدیں بنیں تو ایک کے لئے تو بالکل کافی ہے۔ رسالہ[1] کی محدود گنجائش میں سارے

---

[1] رسالہ اردو اورنگ آباد (دکن) اکتوبر ۱۹۲۲ء، اپریل ۱۹۲۳ء،

ذخیرہ پر اجمالی نظر بھی ممکن نہیں۔ یہاں صرف اس حصہ کلام پر نظر کی جائے گی جو انھوں نے تقریباً ۱۹۱۲ء سے کر آخر ۱۹۱۹ء تک فرمایا۔ اس دور کے کلام کا شائع شدہ مجموعہ[1]، ان کے کلیات سوم کے نام سے مشہور ہے۔ ایک معتد بہ ذخیرہ کلام اس کے بعد کا بھی ہے یعنی ۱۹۲۰ء سے لیکر عین وقت وفات ستمبر ۱۹۲۱ء تک کا ممکن ہے کہ کبھی یہ بھی کلیات چہارم کے نام سے شائع ہو جائے۔ لیکن ابھی تک کہ مرحوم کی وفات کو ۲۲ سال گزر چکے ہیں، مسودہ کی حالت میں ہے، اور مسودہ بھی شاید پوری طرح مرتب نہیں[2]۔

بہتر ہوگا کہ ان کی شاعری کو مختلف صنفوں میں تقسیم کرکے ہر عنوان پر جداگانہ نظر کی جائے۔ ہاں متعدد اشعار ایسے بھی ہونا لازمی ہیں، جو ایک عنوان کے تحت میں آئیں گے۔ اور دوسرے کے بھی۔ مختلف حیثیتوں اور پہلوؤں سے انہیں بار بار لانا پڑیگا اور تکرار بیان ایک حد تک ناگزیر ہوگی۔

اکبر کی کتاب شاعری کے پانچ باب بآسانی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

(۱) ظرافت و زندہ دلی۔

(۲) سیاسیات۔

(۳) عشق و تغزل۔

---

[1] حضرت اکبر بڑے ہی پرگو، بڑے ہی زود گو تھے۔ بات چیت کرتے جاتے اور شعر کہتے جاتے لیکن کلام کا ایک خاص حصہ ایسا بھی ہوتا جسے صرف نجی کی محفلوں تک محدود رکھتے اور اپنے مخصوص دوستوں ہی کو سناتے۔ عام اشاعت کے روادار اس حصہ کلام کے لئے کسی حال میں بھی نہ ہوتے۔

[2] بحمداللہ یہ چوتھا حصہ بھی ۱۹۵۱ء میں کراچی سے شائع ہو گیا۔

# پیامِ اکبر
## یعنی
## حضرت اکبر الہ آبادی کی کلیات سوم پر ایک نظر

لسان العصر حضرت اکبر مغفور زمانۂ حال کے ان چند بزرگوں میں تھے جن کا مثل و نظیر کہیں مدتوں میں جاکر پیدا ہوتا ہے۔ ان کی ذات ایک طرف شوخی و زندہ دلی، اور دوسری طرف حکمت و روحانیت کا ایک حیرت انگیز مجموعہ تھی یا یوں کہئے کہ ایک طرفہ معجون آخر آخر ان کی شاعری نہ شاعری رہی تھی، نہ ان کا فلسفہ، فلسفہ۔ ان کا سب کچھ بلکہ خود ان کا وجود مجسم حکمت و معرفت کے سانچہ میں ڈھل گیا تھا۔ ان کی گفتگو جامع تھی حکمت و ظرافت کی، انکی صحبت ایک زندہ درسگاہ تھی۔ تصوف و معرفت کی، روزمرہ کے معمولی فقروں میں وہ وہ نکتے بیان کرجاتے کہ دوسروں کو غور و فکر کے بعد بھی نہ سوجھتے، اور باتوں باتوں میں ان مسائل کی گرہ کشائی کرجاتے، جو سالہا سال کے مطالعہ سے بھی نہ حل ہو پاتے۔ خوش نصیب تھے وہ جنہیں انکی خدمت میں نیازمندی کا شرف حاصل تھا جن کی رسائی اس چشمہ حیات تک نہ ہوسکی، انہیں آج اپنی نارسائی و محرومی پر حسرت ہے، اور جن کی ہوچکی تھی انہیں یہ حسرت ہے کہ وہ اور زیادہ سیراب کیوں نہ ہوئے

اکبر کے مجموعہ کلام پر تفصیلی تبصرہ کیلئے تو دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ چھپا ہوا کلام اسوقت تک تین جلدوں میں ہے اور جو حصہ ابھی غیر مطبوعہ ہے وہ بھی اتنا ہے کہ اگر دو جلدیں نہیں تو ایک کے لئے تو بالکل کافی ہے۔ رسالہ[1] کی محدود گنجائش میں سارے

---

[1] رسالہ اردو اورنگ آباد (دکن)، اکتوبر ۱۹۲۲ء، اپریل ۱۹۲۳ء،

ذخیرہ پر اجمالی نظر بھی ممکن نہیں۔ یہاں صرف اس حصہ کلام پر نظر کی جائے گی جو انھوں نے تقریباً ۱۹۱۲ء سے لے کر آخر ۱۹۱۹ء تک فرمایا۔ اس دور کے کلام کا شائع شدہ مجموعہ[2]، ان کے کلیات سوم کے نام سے مشہور ہے۔ ایک معتدبہ ذخیرہ کلام اس کے بعد کا بھی ہے یعنی ۱۹۲۰ء سے لیکر عین وقت وفات ستمبر ۱۹۲۱ء تک کا ممکن ہے کہ کبھی یہ بھی کلیات چہارم کے نام سے شائع ہوجائے۔ لیکن ابھی تک کہ مرحوم کی وفات کو ۲۲ سال گزر چکے ہیں، مسودہ کی حالت میں ہے، اور مسودہ بھی شاید پوری طرح مرتب نہیں[3]۔

بہتر ہوگا کہ ان کی شاعری کو مختلف صنفوں میں تقسیم کرکے ہر عنوان پر جداگانہ نظر کی جائے۔ ہاں متعدد اشعار ایسے بھی ہونا لازمی ہیں، جو ایک عنوان کے تحت میں آئیں گے۔ اور دوسرے کے بھی۔ مختلف حیثیتوں اور پہلوؤں سے انہیں بار بار لانا پڑیگا اور تکرار بیان ایک حد تک ناگزیر ہوگی۔

اکبر کی کتاب شاعری کے پانچ باب بآسانی قرار دئے جاسکتے ہیں۔

(۱) ظرافت و زندہ دلی۔

(۲) سیاسیات۔

(۳) عشق و تغزل۔

---

[1] حضرت اکبر بڑے ہی پرگو، بڑے ہی زود گو تھے۔ بات چیت کرتے جاتے اور شعر کہتے جاتے لیکن کلام کا ایک خاصہ حصہ ایسا بھی ہوتا جسے صرف بے تکلف محفلوں تک محدود رکھتے اور اپنے مخصوص دوستوں ہی کو سناتے۔ عام اشاعت کے روادار اس حصہ کلام کے لئے کسی حال میں بھی نہ ہوتے۔

[2] بحمداللہ یہ چوتھا حصہ بھی ۱۹۵۱ء میں کراچی سے شائع ہوگیا۔

(۴) اخلاق ومعاشرت
(۵) تصوف، معرفت وفلسفہ
ان میں سے ہر عنوان پر الگ الگ گفتگو مناسب ہوگی

## (۱) ظرافت و زندہ دلی

اکبر کی شہرت ومقبولیت کی سب سے بڑی نقیب ان کی ظرافت تھی، انکے نام کو قہقہوں نے اچھالا۔ ان کی شہرت کو مسکراہٹوں نے چمکایا۔ ہندوستان میں آج جو گھر گھر ان کا نام پھیلا ہوا ہے۔ اس عمارت کی ساری داغ بیل انکی شوخ نگاری ولطیفہ گوئی ہی کی ڈالی ہوئی ہے۔ قوم نے انکو جانا مگر اسی حیثیت سے کہ وہ روتے ہوئے چہروں کو ہنسا دیتے ہیں۔ ملک نے ان کو پہچانا مگر اسی حیثیت سے کہ وہ مرجھائے ہوئے دلوں کو کھلا دیتے ہیں۔

اس میں ذرا کلام نہیں کہ اکبر ظریف اور بہت بڑے ظریف تھے لیکن جس زمانہ کے کلام پر یہاں خصوصیت کے ساتھ تبصرہ مقصود ہے۔ یہ زمانہ انکی ظرافت کے شباب کا نہ تھا۔ جب تک خود جوان رہے شوخ طبعی بھی جوان رہی۔ عمر کا آفتاب جب ڈھلنے لگا تو ظرافت کا بدر کامل بھی رفتہ رفتہ ہلال بنتا گیا۔ اب اس کی جگہ آفتاب معرفت طلوع ہونے لگا۔ بالوں میں سفیدی آئی۔ صبح پیری کے آثار نمودار ہوئے تو ظرافت نے انگڑائیاں لیں اور زندہ دلی کی شمع جھلملانے لگی حکمت کی تابش اور حقیقت کی تڑپ دل میں پیدا ہوئی۔ جمال حقیقی کی جلوہ آرائیوں نے چشم بصیرت کو محو نظارہ بنایا، سوز عشق نے سینہ کو گرمایا، ذوق عرفاں نے دل کو تڑپایا، اور نور معرفت کی شعاعیں خود ان کے مطلع قلب سے اس چمک دمک کے ساتھ پھوٹیں کہ تماشائیوں کی آنکھیں قریب تھا کہ چکاچوند میں پڑ جائیں۔ یہی تو

بات ہے کہ کلیات سوم میں خالص ظریفانہ اشعار شاید ۱ فیصدی بھی نہ نکلیں[2]۔ حالانکہ کلیات اول و دوم میں ظریفانہ اشعار کا تناسب تیس فی صدی سے کسی حال میں کم نہ تھا لیکن ہے یہ کہ قسام ازل نے ذہانت و فطانت، شوخی و زندہ دلی کی تقسیم میں ان کے لئے بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ اس لئے پیرانہ سالی میں بھی ایک طرف ذاتی صدمات و خانگی مصائب[2] کا ہجوم، اور دوسری طرف مشاغل دین و تصوف کے غلبہ کے باوجود یہ جذبات فنا ہرگز نہیں ہونے پائے شمع جھلملا ضرور رہی تھی مگر بجھی نہ تھی، آفتاب ڈھل ضرور چکا تھا مگر غروب نہیں ہوا تھا بدر ہلال بننے لگا تھا لیکن بے نور نہیں ہوا تھا چمن سے بہار رخصت ہونے کو تھی۔ تاہم خزاں کا سایہ بھی ابھی نہیں پڑنے پایا تھا۔ زندہ دلی نہ صرف قائم تھی بلکہ اس قوت کے ساتھ اس شدت کے ساتھ کہ دیوان پڑھنے والے متحیر اور کلام سننے والے ششدر رہ گئے۔ کلیات سوم میں اس کے نمونے، بہ نسبت کے مقابلہ میں یقیناً کم، پھر بھی اچھی خاصی معقول تعداد میں نظر آتے ہیں۔

اکبر ظریف تھے۔ "ہزال" و "خباش" نہ تھے۔ دلوں کو خوش کرتے تھے چہروں پر تبسم لاتے تھے۔ جذبات سفلی کے بھڑکانے کی کوشش نہ کرتے۔ انکی ظرافت ہزل گوئی کے مترادف نہ تھی۔ اکثر صورتوں میں معنویت سے لبریز ہوتی تھی، کہیں کہیں زبان یا محاورہ، لفظی مناسبت، ترکیب کی ندرت، قافیہ کی جدت کے زور

---

[1] کلیات سوم میں ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۹ء کا کلام درج ہے۔ حضرت اکبر کا سال ولادت ۱۸۴۶ء تھا گویا اس وقت سن بحساب شمسی ۶۸ تا ۷۳ برس کا تھا۔

[2] حضرت اکبر کے دو محل تھے زوجہ اولی سے تعلقات شروع ہی سے بہت تلخ رہے زوجہ ثانی محبوب خاص تھیں انھوں نے ۱۹۱۰ء میں رحلت کی۔ چھوٹے صاحبزادے سید ہاشم بہت محبوب تھے ۱۴ سال کی عمر میں غالباً ۱۹۱۵ء میں انھوں نے داغ مفارقت دیا۔ بعض اور خانگی صدمے اسکے علاوہ بھی تھے

سے شعر کو لطیفہ بنا دیتے تھے۔ سیاسی مسائل میں رائے بڑی آزاد رکھتے لیکن جتنا کہہ جانے میں جری تھے، اتنا ہی سنانے میں، چھاپنے میں، پھیلانے میں محتاط تھے قدم اتنا پھونک پھونک کر رکھتے کہ مخلصوں اور نیازمندوں تک کو حیرت کی ہنسی آجاتی۔ اور جو اتنے معتقد و باادب نہ تھے، وہ تو جھنجھلاہٹ میں خدا جانے کیا کچھ کہہ سن ڈالتے۔ خیر ظرافت اس خاص غرض کے لئے یعنی بیہر حال کے لئے اخفائے خیال کے لئے، ان کے ہاتھ میں ایک اچھے لفافہ کا، بڑے کارآمد آلہ کا کام دیتی تھی جو کچھ اور جس کی نسبت چاہتے اسی پردہ میں سنا جاتے۔ کچھ اکیلی سیاسیات پر موقوف نہیں، رند و پارسا، امیر و فقیر، عالم و عامی، انگریز و ہندوستانی، ہندو مسلم، سنی شیعہ سب کی صحبت میں، اور مسجد اور مندر، کالج اور اسکول، خانقاہ و میکدہ، کاؤنسل اور کچہری، سرکس اور تھیٹر، بازار اور دفتر کے ایک ایک گوشہ میں بے تکلفانہ سیر کرتے پھرتے۔ ایک ایک شے کا جائزہ غور سے لیتے رہتے اسے جھانکتے، اسے تاکتے، اس کو جانچتے، اس کو بھانپتے، ایک کو تولتے، دوسرے کو ٹٹولتے، لیکن ظرافت کے نقاب کے نیچے چہرے پر کچھ ایسے گہرے پڑے رہتے، کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلنے پاتا کہ نگاہیں ہیں کس جانب۔ بے تکلف صحبتوں میں بار بار یہ کہہ بھی گزرتے کہیں کہیں مطبوعہ کلام میں بھی اقرار کر گئے ہیں۔ ایک جگہ واضح لفظوں میں فرماتے ہیں ؎

لغزشیں مد ظرافت ہیں جو کچھ آئیں نظر دوستوں سے التجا یہ ہے کریں اسکو معاف

سرد موسم تھا، ہوائیں چل رہی تھیں برفبار شاید بس نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

"موسم کا اشارہ زیادہ تر سیاسی فضا کی جانب ہے اور "ہواؤں" سے مراد قانونی شکنجے اور سرکاری گرفتیں تھیں۔ آج کی نہیں آج سے ۴۰ سال قبل کی۔ ان کی ظرافت کا بہت بڑا مظہر یہی سیاسیات کا میدان تھا اور اس باب میں ان کا عمل عارف رومی کی تعلیم پر تھا ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اکبر، ان "دلبران" سیاسی کی ایک ایک ادا کے محرم تھے۔ ان اسرار کی منادی وہ سربازار کرتے، لیکن زبان وہی اپنی اور مخصوص۔ جو لوگ ان کی اس بولی سے واقف ہوگئے تھے، وہ معنی و مفہوم کو سمجھ کر چشم و ابرو کو جنبش دیتے، اور جو تہ تک نہ پہنچتے، وہ بھی بہرحال ایک دل لگی کی بات سمجھ کر منس توڑتے ہی تھے۔ "بت" "صنم" "مس" "شیخ" "سید" "سید صاحب" "اونٹ" "گائے" "کلیسا" "حرم" "دیر" "بتکدہ" "کالج" "برہمن" "لالہ" "صاحب" وغیرہ بیسیوں الفاظ نے ان کی زبان میں کہنا چاہیئے کہ ایک مخصوص اصطلاحی حیثیت حاصل کرلی تھی۔

ایک جگہ فرمانا یہ منظور تھا کہ سیاسی حقوق جو ہم روز بروز زیادہ حاصل کرتے جاتے ہیں، انہیں اپنی ترقی کی علامتیں سمجھ کر ان پر خوش ہورہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حریف نے ہماری حرص و ہوس، اور جاہ پرستی کا صحیح اندازہ کرکے ہمارے لئے ایک جال بچھا دیا ہے۔ جس میں ہم اور زیادہ جکڑتے جاتے ہیں[1]۔ اور محکومی و تنزل کے غار میں برابر دھنستے چلے جاتے ہیں۔ اس کو یوں ادا فرماتے ہیں ؎

| | |
|---|---|
| بادن تو ہے ہوس کا دستہ ہے پالسی کا | لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا |
| ہے کرفت لیکن اس پر مسرور ہورہے ہیں | ہر سو اچھل رہے ہیں اور جو ر ہو رہے ہیں |
| اس قبلہ رو جماعت کا انتشار دیکھو | اس باغ میں خزاں کی اکبر بہار دیکھو |
| لکھے گا کلک حسرت دنیا کی ہسٹری میں[2] | اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں |

"قبلہ رو جماعت" سے کھلی ہوئی بات ہے کہ مراد مسلمان ہیں۔ کلام اکبر کا روئے سخن

---

[1] کلیات اول میں ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے ؎ تڑپو گے جتنا جال کے اندر، جال گھسے گا کھال کے اندر

[2] یعنی تاریخ۔

بیشتر اپنی ہی ملت کی جانب رہتا ہے۔ تعلیم اکبری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اصل الزام خود ہم پر ہے۔ ہم اگر حرص و ہوس کے بندے نہ ہوتے تو صیاد و جال ڈالنے کی تکلیف ہی کیوں گوارا کرتا؟ ہاون اگر نہ ہو تو دستہ چلے کس چیز پر؟

سرکاری مدرسوں اور تعلیم گاہوں کی بھول بھلیاں کچھ رکھی ہی ایسی گئی ہیں، کہ "ہم" ہمیشہ انھیں الجھاؤں میں پڑے رہیں، اور "وہ" خود عیش و عشرت کرتے رہیں۔ ہم انکی کلرکی کی خدمتگزاری کی محنتوں میں اپنا خون پسینہ ایک کرتے رہیں اور وہ آقایانہ بے نیازیوں کے ساتھ داد عیش دیتے رہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

سمجھا رہے تھے مجھ کو کمٹ[1] کی وہ گردشیں — خود کر رہے تھے تاک کی ٹٹی سے سازشیں
نقشے میں دیکھتا تھا، وہ پیتے تھے جام ے — میں نے کہا حضور یہ مضمون عجیب ہے
ہیں خود تو مست بادۂ عشرت کے خم سے آپ — الجھا رہے ہیں مجھ کو ستاروں کی دم سے آپ
بولے کہ اس زمین میں کوئی اور شعر بھی؟ — میں نے کہا یہ بات مرے ذہن میں بھی تھی
اللہ رے ارتقاء سگانِ در حضور! — کل "تو" سے "تم" ہوئے تھے، ہوئے آج "تم" سے "آپ"
بس کر دیا انھوں نے الٹ بحث کا ورق — گانے لگے وہ گیت، میں پڑھنے لگا سبق

سرکار نامدار کے بعض نیکنام محکموں اور سرشتوں کی ذہانت طباعی، بلکہ قوتِ مذاق کے مشاہدہ سے یہ ظریف شاعر بھی دنگ رہ جاتا ہے، اور محکمۂ پولیس کی کارگزاریوں کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ شاعر غریب کو سیاسی مسائل سے کیا سروکار؟ اسکے اسلاف صدہا برس سے یار کی کمر تلاش کرتے آئے ہیں۔ آج تک پتہ نہ لگا۔ خواجہ خضر کی رہنمائیاں، ہاتف کی دستگیریاں، سروش غیب کی مہربانیاں، سب کی سب ناکام رہیں۔ شاعر کا ذہن ادھر منتقل ہوتا ہے کہ ہستی معدوم کا پتہ اب سرکار کے خفیہ

---

[1] دُمدار ستارہ (comet)

پولیس ہی کی مدد سے کیوں نہ چلایا جائے ؛ فرماتے ہیں ؎

کیا پوچھتے ہو اکبرِ شوریدہ سر کا حال　　خفیہ پولس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

ایسا اچھوتا اور نادر سرٹیفکٹ خفیہ پولیس کو اپنی ساری تاریخ میں کبھی کیوں ملا ہوگا

مگر ظرافت کا رنگ کچھ سیاسیات کے لئے مخصوص تھوڑے ہی تھا۔ جب یہ ہولی کھیلنے پر آتے تو مذہب، اخلاق، معاشرت تعلیم ہر بزم کے بڑے بڑے متین و مہذب سفید پوشوں کو اپنی پچکاریوں سے رنگ رنگ دیتے۔

اس وقت ملت پر جو فرنگی تہذیب و معاشرت کا جن مسلط ہے۔ اس نے نوبت یہاں تک پہنچا دی ہے کہ علم، ہنر، اخلاق کے ساتھ حسن و عشق عیش و عشرت سب کا معیار بدل گیا ہے۔ اور ہم اپنی رنگینیوں اور عیش پسندیوں تک میں پابند روز بروز مغربی معیار کے ہوتے جاتے ہیں۔ یہ کہانی اکبر کی زبانی دو لفظوں میں ادا ہوگئی ہے ؎

نکساری کی ہے نہ کنگن کی　　اب تو دھن ہے انھیں فرنگن کی

اور خیر ادھر عاشقوں کا حال تو بدلا ہی تھا، غضب یہ ہوا کہ ادھر محبوبوں کی جماعت بھی "انقلاب زندہ باد" کی نذر ہوگئی۔ ادھر کی وضعداری میں فرق آیا تو ادھر کی بھی طرحداریاں کب اپنے رنگ پر قائم رہیں۔ بازار حسن میں چلن نئے سکوں کا ہوگیا پرانے سکے ٹکسال باہر ہوگئے۔ اب تک مشرق اور مشرق کی شاعری میں حسن کا سب سے بڑا زیور شرم و حیا، تمکین و حجاب کو سمجھا جاتا تھا، لیکن اب جو جا کر دیکھا تو محفل ناز کا رنگ ہی بدلا ہوا، کہاں کی کم سخنی اور کیسی بے زبانی؛ مشق اب خطابت کی ہو رہی ہے نہ اب نگاہ شرمگیں نہ چشم سرگیں۔ اٹھی ہوئی نگاہیں، اور چڑھی ہوئی آنکھیں، اب خود محو نظارہ، چہرہ پر نقاب کے ریشمی تاروں کی جگہ شفاف پتھروں کی عینک اور سنہری کمانیاں! حجلۂ عروسی کی خلوتوں کا تخیل مٹ مٹا کر ڈرائنگ روم میں ٹھاٹھ

محفل طرازی و بزم نوازی کے جم رہے ہیں۔ عاشق بیچارہ اس قلب ماہیت پر دنگ رہ جاتا ہے اور کہتا ہے ؎

خامشی سے ہے تعلق نہ ہے تمکین کا ذوق — اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق
شان سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں — بت بھی اب دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

چوتھے مصرعہ نے دریا کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ مفہوم کو جا ہے کتنی وسعت دیتے چلے جائیے۔ جو علمائے دین سمجھے جاتے ہیں وہ حجروں کی چٹائیاں، انکسار و تواضع چھوڑ، مسجدوں کی صفیں لپیٹ، پنڈال اور پلیٹ فارم کی زینت بن گئے ہیں۔ جو صوفی و مشائخ کہے جاتے تھے، خانقاہوں سے نکل، انھوں نے خود اپنے نقارہ پر چوب لگانی شروع کردی۔ دینی مدرسوں کے طلبہ استادوں کی جوتیاں سیدھی کرنے کے بجائے لگے اسٹرائیک اور مطالبہ حقوق کا بگل بجانے۔ بیویوں نے شوہروں کی خدمت چھوڑ سینما اور تھیٹر کا راستہ اختیار کیا۔ مائیں بچوں کو آیاؤں کے حوالہ کر خود کلب جا پہنچیں یہ سارے کا سارا مفہوم اس ایک بلیغ مصرعہ میں سما گیا ع

بت بھی اب دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

ہندوستانی تہذیب و ہندوستانی حکومت، خواہ کسی ملت و فرقہ کی ہو، اغیار کی حکومت، اور بیرونی تہذیب سے تو بہرحال گوارا تر ہے! اس مفہوم کو جن خوش ذائقہ کنایوں میں ادا کیا ہے۔ عجب نہیں کہ ان سے اہل ذوق کی زبان چٹخاریاں لینے لگے ؎

دھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دہاتی — بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

پوری اور چپاتی اور بسکٹ تینوں کی تلمیحیں بالکل صاف ہیں پھر "دیس کی دھن" تو ایک معنی تو اس کے ظاہر ہی ہیں کہ وطن کا جوش محبت، باقی دھن، ایک اصطلاح موسیقی بھی ہے، اور دیس نام ہے ایک راگ کا۔ اور پھر یہ گانا ایک دیہاتی کی

زبان سے ! نورٌ علیٰ نور۔

اس زمین کا دوسرا شعر بھی سننے کے قابل ہے ؎

شانِ نماز اکبر، شاہانہ ہوچلی ہے مسجد الگ بنائیں اپنی میاں نفاق

نماز باجماعت کی تاکید تو تھی ہی اس لئے کہ شاہ وگدا، آقا وغلام، خادم و مخدوم، ایک صف میں شانہ بہ شانہ کھڑے ہوں اور کم ازکم اللہ کے گھر میں اگر تو دن میں پانچ پانچ مرتبہ یہ بندوں والے امتیازات مٹتے رہیں۔ یہاں شیخ صاحب مسجد میں حاضر ہوکر بھی اپنی آقائی اور خواجگی کو نہیں بھولتے، اور نفاق اور جمن بیچارے کے لئے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا بجز اس کے کہ اپنی مسجد ہی الگ بنائیں!

ایک ذہنیت اس وقت پھیلی ہوئی یہ ہے کہ زبان سے تو فرنگیت، فرنگی سیاست فرنگی تہذیب، فرنگی حکومت کو خوب بُرا بھلا کہا جائے، لیکن انہیں حلقوں سے اگر کہیں داد ملنے لگے۔ حوصلہ افزائی ہونے لگے، صلہ وستائش کی طرح پڑ جائے تو اس پہ بھی دل خوشی سے اچھلنے لگتا ہے۔ اور اندر ہی اندر لہر، فخر ومسرت کی دوڑ جاتی ہے اکبر کی نظر اس پہلو پر بھی گئی۔ اس کی گرفت اپنے پنجۂ آہنی سے کی۔ صنعت گری کا کمال ملاحظہ ہوکر فولاد کی صلابت وکرختگی، کس خوبی کے ساتھ نرم وگداز مخملی دستانے کے اندر غائب کردی ؎

رقیب سرٹیفکیٹ دیں تو عشق ہو تسلیم یہی ہے عشق تو اب ترکِ عاشقی اولیٰ

فلاں قومی شاعر کا خان بہادر ہوجانا، فلاں خادم ملت کا شمس العلماء بن جانا، یہاں تک کہ اقبال کا "سر" کے خطاب سے سرفراز ہوجانا۔ یہ سب مثالیں اسی رقیب کے دیئے ہوئے سرٹیفکیٹ کی ہیں۔

ملت کے نوجوانوں کو مذہب سے جو بیگانگی ہے۔ بُعد وا جنبیت ہے۔ اس کو اکبر نے کثرت سے بیان کیا ہے، اور کہیں کہیں تو انداز ایسا لطیف اختیار کیا ہے کہ

وہ ان کے سوا اور کسی سے ممکن ہی نہیں۔ دل کے آنسوؤں سے روتے جائیے. لیکن چہرہ وہی ہنسی اور تبسم کا بنائے رکھیئے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

تاکید عبادت پہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے
پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی

گویا بعد دیگانگی کی حد یہ ہے کہ عبادت کی کوئی سنجیدہ اہمیت تو ذہن میں آہی نہیں سکتی، اور اب جو کوئی تاکید کرتا ہے تو خیال لامحالہ یہی گزرتا ہے کہ یہ بجز مذاق، ظرافت، دل لگی کے اور ہو ہی کیا سکتا ہے؟

اب ملت کی مشغولیت باقی بس یہ رہ گئی ہے کہ صلاح وفلاح کی حقیقی تدبیریں اور ان کی جانب توجہ غائب آج یہ انجمن بنی اور کل وہ مجلس۔ چندہ اس میں بھی دیجئے، اور اس میں بھی، اور ترقی کے بجائے سایہ ترقی کو کافی سمجھ لیجئے! ؎

کمیٹی میں چندے دیا کیجئے
ترقی کے ہجے کیا کیجئے

جدید حریت، جدید تعلیم اور جدید کمیٹی بازی اور جلسہ سازی، حضرت اکبر ان سب چیزوں کے شدید مخالف تھے۔ چندہ کا رواج نیا نیا انہیں کے زمانے میں نکلا تھا اور خوب زور شور سے پھیل گیا تھا۔ اس لئے انکے ترکش طنز کے تیروں کا بڑا ہدف یہی چندہ رہا کرتا تھا۔ ذیل کی مصوری ان کے اپنے نقطہ خیال سے کتنی دلکش اور کیسی جامع ہے ؎

قوم ضعیف تنگ ہے چندوں کی مانگ سے
کالج کے جیونٹے لپٹے ہیں ٹڈی کی ٹانگ سے

عالم ہیں چپ جو مستند و باوقار ہیں[1]
گو بجا ہوا پریس[2] ہے، دفاتی کے سانگ سے

نیت دنیا طلبی و دنیا پرستی کی، لیکن آڑ مذہب کی، مقصود و مطلوب دنیا لیکن

---

[1] جس زمانہ کا یہ کلام ہے علمائے دین بھی کثرت سے سیاسی اور وطنی تحریکات کے جزو بن کر ان میں گھل مل گئے تھے۔ ایک حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی مع اپنے مخصوص شاگردوں اور نائبوں کے اس طوفان سے الگ اپنی دینی خدمات میں مشغول تھے۔ اکبر کا یہ اشارہ انہیں کی جانب ہے۔

[2] اخبارات

زبان پر نام دین و مذہب کا۔ اکبر یہ رنگ دیکھتے ہیں، اور ذرا دیکھئے، یہ رنگ ڈھنگ دیکھ، صدا کیا لگاتے ہیں ؎

فرماگئے ہیں یہ خوب بھائی گھورن   دنیا روٹی ہے اور مذہب چورن

کھانا ٹھونس ٹھونس کر کھالیا جاتا ہے تو آخر چورن کی ضرورت پڑجاتی ہے۔ یہ نہیں کہ چورن کچھ دل سے مرغوب ہو مقصود و مرغوب تو وہی کھانا ہی ہے لیکن کام نکلتا نہیں بغیر چورن کی مدد کے۔ مقصود تو وہی دنیا ہی ہے لیکن آڑ بہرحال مذہب کی!

"گئو رکھشا" کی جدوجہد نئی نہیں، پرانی ہے۔ اور تحریک خلافت کے زمانہ میں یعنی یہی کوئی ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء میں تو قدرتاً اس کا بڑا زور بندھا مسلمان اتحاد کے جوش میں اس معاملہ میں کبھی ہندوؤں سے کچھ آگے ہی بڑھ چلے۔ اکبر کا کہنا ہے کہ خیر گائے کی جان بچی تو بچی، یہ بھی ایک سیاسی مصلحت سہی۔ مصلحت نہیں ضرورت تک کہہ لیجئے، لیکن آگے چلئے۔ اصل ضرورت تو مسلمانوں کو اپنے احکام دین و شعائر ملی پر توجہ کی تھی۔ تخیل کا یہ طیارہ، ظرافت کی پھلجھڑی بن کر یوں پیش ہوتا ہے ؎

افسوس شیخ جی نے ہم کو پتا نہ سمجھا   چھوٹیں جو گائے ماتا حسرت سے ادنٹ بولے

اور یہ ترک ذبح کا مسئلہ تو پھر بھی ایک بڑا مسئلہ تھا اکبر کی نظر تو قومی و ملی زندگی کے چھوٹے چھوٹے جزئیات پر رہتی تھی۔ ایک روز مجلس میں راقم سطور حاضر تھا۔ ارشاد یہ ہو رہا تھا کہ "صاحب" کی دیکھا دیکھی اب تو ہماری ہر چیز انجمن سازی اور انجمن بازی کی نذر ہے۔ اتنے میں ذکر انجمن ترقی اردو کا نکل آیا۔ فرمایا۔ "جی ہاں دیکھئے نہ زبان ہماری اپنی چیز تھی، اب یہ بھی ہمارے سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ اس کیلئے بھی ایک انجمن کھڑی کی گئی ہے۔ جب ہی تو میں نے کہا ہے ؎

سچ کہا مرزا نے اب اردو بھی کورٹ ہو گئی   ہم سے چھن کر ہو گئی بزم ترقی کے سپرد

حکومت کے دربار میں عزت کی کرسی حاصل کرنے کا جو ایک ہی طریقہ و تدبیر تھی،

سب پرورش و حجاب تھی۔ لیکن اسے کھلے لفظوں میں کہہ دینا سب سے لڑائی مول لے لینا تھا۔ اکبر کی زندہ دلی تھی۔ جس نے اس تلخی میں بھی ایک شیرینی اور حلاوت پیدا کر دی ؎

عقل نے اچھی کہی۔ کل لالہ مجلس رائے سے   جھک کے ملنا چاہئے ہم سب کو دانسرائے سے

"صاحب" کے ہاں عزت پانے کے لئے "لالہ مجلس رائے" کیا خوب، اور اسکا قافیہ دانسرائے تو بہت ہی خوب! عقل یعنی مصلحت اندیشی۔ داد اور لطف قافیہ کے لئے ساتھ کا دوسرا شعر بھی ملاحظہ فرما لیجئے ؎

شعر کیسا ہی ہو، لیکن قافئے لسکے ہیں خوب   کون ایسا ہے کہ جو ہو مختلف اس رائے سے

ندرت تشبیہات، اکبر کے نسخہ ظرافت کا جزو اعظم ہے، ایسی ایسی اچھوتی، نادر و لطیف تشبیہیں اور کہیں کہیں پھبتیاں انھیں خود بخود سوجھ جاتیں، جو دوسروں کے ذہن میں سوچ بچار کے بعد بھی نہ آتیں۔ یہ ہم آپ سب جانتے ہیں، روز مرہ دیکھتے ہی رہتے ہیں کہ ایک طرف تو شوق صاحبیت کا سوار رہتا ہے۔ دوسری طرف کچھ رکھ رکھاؤ، کچھ ذات برادری والوں کا ڈر، کچھ وضع کا پاس غرض نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے؟ ایک تذبذب۔ گومگو، اور دو دلی کا عالم قائم۔ چار قدم آگے بڑھے تو چھ قدم پھر پیچھے سٹ گئے۔ کتر بیونت کچھ ادھر سے کی، کچھ ادھر سے۔ جوڑ پھر بھی ٹھیک نہ بیٹھا۔ نہ خدا کی یافت ہوئی، نہ صنم کا وصال نصیب ہوا۔ ہنسے گئے، بنائے گئے۔ قہقہے ادھر سے بلند ہوئے، تالیاں ادھر سے بجیں، واقعیت کے اس سادہ نقش پر حضرت اکبر کی گلکاری ملاحظہ ہو ؎

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی   اونٹ پر چڑھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

اکبر کے زمانہ میں سینما کہاں تھا۔ تھیٹر ہی سب کچھ تھا۔ ناٹک دیکھنے کے لئے کسی ثقہ بزرگ کا بہ ایں جبہ و عمامہ تشریف لے جانا اور پھر اس کے لئے اونٹ جیسی مقدس سواری کا انتخاب کرنا جان بلاغت ہے۔ کیا کیا انگلیاں اٹھی ہونگی، جب حضرت سلامت کی سواری اس شان

سے اونٹ پر نکلی ہوگی!

عام شاعروں پر قیاس کرکے لوگ اکبر سے بھی فرمائشی شاعری کی توقع رکھتے تھے اور فرمائشوں کی بھرمار سے انھیں زچ کر دیتے تھے۔ آپ نے یہ کیا کہ ساری توقعات سارے تقاضوں کے جواب میں ایک پرلطف اور اچھوتی تشبیہ پیش کر دی ؎

عشاق کو بھی مال تجارت سمجھ لیا — اس قہر کو ملاحظہ للہ کیجئے

بھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف میں — کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے

اخباروں، رسالوں کی طرف سے فرمائشوں کی حد ہی نہ تھی۔ اکبر کا نام چلا ہوا، شہرت خوب پھیلی ہوئی ہر ایک یہی چاہتا کہ اس شہرت و ناموری سے خود فائدہ اٹھائے اکبر کہاں تک سب کو خوش رکھنے کے لئے وقت نکالتے۔ اور وہ بھی پیرانہ سالی کی معذوریوں میں مروت میں صاف انکار کرتے بھی نہ بن پڑتی۔ آخر ایک مرتبہ یہ شعر چھاپ دیا

یہ پرچہ جس میں چند اشعار ہیں ارسال خدمت ہو — ہمارے لخت دل ہیں، آپکا مال تجارت ہے

یہ ضرور نہ تھا کہ تشبیہیں ہمیشہ نادر اور اچھوتی ہی ہوں بعض جگہ معروف و مانوس بلکہ پامال تشبیہوں کو بھی استعمال کیا ہے۔ مگر اس حسن و صنعت کے ساتھ کہ اس تقلید پر جدت قربان ہو جائیں۔ مشاطۂ پرفن کا کمال اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ بوڑھی بانجھ خاتون میں حسین و نوخیز لڑکی کا حسن و جمال رعنائی و محبوبی پیدا کر دے!

بعض نامور استادوں کو دیکھا ہوگا کہ شعر کہنا تو کچھ واجبی سا آتا ہے، البتہ محاورہ خوب باندھتے ہیں۔ عروض کی لغزش کوئی نہیں ہونے پاتی متروکات سے محتاط رہتے ہیں ذم کا پہلو کلام کے پاس نہیں پھٹکتا۔ اکبر کے نگارخانہ میں شبیہ ان حضرات کی ملاحظہ ہو

عشق کے معنی کے عالم تھے مگر عاشق نہ تھے — صورت عذرا سے واقف تھے، مگر وامق نہ تھے

ایک دوسرا تعارف انھیں حضرات کا ملاحظہ ہو ؎

صورت لیلیٰ نہ دیکھی پڑھ لیا دیوان قیس — شاعری آئی نہیں لیکن زبان داں ہو گئے

طبیعت میں مضمون آفرینی غضب کی تھی۔ نمونے اوپر ہی سے آپ دیکھتے چلے آرہے ہیں۔
ایک اور ملاحظہ ہو۔ اُردو رسم الخط کے دشمنوں کا کہنا یہ ہے کہ اس کو گھسیٹ میں لکھا کچھ
جاتا ہے اور پڑھا کچھ۔ یہ کہنا کچھ صدق دل سے ہی نہیں۔ بلکہ پروپگنڈا کے ماتحت ہے
واقعہ یہ ہے۔ کہ دیوناگری کی گھسیٹ اردو سے کہیں زیادہ چوپٹ ہوتی ہے اور اس
کی مضحکہ انگیز مثالیں، عدالتی کارروائیوں، دستاویزوں وغیرہ کے حوالہ سے اخباروں
میں بار بار نکل چکی ہیں۔ اب دیکھئے کہ اکبرؔ کی نازک خیالی نے اس خشک حقیقت سے
کیسا طرفہ مضمون نکال کھڑا کیا ہے

دوستو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ بنو
بعد مرنے کے کھلے گا کہ یہ تھی کام کی بات

سبکہ تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں
کوئی پڑھ ہی نہ سکا، مل گئی فی الفور نجات

زمانہ کی ناقدری، شاعری کی دنیا کا بڑا پرانا مضمون ہے۔ شاعر سدا سے سامعین
کی بدمذاقی اور ناقدرشناسی کا رونا روتے چلے آئے ہیں۔ لیکن یہی صدائے درد،
جب چمنستان ظرافت کے اس عندلیب کی زبان سے نکلتی ہے تو نغمۂ لطیف بن کر
کان میں آتی ہے رُلاتی نہیں ہنساتی ہے، اور چٹکی، گدگدی میں تبدیل ہو کر رہتی ہے ؎

قدردانوں کی طبیعت کا عجب رنگ ہے آج
بلبلوں کو یہ حسرت کہ وہ اُلو نہ ہوئے

اُردو دانوں، اُردو خوانوں، اردو نویسوں کی بزم میں مرحبا اور سبحان اللہ کی
کیا کمی۔ تحسین کے وہ غلغلے، آفرین کے وہ آوازے بلند ہوں کہ محفل کی محفل گونج جائے
در و دیوار ہل ہل جائیں۔ لیکن لفاظی کے اس شور و ہنگامہ کے آگے بس خلا ہی خلا۔
بڑی سے بڑی علمی تحقیق و کاوش میں سر کھپائیے۔ اس کے بعد خود ہی اپنے ہاتھ سے
مسودہ صاف کیجئے۔ مطبع والوں کے دروازہ پر دستک دیجئے۔ ان کے سارے شتر
غمزے برداشت کیجئے۔ وعدے وہ صبر آزما کہ پریس کے شکنجہ میں کتاب کے صفحوں کے
ساتھ ساتھ اپنی روح کو بھی۔ دبوائیے۔ اور جب خدا خدا کر کے کتاب پریس

سے باہر آئے۔ تو خود ہی اشتہار لکھئے اور پھر مدتوں خود ہی پڑھتے رہئے۔ کتابیں یا تو دوستوں کو ہدیۃً تقسیم کر دیجئے ورنہ ڈھیر اپنے سامنے لگا دیکھ کر بس خوش ہوتے رہئے، یہ خشک حقیقت اُردو اہلِ قلم کے لئے کیسی ہی یاس انگیز، دل شکن، ہمت توڑ ہی لیکن دیکھئے ظرافت کی مسیحائی نے اس بے جان لاشہ میں کیسی جان ڈال دی ہے ؎

کھلا دیواں مرا تو شور تحسیں بزم سے اٹھا مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

شاعروں کے ضعف و ناتوانی کا مضمون العظمۃ للہ! ضرب المثل کے درجہ تک پہنچا ہوا، جسے دیکھئے سب ہی اپنی صحت سے نالاں، اپنی لاغری سے متعلق نوحہ خواں ہمارے حضرت اکبر نے اس پامال مضمون میں ندرت یہ پیدا کی کہ کمزور و ناتواں اپنی صحت ہی کو نہیں، اپنی بیماری کو بھی باندھا اور اپنے نہ مرنے کو اپنی بیماری ہی کی کمزوری کے بل پر ثابت کر دکھایا۔ فرماتے ہیں ؎

کمزور ہے میری صحت بھی کمزور مری بیماری بھی اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا، بیمار پڑا تو مر نہ سکا

ندرت قوافی کے بادشاہ تھے، ایسے ایسے نادر قافئے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے کہ ان کے تصور ہی سے دوسروں کا قافیہ تنگ ہو جائے۔ یوں کہئے کہ ان کے نمکدانِ ظرافت کی نمکینی اکثر یہی جنس نایاب قافئے ہوئے ہے! ایک جگہ بڑھاپے کی آپ بیتی، دکھ درد کی کہانی سناتے ہیں، لیکن طبیعت کی شوخی کا یہ عالم کہ سننے والوں کو رلانے کی جگہ ہنساتے جاتے ہیں ؎

| | |
|---|---|
| ہر طرح راحت تھی مجھ کو دانت سے | قافیہ ان کا ملا تھا آنت سے |
| صحت اب بگڑی تو ان میں درد ہے | اس طرف دیکھو تو معدہ سرد ہے |
| خواب راحت کس کو کھانا کون کھائے | رات بھر کرتا ہوں ہائے ہائے |

---

[1] اردو میں یہ لفظ شاید پہلی بار آ رہا ہے، میرے ذوق میں یہ عربی و ہندی کی ترکیب جائز ہے۔

دردکے آگے رہا منجن بھی گرد　　مشتکی بھی رہ گئی باروئے زرد

ایک، دوسرا زعفران زار اس سے بڑھ کر ملاحظہ ہو ؎

دانت کا درد بدستور چلا جاتا ہے　　وہی مازو، وہی کافور[1] چلا جاتا ہے
ڈارون[2] کے اسی لیکچر کا سبق ہے اب تک　　وہی بندر، وہی لنگور چلا جاتا ہے
برق کے ملپ سے آنکھوں کو بچائے اللہ　　روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

"روشنی" اور "نور" کا یہ نازک فرق اس کے قبل کسی کو کیوں سوجھا ہوگا! اور پھر برقی لیمپ، سبحان اللہ نورٌ علیٰ نور! قطعہ کا آخری شعر ہے ؎

شیخ صاحب کی کمر جھک گئی اور دل نہ جھکا　　آج تک شوق سقنقور[3] چلا جاتا ہے

اشعار ذیل میں جان محض قافیہ نے ڈال دی ہے ؎

جو سچی بات ہے کہہ دوں گا بے خوف و خطر اسکو　　نہیں رکنے کا میں ہرگز، مری ٹوکے کہ جن ٹوکے
انار آتے جو کابل سے تو بڑے تب کے حصہ میں　　امیر آئے تو کیا آئے مزے ہیں لارڈ منٹو[4] کے

"منٹو کے" کا قافیہ "جن ٹوکے" لانا بس اکبر ہی کا حصہ تھا۔

ایک غزل اسی زمین میں ہے "محلس تو باقی ہے" "نرگس تو باقی ہے" اسکے مقطع میں قافیہ "پیرس" لائے ہیں، اور وہ بھی کس روانی و بے تکلفی کے ساتھ ؎

---

[1] مازو اور کافور دانت کے امراض کی مشہور دوائیں۔

[2] انگلستان کا مشہور سائنسداں۔ اسکے نظریات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نوع ترقی کرتے کرتے دوسری نوع بنتی گئی ہے یہانتک کہ حیوانات کا ارتقا انسان پر ختم ہوا، اور انسان ترقی یافتہ بندروں ہی کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل ہے۔

[3] ماہی سقنقور، مردانہ قوت کیلئے ایک مشہور دوا [4] لارڈ منٹو ہندوستان کے وائسرائے۔ امیر حبیب اللہ مرحوم والی افغانستان انہیں کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے۔ شاہ افغانستان اسوقت امیر ہی کہلاتے تھے

یہ مصرعہ قافیہ ہی کے لئے ہے خوب لے اکبر جو اجڑا لکھنؤ کچھ غم نہیں، پیرس تو باقی ہے
اگرچہ اس میں واقعیت پر ظلم اچھا خاصہ ہوگیا ہے۔ لکھنؤ غریب، انتہائی اوج شباب کے زمانہ میں بھی بھلا پیرس کے مقابلہ میں کیا ٹھہر سکتا تھا!

ظریفانہ کلام میں بار بار لفظ پست و مبتذل لاتے، لیکن موقع ایسا چھانٹ کر نکالتے بندش اس خوبی سے کرتے اور مصرعہ اس ٹھاٹھ کا رکھتے کہ پستی و ابتذال غائب، کلام میں بجائے تنافر کے لطف و شگفتگی قائم۔ مذاق سلیم پکار اٹھتا کہ بے شک اس خاص موقع کے لئے یہی لفظ مناسب تھا اور یہی موزوں۔ ایک شعر چند ہی صفحہ ادھر نقل ہو چکا ہے ؎

شانِ نماز اکبر شاہانہ ہو چلی ہے مسجد الگ بنائیں اپنی میاں بفاتی

"میاں بفاتی" کے لفظ سے بڑھ کر جامع اور بلیغ اس موقع کیلئے اور کیا ہو سکتا ہے۔

اقبال کی مشہور نظم "جواب شکوہ" کا وہ مشہور بند تو سب کے ذہن میں ہوگا ؎

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب زحمت، روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب
امرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے

اکبر نے مضمون کے اس سارے دریا کو اپنے دو مصرعوں میں، بلکہ کہنا چاہئے کہ ایک ہی مصرعہ کے کوزہ میں بند کر دکھایا ہے ؎

اسلام کی رونق کا کیا حال کہوں تم سے کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن

"کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن"۔ بہت خوب، بہت خوب۔ فرماتے ہیں کہ ایک بار دلی جانا ہوا۔ زمانہ کوئی ۱۹۱۲ء کا۔ وائسرائے بہادر کلکتہ سے منتقل ہو کر دلی آ چکے تھے اور دلی بڑی تیزی کے ساتھ "نئی دلی" بنی جا رہی تھی اجلاس

اسمبلی کونسل[1] کا ہو رہا تھا۔ ہندوستان بھر کے چوٹی کے مسلمان ہر ہر صوبہ کے جمع تھے۔ ایک دن محلہ کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھنے گیا۔ نماز کے وقت بیٹھے حالوں ایک موذن صاحب نظر آئے، اور انھیں کے طبقہ کے دو ایک نمازی، بس کل اتنی ہی جماعت۔ نماز کے بعد میں نے موذن سے پوچھا کہ کیوں میاں، سر..... بھی کبھی نماز پڑھنے تشریف لاتے ہیں؟ موذن بیچارے نے اُن کا نام بھی نہیں سنا تھا حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگا، میں نے دو ایک سوال اور کر ڈالے کہ اچھا فلاں لیڈر صاحب اور فلاں؟ وہ غریب ہر مرتبہ ہکا بکا۔ تب میں نے کہا اچھا تو یہ کہو کہ

"کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

یہ مثل مصرعہ بعد کو لگایا۔

ذکر غالباً ۱۹۱۵ء کا ہے۔ اس خاکسار کو الہ آباد میں حضرت اکبر کے مہمان ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اتفاق سے شیعہ کانفرنس کا جلسہ بھی اس زمانہ میں الہ آباد میں ہو رہا تھا۔ ایک روز شب کے کھانے پر حضرت اکبر نے دو ایک صاحبوں کو اور بلا یا تھا۔ کھانے کے بعد حضرت اکبر، مسلمانوں کی زبوں حالی پر تاسف کر رہے تھے کہ ایک سُنی صاحب بول اٹھے کہ کچھ بھی سہی، بہر حال شیعوں سے تو ہماری اخلاقی و معاشرتی حالت بہتر ہی ہے۔" لسان العصر بولے کہ "جی، کیا بات آپ نے پیدا کردی ہے، ہم ساری خدائی سے ذلیل سہی، پھر بھی یہ اطمینان کچھ تھوڑا ہے کہ شیعوں کی حالت ہم سے بھی ابتر ہے۔ اور جب ہی تو میں نے کبھی عرض کیا ہے ؂

ہر چند بے وقار ہیں مرزا کو غم نہیں
کیا کم ہے یہ شرف کہ رفاقی سے کم نہیں

"کیا کم ہے یہ شرف" اس ٹکڑے کو مکرر پڑھیئے۔

---

[1] لوک سبھا کا پرانا نام

ایک جگہ "صاحب" کے مقابلے میں صاحبیت کے مارے ہوئے گروہ کا چربہ ان الفاظ میں اتارتے ہیں ؎

مسجد میں شیخ صاحب گرجا میں لاٹ صاحب ‌ ‌ بدھو فلاسفی کے کمرے میں لڑ رہے ہیں

کسی پچھلے کلیات میں مسلمانوں کے یاس انگیز مستقبل کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچ چکے تھے ؎

حکم برٹش کا، ملک ہندو کا ‌ ‌ اب خدا ہی ہے بھائی صلّو کا

پھر جب ۱۹۱۹ء میں مسلمانوں کے ایک مشہور و ممتاز عالم نے تحریک ترکِ موالات میں بالکل گاندھی جی کے پس رو ہونے کا اعلان کیا۔ تو ارشاد ہوا ؎

بدھونیاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں ‌ ‌ گو مشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

اکبر حرفوں اور آوازوں سے مرکب لفظ نہیں بولتے، صورت حال کی پوری تصویر کھینچ دیتے ہیں۔

"بدھو میاں" سے بڑھ کر اور جامع تر لفظ اس موقع کے لئے اور کیا ہو سکتا تھا!

کلیات اول میں مسلمان خاتون کی تعلیم کا عکس بھی ایسے ہی آئینہ میں دکھا چکے ہیں ؎

ترقی کی بیّن ہم پہ چڑھا کیں ‌ ‌ گھٹا کی دولت اینچیں بڑھا کیں
رہیں ہر پھر کے آیا بی نصیبن ‌ ‌ وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

غرض یہ کہ کلّو، صلّو، ہیرو، حسّو، بدھو، گنگو، گھورن، جمّن، نفاتی، شبراتی، کرمن، نصیبن، وغیرہ کوئی لفظ بھی اکبر کی ٹکسال سے باہر نہیں اور وہ ہر جگہ کام ان سے اپنی مرضی کا لیتے رہتے ہیں۔ اور خیر یہ تو پھر بھی عَلَم تھے، یعنی مردوں، عورتوں کے ذاتی و شخصی نام، کمال یہ تھا کہ زبان کے عام لفظ مبتذل طبقہ سے اٹھا کر لاتے اور اپنے حسنِ بندش و کمالِ مرصع سازی سے کرخت، بدزیب و بدہیئت سنگریزوں کو نگینہ بنا کر خاتمِ شعر میں جڑ دیتے۔ داغ کی ایک مشہور غزل ہے ؎

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

اکبر نے بھی اسی زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ مطلع ملاحظہ ہو ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

یہ "فالتو" بھی کیا خوب! اکبر کے سوا یہ کس کے بس کی بات تھی کہ دین میں بھی کا حسن دیوانی پیدا کر دے! شاعر کے ذہن میں جو تحقیری تصور، ایسی عقل سے متعلق تھا اسے کس خوبصورتی سے اس لفظ نے ادا کر دیا۔

کلیات دوم میں ایک قطعہ آزادیٔ نسواں پر ہے کوئی صاحب، اپنے گھر میں بے پردگی کے خلاف کوئی وعظ شروع کرتے ہیں، لڑکیاں تردید پر آمادہ ہو جاتی ہیں اور سند میں "دولھا بھائی" کی رائے پیش کرتی ہیں ؎

دولھا بھائی کی ہے یہ رائے نہایت عمدہ ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

اس کے آگے یہی لڑکیاں، خاندان کے مردوں سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں ؎

خود تو گٹ پٹ کیلئے جان دیئے دیتے ہو ہم یہ تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

"گٹ پٹ"! یہ کیا! جی ہاں انگریزی کی ابجد نہیں، اے۔ بی۔ سی۔ ڈی نہیں صرف گٹ پٹ! حق یہ ہے کہ زبان کا کوئی لفظ بھی بجائے خود نہ تہذیب ہے نہ خلاف متانت۔ اصل شے اس کا موقع و محل استعمال ہے۔ اور اکبر اس موقع شناسی کے بادشاہ تھے۔ الفاظ سے گزر کر یہی سلوک محاوروں، مثلوں کے ساتھ کرتے رہتے۔ بازاروں میں چلتے پھرتے کہیں سے محاورہ اٹھا لائے کہیں سے وہ۔ بلاغت کے سانچے میں ڈھال، رنگ روپ ان کھلونوں کو کچھ اس طرح کا دے دیا کہ اب نظر جس کی پڑی، لٹو ہو گیا۔ لڑکوں کا ذکر نہیں اچھے تھے۔ بڑے بوڑھے انھیں کمال صناعی کا نمونہ سمجھ کر اپنی میز پر، ڈرائنگ روم کی کارنسوں پر جگہ دینے لگے۔ فرش کو ان آرائشوں سے سجانے لگے۔ گلدانوں میں ان پھولوں کو رکھنے لگے ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

الفاظ ثقیلہ کو مغرب نے کیا خارج     اب دُم کی جگہ ملت، بمذے کی جگہ کالج
"بات تری دم میں بمذہ" یہ زبان شریفوں کی نہیں، عوام کی ہے۔ لیکن اکبر کی کان نمک میں آکر ہر شے نمک ہی بن جاتی ہے۔ اس لطف و لطافت کے ساتھ انھوں نے ان کو کھپایا کہ بزرگان محفل کے چہروں پر شکن پڑنے کے بجائے اور مسکراہٹ آگئی۔
ظرافت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ الفاظ و حروف کی باہمی مناسبتوں کی جانب ذہن بڑی تیزی سے منتقل ہوتا، اور پھر ان مناسبتوں کے بل پر تخیل، دلچسپ و پُر لطف نکتے طرح طرح کے پیدا کرتا رہتا۔ فرماتے ہیں ؎

پاکر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا     سر ہو گئے تو بال[1] کا بھی شوق ہو گیا

کیمبل پور (پاکستان) کے کوئی صاحب منشی الف دین نامی تھے، ان بیچارہ نے ایک مثنوی حقانیت اسلام پر لکھی، اور حضرت اکبر کے پاس ریویو کے لئے ارسال کی۔ پیر ظریف نے دو مختصر مصرعوں میں جامع و مانع تبصرہ کر دیا، تصنیف و مصنف دونوں پر:

الف دین نے خوب لکھی کتاب     کہ بے دین نے پائی راہ صواب

پہلے مصرعہ میں الف کے لام کو کسرہ کے ساتھ پڑھئے۔ دوسرے مصرعہ میں اس "الف" کے مقابلہ میں "ب" پڑھئے۔ سارا کھیل اس "الف بے" کا ہے
ذیل کا قطعہ کیا ہے، ایک مستقل گدگدی ہے، بڑے سے بڑے خشک مزاج کیلئے بھی اور بات کچھ نہیں لفظی بھی نہیں، محض لفظی ہیر پھیر ؎

یہ کہتے تھے اک لالہ با وقار     کہ عربی حروف اب تو ہیں ہم پہ بار
رکی ہے انہیں سے ہماری نمود     یہ کھسکیں تو ثابت ہو اپنا وجود
کہاں کا "حرام"، اور کہاں کا "حلال"     ہٹے جائے حطی، رہیں "رام لال"

---

[1] (جمع) ایک بڑا انگریزی خطاب [2] (Ball) انگریزی ناچ۔

"حرام" اور "حلال" سے ح ائے حطی ہٹا کر دیکھ لیجئے نہ، وہی "رام" اور "لال" باقی رہ جائیں گے۔

کبھی یہ بھی کرتے کہ کوئی عام و معمولی سا لفظ لے لیتے، اور اس کے حروف میں قطع برید کر کے نئے نئے شگوفے معانی و مطالب کے پیدا کر دکھاتے۔ الفاظ وہی جو روز ہم آپ سب بولتے سنتے رہتے ہیں۔ اکبر کی ذہانت بس ان کے اجزاء ترکیبی میں الٹ پھیر کر کے، نئے نئے قالب تیار کر دیتی، اور قوت خلاقی ان کاغذی پتلوں میں نازک خیالی، اور معنی طرازی کی روح پھونک دیتی۔ ایک آدھ مثال اس صنعت گری کی ابھی اوپر گزر چکی ہے۔ دو ایک مثالیں اور بھی بے ساختہ دھاوا کئے، زبان قلم پر چلی آرہی ہیں۔ لکھنؤ سے ۱۹۱۱ء میں جب روزنامہ ہمدم پہلے پہل نکلا ہے جالب مرحوم دہلوی کی ادارت میں اور بڑی شان و اہتمام سے تو اس پر ارشاد ہوا ؎

خوب ہے نام اس کا گر ہمدم رہے "دم" نکلنے پر بھی باقی "ہم" رہے
کیا بے تکلف سجع ہے۔

الف، ب، ت کے نام سے واقف تو جاہل تک ہیں۔ لیکن کسی بڑے عالم نے بھی محض ان ناموں سے تصوف و معرفت کا یہ درس کیوں حاصل کیا ہو گا ؎

الف، ب، ت ہی کو پڑھ کر میں سمجھا الف اللہ کا۔ اور ما سوا بت

"ب" اور "ت" کو ملائیے تو بت بن جاتا ہے یا نہیں؟ بس تو اکبر کا کہنا یہ کہ الف تو اللہ کا ہو گیا، اور اللہ کے سوا اب جو کچھ ہے وہ بت ہی بت ہے! کیا نیا رنگ وحدت الوجود کو دے دیا ہے!

"تعلیم" کا لفظ ہر شخص کی زبان پر ہے۔ علیؓ کا نام بھی عالم و عامی سب جانتے ہیں اور پڑھے لکھے تو انہیں باب مدینۃ العلم بھی مانتے ہیں۔ اب اکبر کی شاعری، اور ساحری یہ ہے کہ ان دو بظاہر بالکل بے تعلق لفظوں کے درمیان رشتہ، اور وہ بھی کیسا گہرا پیدا

کر دکھاتے ہیں ؎

سمجھاتی ہے مجھے نکتہ یہ میری طبع سلیم
"علی" کی "تم" میں جگہ ہو تو بس وہی تعلیم

ظاہری پہلو تو یہ ہوا کہ لفظ "علی" کو اگر "ت" اور "م" کے حصار کے اندر لے لیا جائے تو لفظ تعلیم بن جاتا ہے۔ معنوی پہلو یہ ہے کہ "حبِ علی" کو قلب میں جگہ دینا حقیقی تعلیم ہے
سیاسیات کے دائرہ میں خود بلاغت ان کے اس تراش و خراش کی بلائیں لیتی ہے۔ سخن سنجی سر دھنتی ہے۔ معنی طرازی وجد میں آ کر رہتی ہے۔ قطعہ ملاحظہ ہو ؎

"ہ" ہے ہندو "م" ہے مسلم یہ دونوں مل کے ہم
سر پہ انگریزی "الف" اس سے ہوئی حالت اہم

ہے "الف" ہم سے جدا، لیکن محافظ اور معین
اسکے سایہ میں رہیں "ہ" "م" شامل ہوں بہم

لفظ "اہم" کی کتابت میں دیکھئے نہ حرف "الف" کیسا اکل کھرا، الگ تھلگ، سر کشیدہ نظر آتا ہے بخلاف اس کے "ہ" اور "م" باہم شیر و شکر، ایک دوسرے سے مدغم! "ہ" اور "م" کے ادغام کی تصویر آج تو شاعرانہ معلوم ہوگی، لیکن [illegible] میں جب یہ شعر کہا گیا ہے۔ اس وقت یہ نقل تمام تر مطابق اصل تھی۔ باقی انگریزی "الف" کی اہمیت، اس کا اکل کھرا پن، اور اس کا سر پہ ہونا، یہ کیفیتیں تو آج بھی جوں کی توں ہی ہیں۔

اسی گلشن کے ایک دوسرے چمن کی سیر ؎

سر تراشا ان کا۔ کاٹا ان کا پاؤں
وہ ہوئے ٹھنڈے، گئے یہ بھی پگھل

شیخ کو یخ کر دیا، مومن کو موم
دونوں کی حالت گئی آخر بدل

شیخ کا سر "ش" تراش دیجئے تو بیچارہ یخ ہو کر نہ رہے تو اور کیا کرے؟ مومن کا پیر (ن) کاٹ دیجئے تو بجز "موم" بن جانے کے اور کر ہی کیا سکتا ہے؟ رہا یہ کہ کس نے شیخ اور مومن کو یوں بے سر و پا کر دیا۔ تو اب کیا ناظرین اتنی سخن فہمی سے بھی گئے گزرے ہیں
اکبر کے سنجیدہ کلام کا ذکر تو آگے آئے گا۔ لیکن ظریفانہ شاعری بھی اس پایہ کی

کی معنویت سے خالی نہ تھی۔ اوپر مثالیں بار بار گزر چکیں۔ کبھی کبھی اتفاقیہ دو چار شعر محض ہنسنے ہنسانے کے لئے بھی کہہ دیتے۔ ورنہ عموماً صرف پردہ ظرافت کا تھا اور اصل مدنظر کسی مذہبی۔ اخلاقی یا سیاسی مسئلہ کی تعلیم ہی رہتی تھی۔ وہ بڑا فرق اپنے اور عام شاعروں کے درمیان پاتے۔ کبھی کہتے ؂

مرا اپنے آپ اور ان شاعروں میں فرق پاتا ہوں ؎ سخن ان سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں[1]

یوں بھی کہا کرتے کہ شاعری سے مقصود تفریح و تفنن نہیں۔ یہ تو ایک آلہ ہے نفس کی تربیت۔ نہ اصلاح کا۔ اور کہیں یوں ارشاد فرماتے ؂

تنخواہ کے لئے ہے نہ ہے واہ کے لئے ؎ ہے میری شاعری دل آگاہ کے لئے
ہے یہ دعا کہ ترک فضولی نصیب ہو ؎ جو کچھ کہوں وہ ہو فقط اللہ کے لئے
اک غل ہوا کہ اس کو بھی لیسنس ہے ضرور ؎ منہ کھل چکا تھا، ورنہ مرا آہ کے لئے

سنجیدہ بیانی کے باوجود آخری شعر میں طنز و ظرافت کا چھینٹا دیئے بغیر نہ رہ سکے۔

پرعظمت شخصیتوں کی مخالفتیں بھی بڑے زور و شور کی ہوتی ہیں۔ اکبر کی مخالفت اس درجہ کی تو نہ ہوئی۔ پھر بھی کبھی کبھی یار لوگ فن عروض و لغت کی کتابیں بغل میں دبائے رہتے اور کلام اکبر کی طرف انگلیاں اٹھا دبی زبان سے کہتے رہتے کہ یہاں یہ فنی کی غلطی ہے وہاں یہ لغزش ہے۔ اکبر بحث کے قریب بھی نہ جاتے، نہ زبانی نہ تحریری۔ دوسروں کو نصیحت کیا کرتے کہ کبھی مدعی کے منہ نہ لگنا اور کسی صاحب دعویٰ سے سوال و

---

[1] حالیؔ کے بھی ایک قطعہ کا آخری شعر ملاحظہ ہو ؂

حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے ؎ پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

حالی کا خطاب اپنے ان معصروں سے ہے، جن کے ترکش کا سب سے بڑا تیر یہ تھا کہ نہ دہلوی، نہ لکھنوی، یہ پانی پتی بھلا شعر و زبان کیا جانے۔

جواب میں نہ پڑنا۔ پھر بھی بشر تھے۔ منہ میں زبان رکھتے تھے۔ کبھی کبھی کچھ کہہ ہی اٹھتے جو بول ان کے منہ سے نکل جاتے۔ ظریفانہ ادب میں پتھر پر لکیر بن جاتے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

تم سے استادوں میں میری شاعری بیکار ہے
ساتھ سارنگی کا بلبل کیلئے دشوار ہے

کہاں بلبل کی قدرتی، بے ساختہ ہم آہنگی، کہاں سارنگی کی مصنوعی روں روں! خیر یہ تقابل تو ہے ہی، باقی یہ سارنگی کے ضلع میں "استاد" بھی کیا خوب! ایک دوسری جگہ شوخی کا رنگ ذرا تیز کر دیا ہے ؎

قاعدوں میں حسن معنی گم کرو
شعر میں کہتا ہوں بچے تم کرو

اب چند شعر بلا کسی تنقید و تبصرہ کے یونہی ملاحظہ کر لیجئے۔ باغ کی سیر آزادی و بیفکری سے، خود بھی تو ایک چیز ہے۔ یہ کیا کہ قدم قدم پہ پھولوں کے نام، نشان، رنگ و بو کی پوچھ پاچھ مالی سے ہوتی رہے ؎

کیونکہ خدا کے عرش کے قائل ہوں، اے عزیز
جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا

---

ہمیں کیا بالشویک[1] آگیا یا روس آتا ہے
یہاں تو فکر سرمائی ہے، ماہ پوس آتا ہے

---

ایرشپ[2] سے ہم اماں اے چرخ پائینگے کہاں
آسماں بر لاکے ہم سے اڑکے جائینگے کہاں

---

[1] جس زمانہ کا یہ شعر ہے۔ روس میں نیا نیا "بالشویک" انقلاب ہوا تھا اور بالشویک حملہ کا دھڑکا ہر وقت برطانوی ہندوستان کو لگا رہتا تھا۔

[2] (ہندی جنم) ہوائی جہاز

ممبر علی مراد ہیں یا سکھ ندہان ہیں — لیکن معائنہ کرو ہی نا ہدان ہیں

ہجر کی شب یوں ہی کاٹو بھائیو! — ان کا فوٹو لے کے چاٹو بھائیو!

طاعون کی بدولت ان کو بھی ارتقا ہے — جو مارتے تھے مکھی، اب مارتے ہیں چوہے

شاعر جو ملازم ہوا کبر ز رفاقتیں ہوا کا لقب — پوچھو گے کیوں، تو ضیع سنو تنخواہ بھی ہوا اور داد بھی گئی

جب غم ہوا چڑھا لیں دو بوتلیں اکھٹی — مُلّا کی دوڑ مسجد، اکبر کی دوڑ بھٹی

تھے معزز شخص، لیکن ان کی لائف کیا کہوں — گفتنی درج گزٹ، باقی جو ہے ناگفتنی

ارتقائے نے کی، برکت دیکھئے — تاجر اب اہل قلم ہیں بانس کے

محاورات کو بدلیں "براہ ریل" جناب — "ٹکٹ بدست" کہیں اب بجائے "پابہ رکاب"

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے — ایک ہیں خفیہ پولس میں، ایک پھانسی پا گئے

یہ زیادہ تر وہی شعر ہیں جو ان کے مطبوعہ کلیات میں موجود ملیں گے۔ لیکن تخلیقات کلام کا ایک اچھا بڑا حصہ ایسا بھی ہے، جس کے چھاپنے کے وہ اپنی زندگی میں کسی طرح روادار نہ ہوئے۔ شاعر، آخر شاعر عذر جانے کیسے کیسے وہم انھیں گھیرے رہتے، اور چھاپنا تو الگ رہا، نا مضمون کو سناتے تک نہ تھے۔ کسی بے تکلف دوست یا نیاز مند

کو اگر کہیں سنا بھی دیا تو تا کیدیں کہ خبردار اسے میری زندگی میں شائع نہ کر دینا اس مخفی کلام کا بیشتر حصہ تو ایسا ہے کہ اسے حضرت اکبر کی زندگی میں بھی بے تکلف شائع کیا جا سکتا تھا، اور اب دنیائے فانی سے انکے تعلقات ختم ہو جانے کے بعد تو تھوڑا بہت مضائقہ بھی، اس کی اشاعت میں باقی نہیں۔ دو چار شعر، متفرق طور پر ادھر اُدھر سے سنے سنائے یاد رہ گئے۔ وہ آگے حاضر ہیں۔ ہائے اسوقت کیا خبر تھی، کہ چند ہی روز میں یہ گوہر بے بہا ایسے نایاب ہو جائیں گے! اس وقت اس کا احساس ہوتا تو چرا کر چھپا کر، ضد کر کے، غرض "زاری سے، زور سے، زر سے" جس طرح بھی ممکن ہوتا، نقلیں ان کے منھ سے نکلے ہوئے الہامات کی ضرور ہی حاصل کر لی جاتیں۔

اکبر بڑے گہرے مذہبی لیکن تعصب و تنگ خیالی سے بالاتر، عابد عالم، صوفی تھے "زاہد خشک" نہ تھے۔ سید احمد خانی تحریکوں کو ملت کے حق میں زہر قاتل سمجھ رہے تھے۔ خود سرسید کی زندگی میں ان کی تحریکوں کو اپنی میٹھی چھری سے کچو کے ہی دیتے رہے اور کلیات کے ہر حصہ میں تو خوب کھل کھیلے۔ تاہم ذات سرسید احمد خاں کے مخالف نہ تھے اور ان پر جو فتاویٰ کفر کی بارش ہو گئی تھی، ان کے قائل ذرا بھی نہ تھے۔ کہتے تھے، خدائے رحمٰن و رحیم کی رحمت و مغفرت ہر کلمہ گو کے لئے بے پایاں ہے۔ ہمارے مولوی صاحبان نے خواہ مخواہ اسے اس قدر ضابطوں قاعدوں میں جکڑ رکھا ہے۔ وہاں تو نیت کا سوال سب پر مقدم ہے گنہگار مسلمان کے حق میں بالکل مولانا روم کے ہم مسلک و ہم زبان تھے ؎

ما درون را بنگریم و حال را ما بروں را ننگریم و قال را
ناظر قلبیم گر خاشع بود گرچہ گفت لفظ ناخاضع بود

آخر زمانہ کی ایک غزل "دوا ہو یا نہ ہو" "شفا ہو یا نہ ہو" کی زمین میں ہے، اس میں کہتے ہیں ؎

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو بخشدے     گھیری لیں گے پولس والے سزا ہو یا نہ ہو

مولوی صاحبان کی تشبیہ پولیس والوں سے بڑی ہی پر لطف ہے، ایک طرف ان کا احترام بھی، فرض شناسی کی داد بھی، دوسری طرف ان کی ضابطہ پرستی پر طعن بھی خیر یہ شعر تو عمومی پہلو رکھتا ہے۔ ایک رباعی اپنے مخصوص رنگ میں سید احمد خاں اور سید احمد خانیوں ہی کو پیش نظر رکھ کر کہی ہے۔ چوتھے مصرعہ میں شوخی ذرا اپنی حد سے تجاوز کر گئی ہے۔ یہ طریقہ اکبر کا نہ تھا۔ ہر بزرگ کے نام کا بڑا ادب و احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ پہلے اور تیسرے مصرعہ کے الفاظ پوری طرح حافظہ میں نہیں ممکن ہے کہ فرق ہو گیا ہو ؎

گتا جیسے بہ فکر جیفہ دوڑے     یوں دہر پہ نیچری خلیفہ دوڑے

جب مر کے چلے ہیں سوئے جنت حضرت     لٹھ لے کے امام ابو حنیفہ دوڑے

آخر ۱۹۱۶ء تھا، جب لکھنؤ میں رباعی اس زندہ دل زندہ جاوید شاعر نے اپنی زبان مبارک سے سنائی تھی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ " دیکھئے میری زندگی میں کہیں چھاپ نہ دیجئے گا۔ ورنہ مولوی صاحبان جان غضب میں کر دیں گے۔ میں نے تو جنت کا سماں دکھلایا ہے۔ یہ لوگ اسی دنیا میں میرے اوپر لٹھ لئے دوڑ پڑیں گے " ۱۹۱۹ء میں جب ٹرکی سے برطانیہ کی جنگ ختم ہو چکی تھی اور برطانوی مدبرین قسطنطنیہ سے ترکوں کے اخراج کا منصوبہ باندھ چکے تھے۔ اس وقت اسی قافیہ کے ساتھ پھر ایک رباعی ارشاد ہوئی۔ زمانہ یہ تھا کہ اسلام کا مذہبی اثر تو مدت ہوئی قلوب سے مٹ چکا ہے، اب نہ کوٹھیوں اور بنگلوں میں کہیں عبادت کے چرچے ہیں اور نہ درسگاہوں میں کہیں دینی تعلیم کا رواج ہے۔ لے دے کے دنیوی اقتدار کی یادگار ایک ترکی سلطنت باقی تھی۔ یہ جھلملاتی شمع بھی زمانہ کی تیز آندھی کے جھکڑوں سے گل ہو کر رہی۔ مسلمانوں کے لئے یہ حادثہ قیامت کا حکم رکھتا ہے۔ مجازاً بھی حقیقتاً بھی مجازاً

تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر مصیبت مسلمانانِ عالم کیلئے اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کا شیرازہ ہی منتشر ہو گیا اور حقیقتاً اس لحاظ سے کہ حدیث نبوی کی پیشگوئی کے مطابق قسطنطنیہ سے اسلامی حکومت کا اٹھ جانا قربِ قیامت کی علامت ہے۔ اب دیکھئے مضمون کے اس سارے دریا کو کوزہ میں بند کرتے ہیں ؎

بنگلوں سے نماز اور وظیفہ رخصت کالج سے امام ابو حنیفہؒ رخصت
صاحب" سے سنی ہے اب قیامت کی خبر قسطنطنیہ سے ہیں خلیفہ رخصت

مرثیہ کے مضمون کو لطیفہ کی صورت میں پیش کرنا، اکبر ہی کا حصہ تھا، اللہ اکبر!

ایک بار صوبہ کی حکومت علی گڈھ سے ناخوش ہوئی۔ اسی زمانہ میں اودھ کے شیعہ رئیسوں نے لکھنؤ میں ایک شیعہ کالج کی طرح ڈالدی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں "تعلیم کے متوالے"۔ "روشن خیالوں" کو بھلا کالج سے کیوں اختلاف ہونے لگا! انہیں منہ مانگی مراد ملی۔ لیکن شیعوں میں جو دور اندیش تھے، وہ تاڑ گئے کہ یہ تو پوری ضرب ہے علی گڑھ کی مرکزیت پر عین اس زمانہ میں حضرت اکبر کا آنا لکھنؤ ہوا۔ ہمارے محمود آباد کے ہاں کے ایک صاحب ملنے آئے۔ چرچے ہر جگہ ہو ہی رہے تھے۔ یہاں بھی بات اسی کالج کی چھڑی۔ وہ صاحب بولے "ہمارے سرکار اسی لئے تو کالج سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ خواہ مخواہ شیعہ سنی کے درمیان ایک اختلاف کی بنیاد پڑ رہی ہے"۔ اکبر تھے بڑے پکے سُنی۔ لیکن انگریزی تعلیم اور انگریزی کالجوں کے حقیقت شناس کچھ اس سے بھی زائد۔ بولے "جی نہیں" علیگڈھ والوں کو رشک کیوں ہوگا، وہ تو اور خوش ہوں گے کہ چلئے ہماری تحریک کو اور کامیابی ہوئی اور ہماری ہی ایک شاخ اور کھل کر رہی۔ جب ہی تو میں نے کہا ہے نہ ؎

سید صاحب کو عذر کیوں ہونے لگا کالج سے یہ کچھ امام باڑا تو نہیں
یہ بھی کیا کوئی مذہبی چیز ہے؟ کوئی مسجد ہے، امامباڑہ ہے؟ علیگڈھ والے اس سے

کیوں چڑنے لگے۔ اس سے تو اور خوش ہونگے کہ عین انکے مشن کی اعانت ہوئی۔

کیا نگاہ تھی۔ قومی، ملی، مجلسی زندگی کے ہر بڑے چھوٹے، ایک ایک جزئیہ پر نظر رکھتے۔ نظر بھی کیسی، عقابی ہمہ گیر نظر۔ لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا[1] کا نمونہ۔ ادھر کوئی واقعہ، غیر معمولی نہیں، معمولی سا بھی ہوا نہیں کہ ادھر اس پر نزلیت کے رجسٹر میں درج ہوگیا! اور پھر جو تصویر تیار کرتے، اس میں کیسے کیسے بظاہر بے جوڑ واقعات میں بھی جوڑ اور بے ربط حالات میں ربط پیدا کر دیتے تھے! دلکشی اور دلآویزی تو حصہ تھی ان کے تخیل کا۔

ذکر شروع ۱۹۲۲ء کا ہے علی گڈھ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مسلمانوں کی سب سے بڑی جمعیت اور سب سے بڑی مرکزی انجمن ہے۔ اس کے کارفرما صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بڑے دھوم دھام اور زور شور سے ہورہی تھی کہ وہ انڈیا کونسل کے ممبر ہو کر ولایت تشریف لے گئے۔ ان کے جاتے ہی طوفان دھما پڑ گیا۔ ایک واقعہ تو اپنی جگہ پر تھا۔ دوسرا واقعہ عین اسی زمانہ میں یہ پیش آیا کہ لکھنؤ میں ایک مخدوم قوم تھے۔ مولوی نظام الدین حسن نیوتنوی، ایک اعلیٰ پنشنر عہدیدار اور فن حساب و ہیئت کے بڑے ماہر، انھیں رویت ہلال کے مسئلہ پر طبع آزمائی کی سوجھی۔ لکھنؤ کے اخبار ہمدم میں لکھ دیا کہ مہینہ کا حساب کافی ہے۔ ہر مہینہ چاند دیکھ کر تاریخ شروع کرنے کی ضرورت نہیں۔ علماء شریعت اس بدعت پر کیسے سکوت اختیار کر سکتے تھے۔ فرنگی محل سے جواب نکلنے شروع ہوئے کچھ لوگ ادھر سے اٹھ کھڑے ہوئے کچھ ادھر سے اچھا خاصہ اکھاڑا قائم ہوگیا، قلمی اور اخباری۔ اکبر کی ذہانت کب چوک جانے والی تھی۔ دونوں بے ربط

---

[1] قرآن کی آیت (سورۂ کہف) نامۂ اعمال کا ذکر ہے کہ قیامت میں اسے دیکھ کر کافر ملّا اٹھے گا کہ ہائے میری کمبختی، یہ کیسا رجسٹر ہے کہ چھوٹی بڑی کوئی چیز اس نے چھوڑی ہی نہیں۔

واقعات کو ایک رشتہ میں پرو کر موتیوں کی لڑی تیار کردی۔ پوری نظم تو اب یاد نہیں پڑ رہی ہے۔ قطعہ کی جان آخری مصرع تھا ؎

آفتاب' اغوا' گئے' تو 'چاند خاں' پیدا ہوئے

کیا کہنا ہے زندہ دل قوم کا کوئی نہ کوئی پھلجڑی ہر روز اس کو چاہئے۔ کل تک آفتاب قوم پر گرم گرم نگاہیں پڑتی رہیں۔ ان بیچارہ کی جان بچی، تو لیجئے رویت ہلال پر چاند ماری شروع ہو گئی۔

۱۹۲۰ء کا آغاز تھا کہ تحریک خلافت کے سلسلہ میں ایک وفد کا یورپ جانا طے پایا۔ صدر وفد رئیس ملت مولانا محمد علی تھے۔ ایک رکن مولانا سید سلیمان ندوی (صاحب معارف) بھی قرار پائے۔ اکبر کو یہ بات ذرا کھٹکی، کہ ایک عالم دین سیاسیات کا ضمیمہ بنے ہوئے ولایت جا رہے ہیں۔ شاعری کی ساحری اور الفاظ کی نظر بندی ملاحظہ ہو کہ چڑھی ہوئی تیوریوں کو بشرہ کی خندہ جبینی اور لبوں کی مسکراہٹ میں تبدیل کر کے یوں گویا ہوئے ؎

سلیمان کی بات کیسی بنی کہ ندوی' سے اب ہو گئے لندنی
رہے بادہ نوشوں سے بیشک کھنچے مگر جائے والوں سے گاڑھی چھنی
محمد علی کی رفاقت میں ہیں خدا غیر سے ان کو کر دے غنی

دل کو شبہ کیا معنی، یقین ہے کہ یہ نظم بس اتنی سی نہ ہوگی، کچھ اور بھی ضرور فرمایا ہوگا، لیکن اپنی زبان مبارک سے سنایا صرف اسی قدر تھا۔ نادر اُ ہی، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ شوخ نگاری کی باگ ذرا ڈھیلی چھوڑ دیتے اور ظرافت کے حمام میں مخلی بالطبع ہو کر داخل ہوتے۔ اس وقت متانت اپنا منہ پھیر لیتی اور شائستگی کی آنکھیں نیچی ہو جاتیں۔ ایک ہلکا سا نمونہ اس صنعت کا بھی ملاحظہ ہو۔ یورپ میں پہلی جنگ عظیم برپا ہے۔ ترکی غریب پر ہر طرف سے یلغار ہے۔ بتیسؔ دانتوں میں ایک

زبان۔ روز یہی خبریں آرہی ہیں کہ آج یہ مقام گیا، کل وہ، یہاں تک کہ حریف کا قدم سالونکا تک پہنچ گیا۔ (اس مقام کا نام یاد رہے) سارا عالم اسلامی ہیجان و اضطراب میں مبتلا، مرکز خلافت کی مظلومیت و بےکسی پر دنیائے اسلام کا ایک ایک گھر ماتم کدہ بنا ہوا اسی گھڑی حضرت اکبر اپنے بند کمرے میں یہ چار مصرعے بےتکلف دوستوں کو سناتے ہیں۔ دو ہی چار منٹ کیلئے سہی، بہرحال اداس چہروں پر بشاشت دوڑ جاتی ہے۔ اور غمناک آہیں بھرنے والے بےاختیار کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

یورپ کی لیڈیاں بھی ترکی حرم میں آئیں ملحوظ رکھے دنیا اس رشتۂ باہم کو
پھر کرکے اس پہ قبضہ کہدیں یہ ترک ان سے "سالونکا" سے اب تو سالونکا لو ہم کو

نظم کسی طرح دلّی کے ایک ہفتہ وار کے ہاتھ لگ گئی، اور اس نے اپنے یہاں چھاپ دیا حضرت اکبر کو خبر ہوئی، بہت بگڑے، جزبز ہوئے۔ اس خاکسار نے عرض کیا کہ اتنی ناخوشی کیوں؟ جس لفظ کو آپ اتنا کریہہ خیال فرما رہے ہیں، اس میں آپ نے کراہت اور اسکی دشنامی حیثیت باقی کب رہنے دی ہے؟ پہلے اور دوسرے مصرعے میں تو آپ نے خود ہی رشتہ کا اعلان کرکے دنیا کو خوب جتا بتلا دیا ہے۔ اب وہ رشتہ کا مستقل نام ہوگیا ہے گالی کہاں باقی رہی؟"

---

## (ب) سیاسیات

سیاسیات سے براہِ راست حضرت اکبرؔ کو کبھی دلچسپی نہیں رہی، نہ ان کا یہ فن، نہ اس موضوع سے انھیں کوئی خاص مناسبت۔ لیکن تھے پورے مشرقی، اور مشرقی سے بھی بڑھ کر پختہ مذہبی۔ اور دل و دماغ نہایت درجہ حسّاس اس لئے مذہب کی توہین اور مشرقیت کی چوٹ پر تڑپ جاتے، اور جب کبھی سیاسی کانٹوں کو مذہب و اخلاق کے دامن سے گستاخیاں کرتے دیکھتے تو قدرتاً یہ بات ان کے دل میں چبھ جاتی، اور مجبوراً خارزار سیاست میں قدم رکھ کر کانٹوں کو ایک ایک کرکے چنتے۔

عمر کا بیشتر حصّہ سرکاری ملازمت میں گزرا، اور آخری حصّہ تو خاصے اعلیٰ عہدوں پر اس کے بعد بھی پنشن کے طوق سے گرانبار، اور خطاب خان بہادری کی زنجیر طلائی سے پابجولاں۔ اس لئے زبان پر آخر وقت تک مصلحت اندیشیوں کی مہر لگی رہی، اور ناطقہ قلب و دماغ کی پوری ترجمانی نہ کرسکا۔ تاہم ظرافت کا نسخہ ایسا ہاتھ میں موجود تھا کہ جسے جتنی تلخ دوا چاہتے کھلا دیتے، اور اوپر شکر کا غلاف اس قدر دبیز رکھتے کہ کھانے والا ادھر حلق سے کڑوی کسیلی گولیاں اتارتا رہتا، اور ادھر زبان ہے کہ فرطِ حلاوت و شیرینی سے ہونٹ چاٹتی رہتی۔ ۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت و تحریک ترک موالات دونوں کا ہیجان اپنے شباب پر تھا وفات سے چند ماہ، بلکہ شاید چند ہفتہ ہی قبل ایک پورا رسالہ گاندھی نامہ کے نام سے کہہ ڈالا اس میں خلافت و ترک موالات کی تحریکوں کے مختلف پہلوؤں کے متعلق ہر فریق کے خیالات کی ترجمانی کی ہے افسوس ہے کہ یہ پرلطف نظم نہ صرف مرحوم کے زمانہ ہی میں بلکہ مرحوم کے ۲۰ سال بعد بھی زیورِ طبع سے محروم رہا۔ جب شاعر اور خود ان تحریکات پر اس حد تک کہنگی طاری ہو چکی تو ظاہر ہے کہ اس نظم میں کوئی زندہ لطف بھی باقی نہیں

رہ سکتا زندہ لطف تو جبھی تک رہتا ہے، جبتک متعلقہ شخصیتیں جیتی جاگتی رہتی ہیں۔ ہاں تاریخی لطف البتہ ہمیشہ ہی باقی رہ سکتا ہے۔ وفات سے چند ہفتہ قبل، جب آخری بار الہ آباد میں حاضر خدمت ہوا ہوں چند شعر زبان مبارک سے سننے میں آئے تھے۔ افسوس ہے کہ اب ان میں سے کوئی یاد نہیں۔ نقل لینے کی اجازت تو اسوقت کیا ملتی، خود میری ہمت اجازت مانگنے کی نہ پڑی۔[1]

کلیات سوم میں سیاسی اشارے کنائے رمز، تلمیحیں ایک دو جگہ نہیں پچاسوں سینکڑوں جگہ ملیں گی۔ کہیں کہیں ایسا ہے کہ کوئی مخصوص مسئلہ نہیں بیان کیا ہے بلکہ ملک کی عام سیاسی فضا کی مصوری کی ہے۔ ایسے موقعوں پر اکثر قالب غزل کا اختیار کیا ہے چنانچہ جب نظربندیوں کی گرم بازاری تھی اور محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام سب نظر بند ہو چکے تھے۔ ذیل کی بلیغ و پرمعنی غزل ارشاد ہوئی ؎

زباں بند ہے ناتوانی سے اگر بند — مرے دل پر نہیں معنی کے در بند
ہماری بے کسی کب تک چھپے گی — خدا پر تو نہیں راہ خبر بند
بیاد رنج یاران نظر بند — کیا ہم نے بھی اب ملنے کا در بند
دلوں میں درد ہی کی کچھ کمی ہے — نہیں ہے آہ پر راہ اثر بند
بت مشرق نہیں محتاج ساماں — کمر ہی جب نہیں، کیسا کمر بند
کہوں گا مرثیہ اس غم میں ایسا — کھلے معنی دکھائے جس کا ہر بند
خیال چشم فتاں میں ہوا محو — مرا دل اب ہے سینہ میں نظر بند

لیکن اظہار خیال کی یہ صورت بس خال ہی خال نظر آتی ہے۔ عام دستور یہ ہے کہ یا تو سیاسی فلاح و ترقی کی کوئی خاص اصل تحریر کرتے ہیں یا تنزل کے کسی متعین سبب کی جانب

---

[1] گاندھی نامہ، غلط سلط، کسی صورت سے بھی ۱۹۲۸ء میں چھپ کر شائع ہو گیا۔

رہنمائی کرتے ہیں۔ یا موجودہ صورت حال سے مستقبل کی پیشین گوئیاں کرتے ہیں، اور یا پھر حریف کے کسی زبردست وار کو رد کر دیتے ہیں۔ شعر میں سیاسیات کا عالم جیسا کچھ دشوار گزار ہے سب کو معلوم ہے محتاط مسافروں اور ہوشیار سیاحوں نے جب اس وادی میں قدم رکھا ہے۔ تو اپنے تلووں کو جراحتوں سے نگار ہی پایا ہے۔ لیکن اس پیمبر سخن کا اعجاز ایسا کہ اس کے قدم رکھتے ہی یہ خارزار بھی چمنستان بن گیا۔ سفر کی خستگی تفریح میں تبدیل ہو گئی اور کانٹوں کی چبھن کی جگہ پھولوں کی مہک نے لے لی۔

اعتراض بہت پرانا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مذہب کی اشاعت بزور شمشیر کی ایک لطیف الزامی جواب کی جانب سب سے پہلے اکبر کا ذہن منتقل ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ ہماری شمشیر کی تو یہ دھوم دھام ہے لیکن اپنی "توپ" پر بھی کبھی نظر کی ہے؟ ہم نے بالفرض شمشیر کے ذریعہ سے اشاعت کی تو مذہب ہی کی تو کی، توحید و رسالت ہی کیلئے تو کی گردنیں اسلئے ماریں کہ دوزخ کے دائمی عذاب سے بچائیں، جنت کی دائمی راہ دکھائیں۔ مے فروشی سود خواری، بے حجابی حرامکاری، زر پرستی کی اشاعت کیلئے تو نہیں کی۔ توپ دم قوموں کو قبیلوں کو اس لئے تو نہیں کر دیا کہ قبضہ ان کے گھروں پر، ان کی جائیدادوں پر انکی دولت پر کرلیں اور ان کی جانوں کو ان کی اولادوں کو اپنی غلامی میں لیں اسارے مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

اپنے عیبوں کی نہ کچھ فکر نہ کچھ پروا ہے — غلط الزام بس اوروں پہ لگا رکھا ہے

یہی فرماتے رہے، تیغ سے پھیلا اسلام — یہ نہ ارشاد ہوا، توپ سے کیا پھیلا ہے

کمزور و ناتواں قوموں کی قوت مقاومت توڑنے، اور ان کے جسموں کو ہلاک کرنے کیلئے تو، توپ گولہ، بندوق، مشین گنیں استعمال ہوتی ہیں، پھر جہاں تسلط ہوا اور قدم جما، انہیں بدبختوں کے دلوں اور دماغوں اور روحوں کو غلامی کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اسکول اور کالج اور خدا جانے اور کیسی کیسی تعلیم گاہیں کھول دی جاتی ہیں غرض

کمزور اقوام کے مقابلہ میں "صاحب" کی جنگ و صلح دونوں کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے یعنی ان کی روحوں کو اپنا غلام بنا کر رکھا جائے اس خشک حقیقت کو کس ترزبانی سے بیان کرتے ہیں ؎

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

ہماری تہذیب و ترقی، ہماری اصلاح و فلاح، ہماری تعلیم و تربیت کا نام لیکر جس قدر بھی کارگذاریاں ہمارے یہ "خداوند" کرتے رہتے ہیں، ہمارے لئے درسگاہیں کھولتے ہیں۔ عدالتیں قائم کرتے ہیں معیشت میں سہولت بہم پہنچاتے ہیں، ان سب کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ہم کو اپنے میں جذب کریں ؎

وہ اسکو محو کلیسا بناکے چھوڑیں گے اس اونٹ کو خرِ عیسیٰ بناکے چھوڑیں گے
کریں گے شوق سے سلم، غذا میں بٹے داخل شراب کو بھی ہریسا بناکے چھوڑیں گے
کہا یہ شیخ نے اکبر سے روک اپنی زبان کہ تجھ کو بھی وہ مجھی سا بناکے چھوڑیں گے

اونٹ اور "خرِ عیسیٰ" اکبر کی زبان کی مخصوص اصطلاحیں ہیں "مسلمان" اور "صاحب" کیلئے "اونٹ" اور "گائے" کا ذکر بھی بڑی کثرت سے آتا ہے۔ مسلمان اور ہندو کے لئے خرِ عیسیٰ کے بجائے کہیں کہیں "جان بُل" بھی استعمال کیا ہے اور کہیں "بندر" بھی۔

اکبر کے عقیدے میں سیاسی ترقی کا اصل اصول حصول قوت تھا، اگر آج ہم اپنے حاکموں سے مساوات کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس میں کامیابی کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنے میں قوت بھی ان کے مساوی پیدا کریں، سیاسیات نام ہے توازن قوت کا، جو قوم جس قدر قوی ہوگی، اسی قدر دوسروں کے مقابلہ میں ممتاز ہوگی۔ طاقتور قوم کسی کی محتاج نہیں رہ سکتی، اور کمزور کو ہمیشہ غلامی سہتے رہنا پڑیگا۔ تحصیل قوت کی بار بار تعلیم دیتے ہیں، مثلاً ؎

مذہب سوسائٹی ہے اور دین آخرت پر پولیٹکل جو پوچھو طاقت ہے اور سکت پر

صحیح طریقۂ عمل صرف یہ ہے کہ قوت حاصل کی جائے۔ نہ یہ کہ شکوہ و شکایت یا خوشامد و تملق میں وقت ضائع کیا جائے ؎

نہایت قابلیت سے مجھے ثابت کیا مرؔ ‏ مناسب داد دینا ہے مجھے یا رب کہ رونا ہو
ندا آئی مناسب ہے کہ جینا اپنا ثابت کر ‏ خوشامد یا شکایت دونوں ہی میں وقت کھونا ہو

سیاسیات کی دنیا میں محض زبان بننا لاحاصل ہے۔ یہاں ہاتھ بن کر رہنا چاہئے ؎

زورِ بازو نہیں تو کیا اسپیچ ‏ ہاتھ بھی دے خدا زبان کے ساتھ

ترک ہوں خواہ عرب، اسلام کے اقتدار دنیوی کے محافظ وہی ہوسکتے ہیں جن کی تلوار میں دم موجود ہو[1] ؎

کوئی عرب کے ساتھ ہو یا ہو عجم کے ساتھ ‏ کچھ بھی نہیں ہے تیغ نہ ہو جب قلم کے ساتھ

زور بازو ہندوستان کی دوسری قوموں کو بھی نہیں حاصل، اور وہ بھی کونسلوں وغیرہ ہی کے جال میں پھنسی ہوئی ہیں، تاہم کم از کم اس محدود دائرہ کے اندر تو وہ اپنی قوت بڑھانے کی فکر میں رہتی ہیں ؎

گو رہتے ہیں ممبری فانی پر، شاد ‏ لیکن نہیں اپنی ناتوانی پر، شاد
کونسل میں بڑھا رہے ہیں طاقت اپنی ‏ عاقل ہیں مکرمی ہمدانی پر شاد

جب تک قوت ہاتھ میں نہیں، زبانی چیخ و پکار، شور و غل، تقریر و محفل طرازی سب بیکار ہے پلیٹوں کی جھنکار عمر بھر سنتے رہئے مگر کیا اتنے سے بھوک کی تسکین ہو جائے گی؟

ریزولیوشن کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب ‏ پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

اسوقت صرف مسلمان ہی ایسے ہیں جو تذبذب، کشمکش و دو دلی میں مبتلا ہیں۔ باقی

---

[1] ترک اس وقت تک محافظ اسلام سمجھے جاتے تھے "خادم الحرمین الشریفین" ترکی سلطان (خلیفۃ المسلمین) کا خاص لقب ہوا کرتا تھا۔

قومیں یا تو حکمران قوت میں جذب ہوگئی ہیں، یا اپنے میں قوت پیدا کر رہی ہیں۔ اس حقیقت کو کس اچھوتے انداز سے پیش کرتے ہیں ؎

شیخ صاحب تو ادھر فکرِ مساوات میں ہیں — بھائی صاحب کو سنا ہے کہ حوالات[1] میں ہیں
قوم کے حق میں تو الجھن کے سوا کچھ بھی نہیں — صرف آنر کے مزے ان کی ملاقات میں ہیں
سر بسجدہ ہے کوئی، اور کوئی تیغ بکف — اک ہمیں اس رزولیوشن کے خرافات میں ہیں

کونسلوں میں جانا بجائے خود ضعیفی و کمزوری کی دلیل ہے، اس اعزاز پر قناعت وہی لوگ کر سکتے ہیں، جن کا مادّہ خودداری پہلے سے رخصت ہو چکا ہے ؎

کونسل میں سوال کرنے لگے — قومی طاقت نے جب جواب دیا

اس سوال و جواب کا پورا لطف جب ہے، جب یہ بھی یاد رہے کہ "سوال کرنا" اردو محاورہ میں خیرات مانگنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

اس وقت تو حالت یہ ہے کہ جس شے کو ہم ترقی سمجھ رہے ہیں، یہ سب انہیں کی ترقی ہے۔ ہم خوش ہوئے کہ ہم نے اپنی ایک نئی یونیورسٹی بنالی وہ مسکرائے کہ غلامی و محکومی کا ایک نیا سانچہ تیار ہو گیا۔ ہم تالیاں بجاتے رہے، کہ اب تو گورنری تک ہمیں ملنے لگی، صیاد اندر ہی اندر ہنس رہا ہے کہ نادان چڑیا کیسی جلد، اپنی اسیری پر راضی اور مطمئن ہوگئی۔ بس اتنا ہی ہوا کہ پنجرہ کی تیلیاں لوہے کی جگہ سونے کی کر دینی پڑیں! اس صورت حال کی تصویر، کتنی موثر اور سچی، اکبر کے مرقع میں ملے گی ؎

انھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات انکی — انھیں کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات انکی

---

[1] حضرت اکبر نے یہ اشعار ۱۳؎۱۹ء میں حادثۂ مسجد کانپور کے بعد ہی موزوں کئے تھے۔ اور فوراً ایک گرامی نامے میں بھی تحریر فرمائے تھے کلیات سوم میں پہلا شعر کسی قدر مختلف ہو کر چھپا ہے یعنی بھائی صاحب پہلے مصرعہ میں ہیں اور شیخ صاحب دوسرے میں۔ یہاں کتابت وہی کی گئی ہے جو مکتوب اکبر کے مطابق ہے۔

نقشہ مرا ہاتھ چل رہا ہے انھیں کا مطلب نکل رہا ہے
انہیں کا مضمون انہیں کا کاغذ، قلم اُنہیں کا دوات انکی!

بت کدہ میں ہماری عزت کیا خاک ہوسکتی ہے، جب سب کو یہ معلوم ہے کہ جو قشقہ ہماری پیشانی پر ہے، وہ بھی ہمارا اپنا نہیں، غیروں کے ہاتھ کا لگایا ہوا ہے۔ ہماری بے دست و پائی کا نشان اور کلنک کا ٹیکا "وفاداری" کی مسلمہ پالیسی جو ملت پر کہنا چاہئے کہ کوئی ۴۰ سال تک مسلط رہی، یہ تمام ترامی کی تفسیر و تفصیل بیان ہورہی ہے سہ
عزت اکبر نہ مثل برہمن در دیر بود! قشقہ بود حق بر جبیں، لیکن ز دست غیر بود
اپنی اس بے بسی، بے کسی، بے دست و پائی پر ایک اور تشبیہ تھنئی نئی اور لطیف، پھڑکتی ہوئی پھدکتی ہوئی۔ اسے کمند ڈال کر گرفت میں لانا حصہ تھا اکبر ہی کی ظرافت کا، ذہانت کا سہ

لوزنہ کو رقص پر کس بات کی میں داد دوں ہاں یہ جائز ہے مداری کو مبارکباد دوں

گویا گوری قوموں کو تو کھلے بندوں آزادی ہے کہ جہاں جس خطہ میں، جس جتن سے بھی چاہیں قابض ہوجائیں، حکومت قائم کریں، ہر طرح انکی حوصلہ افزائی ہی کی جائے گی، کہ حکمرانی و جہانبانی تو فطری حق صاحب بہادروں کا ہے۔ لیکن کوئی مشرقی قوم، خصوصاً مسلمان، اگر کہیں ذرا بھی سنبھلنا چاہیں، اپنے پیروں اٹھ کر کھڑے ہونے لگیں، تو انہیں روکئے، تھامئے، ماریئے پیٹئے، نوچئے، پھاڑیئے۔ بلگیریا، سرویا، رومانیا، یونان اگر بڑھیں، ترقی کریں، تو یہ اُن کا حق ہی ہے۔ انہیں خوب بڑھاوے پر بڑھاوے ملتے رہیں، لیکن اگر ترک و عرب، ایرانی و افغانی، اپنی کمر بھی کسنا چاہیں، تو فرنگستان کا گوشہ گوشہ چیخ اٹھے، کہ لو، وہ پین اسلامزم، کا جن نکل آیا۔ اب مسیحی سلطنتوں کی خیر نہیں "حالات و واقعات کی اس رفتار سے تو اب بچہ بچہ بھی واقف ہوچکا ہے لسان العصر بھی اس حقیقت کو اپنی زبان میں دہرانے چلے ہیں، لیکن حالت یہ ہے کہ ہاتھ میں

ظرافت کے کھلونے لئے ہوئے ہیں، انہیں زور زور سے اچھالتے جاتے ہیں، اور زیر لب مرثیہ بھی پڑھتے جاتے ہیں۔ نظریں کھلونوں پر سب کی جمی ہوئی ہیں اور زیر لب آواز ہے کہ کسی کے کان میں آتی ہے اور کسی کے نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

ہم "آدمیوں" کی سرافرازی تو گردن کاٹے انکی ——— اگر "بندر" کی بن آئے تو فیض ارتقا کہئے

کہا جاتا ہے، کہلایا جاتا ہے، کہ عہد حاضر کی برکتیں دیکھا خدا کی رحمتوں کی طرح شمار حساب سے باہر، اسکول ہیں، کالج ہیں، ریل ہے، تار ہے، اسپتال ہیں، امن وامان ہے، وغیرہا — عندلیب گلشن حقیقت جواب دیتا ہے کہ یہ ساری برکتیں، برکتیں مان بھی لی جائیں جب بھی بلبل تو دلدادہ اپنی قوت پرواز کا ہے، اسے صیاد کا سجا سجایا رنگین و پرتکلف قفس درکار نہیں ؎

کہا صیاد نے بلبل سے، کیا تو نے نہیں دیکھا ——— کہ تیرے آشیاں سے یہ قفس آراستہ تر ہے

کہا اس نے اسے تسلیم کرتی ہے نظر بندی ——— نشاط طبع کی مہلک، مگر بیکاری پر پر

مسلمانوں کے لئے یہی قہر الٰہی کیا کم تھا کہ وہ اپنی صداقت، اپنا اخلاص، اپنے ایمان کی پختگی کھو چکا تھا، ستم یہ ہوا کہ رہنما کا جامہ پہنے ہوئے "آپ" مل گئے۔ اونٹ راستہ بھول ہی چکا تھا لیکن شاید کہ بھٹکتے بھٹکتے منزل مقصود تک کبھی پہنچ ہی جاتا۔ مگر اب اسکا کیا علاج کہ زمین پر گھسٹتی ہوئی نکیل بندر کے ہاتھ آگئی اور وہ اچک کر اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہوگیا۔ اب خدا ہی ہے جو کبھی بھی اپنے ٹھکانے تک پہنچ سکے! زبانی خاطر داریوں میں، لفظی واہ واہ میں ذرا کمی نہیں، لیکن یہ مجال کس کی جو سادات کا کلمہ کفر زبان پر لا سکے ؎

گم کی تھی میں نے راہ مصیبت یہی تھی سخت ——— اس پر ہوا یہ قہر، تم ایسے خضر ملے

باتیں بھی مجھ سے کیں، مری خاطر بھی کی بہت ——— لیکن مجال کیا جو نظر سے نظر ملے

کس سے میں پوچھتا گل و بلبل کی سرگذشت ——— دو چار برگ خشک تو دو چار پر ملے

سرکار کا ادنیٰ سا گوشہ چشم بھی ہمارے لئے طرۂ افتخار۔ "صاحب" کا ادنیٰ سا التفات

بھی ہمارے لئے موجب ناز۔ فرنگیت سے شرمانا کیسا، وہ تو ہمارے خون میں رچ گئی ہے روح میں بس گئی ہے ؎

ان کو بسکٹ کے لئے سوجی کی تھیلی مل گئی
کمپ میں غل مچ گیا، مجنوں کو لیلی مل گئی

بیمار ہم پڑیں، تو علاج سرکاری شفاخانوں میں کرائیں۔ بچے پیدا ہوں تو تعلیم سرکار کے جاری کئے ہوئے مدرسوں میں پائیں۔ کورس سرکار کا تیار کرایا ہوا پڑھیں۔ آپس میں لڑیں جھگڑیں تو دروازہ سرکاری عدالتوں کا کھٹکھٹائیں، مدد سرکاری پولیس کی لائیں۔ جاہ و نام کی طلب دل میں پیدا ہو تو خطاب و اعزاز سرکار کے دربار سے حاصل کریں۔ پیٹ خالی ہو، بھوک لگے، تو روٹی کا سوال وہی سرکاری محکموں سے حل کریں۔ غرض سرکار دولت مدار کا دامن عاطفت جو آغوش مادر سے بھی بڑھ کر وسیع ہو گیا ہے، اور یہی ہماری زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ہماری مرکزیت سے، ہماری خودی سے دور کرتا جا رہا ہے۔ آخر اس صورت حال کا اثر ملت کی سیرت پر کیا پڑے گا اور کیا پڑ رہا ہے؟ یہ سوال اکثر زبانوں پر ہے، جواب آئیے اکبر کے جام جہاں نما میں دیکھیں ؎

| | |
|---|---|
| میں نے کہا یہ اپنے خیالی خضر سے آج | بتلاؤ اس روش سے ترقی کی کیا امید |
| ہر گام پر جو طاعت حق سے الگ پڑا | ہوتے رہو گے مرکز قومی سے تم بعید |
| ہاں انتشار و جہل کی تکمیل ہو گی جب | ہو جاؤ گے بتان کلیسا کے تم مرید |
| حیرت سے مجھ کو دیکھ کے اس حضرت نے پڑھا | حافظ کا ایک شعر جو معنی کو تھا مفید |
| سر ازل کہ عارف سالک بکس نگفت | در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید |

"صاحب" کو اس دیس میں اپنے پرستاران وفا کے ساتھ جس درجہ اور جس نوعیت کا تعلق ہے، اور ظاہری خاطر داری کے عقب میں خلوص اور قدر کتنی رہتی ہے، اسکی توضیح و تشریح سے اخبارات کے کالم روزانہ اپنی خشک نثر میں ہی لبریز رہتے ہیں۔ اکبر کی قادر الکلامی نے اس سارے

دفتر کو بس ایک مصرعہ میں سمیٹ لیا ہے۔ اس کو کہتے ہیں دریا کو کوزہ میں بند کرنا۔ شل سنی آپ نے بارہا ہوگی۔ محلِ استعمال کی صحیح تر مثال شکل ہی سے ملے گی ؎

اکبر سے میں نے پوچھا اے واعظِ طریقت    دنیائے دوں سے رکھوں میں کس قدر تعلق
اس نے دیا بلاغت سے یہ جواب مجھ کو    انگریز کو ہے نیٹو سے جس قدر تعلق

سینکڑوں پرجوش اخباری مضمون، سینکڑوں شعلہ بار سیاسی تقریریں، ان چار مصرعوں کی بلاغت جامعیت و نکتہ وری پر قربان!

بیرونیوں اور بدیسیوں کی کفش برداری سے توانیوں کی غلامی، چاہے وہ اپنے کوئی بھی ہوں، بہرحال و بصورت بہتر ہے۔ اس خیال کو ذرا دیکھئے کس مزے سے ادا کیا ؎

دھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دہاتی    بسکٹ سے ہے ملائم، پوری ہو یا چپاتی

"دیس" کے معنی وطن کے تو ظاہر ہی ہیں، باقی دیس ایک راگنی کا نام ہے گانا، دھن، دیس، اب سب اکٹھے ہوگئے۔ بسکٹ کا اشارہ صاحب کے سرکی طرف پوری کا ہندو کی رسوئی کی طرف، اور چپاتی کا مسلمان کے باورچی خانہ کی طرف بالکل کھلا ہوا ہے۔

ہندیوں کی باہمی ناچاقی، ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہوئی ہے "صاحب" بھی اس رمز سے خوب آگاہ ہیں، جب کبھی اس آگ کو سرد ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، تو کبھی ہندش ذبح گاؤ کا اشتعلہ چھوڑ دیا۔ کبھی ہندی زبان اور دیوناگری حروف کا قصہ لے بیٹھے کبھی مسجد کے آگے باجہ کا سوال چھیڑ دیا، اور کچھ نہیں، تو حملہ افغانستان ہی کا ہوا بنا کر پیش کر دیا۔ اکبر کی نگاہ دوررس نے تاڑ لیا کہ اہم ترین مسئلہ زبان کا ہے زبان کے معاملہ میں جب تک سارا ملک رواداری برتنے کیلئے تیار نہ ہوگا، اتحادِ وطنی کی گتھی کسی طرح نہ سلجھے گی۔ اپنے ہم وطنوں کی کم فہمی و نادانی پر تأسف و حسرت کے آنسو بہاتے ہیں ؎

کہتا ہے مجھ کو جو کچھ سننے لگا اُس صدی میں    پوچھا اگر تو اسی صدی میں کیوں چپ رہو گے جی میاں
بولے کہ یہ صدی ہے اس بحث اور بیان میں    کہتا ہے جو، کہیں ہم وہ کون سی زبان میں

سن کر یہ بات ان سے ہر اک کو آیا چکّر ایک صاحب بصیرت چلتے ہوئے یہ کہکر
پیرِ فلک نہ کیوں کرا ابواب بحث کھولے جیتے رہیں گرو جی؛ زندہ رہیں یہ بھولے

غیر ملکی حکومت کی بدگمانیاں اور سخت گیریاں، خدا کی پناہ! بات بات پر شبہے بات کی بات پر گرفت۔ خود غزلیہ اور عاشقانہ شاعری کے اندر بھی غدر، بغاوت و قانون شکنی کے جراثیم سرکاری خوردبین میں عیاں۔ اس داروگیر کی لطیف و شاعرانہ تصویر، شاعر کے نگارخانہ میں ملاحظہ ہو ؎

اک غزل میں اتفاقاً میرا ایک مصرعہ یہ تھا دیدۂ عبرت سے رنگ دہرِ فانی دیکھئے
کوئی بول اٹھا، زوالِ حسنِ بت مقصود ہو اس سخن میں بدشگونی کی نشانی دیکھئے
عارفانہ شاعری بھی آجکل دشوار ہے بزم دنیا میں یہ زورِ بدگمانی دیکھئے

اکبر کی آپ بیتی بھی اس سلسلہ میں سننے کے قابل ہے ۱۹۱۴ء میں جب یورپ کی پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی ہے۔ تو یاد ہوگا کہ بالکل ابتدا میں اعلان جنگ صرف آسٹریا اور سرویا کے درمیان ہوا تھا۔ برطانیہ اس وقت تک الگ تھا۔ اکبر نے معاً ایک نظم کہی ایک مصرعہ یہ تھا ع بحمد اللہ اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہے

مسجد کانپور کے سلسلہ میں گولی چلنے اور اس سے مسلمانوں کے شہید ہونے سے مسلمانوں کا دل چھلنی ہو رہا تھا، "خونِ شہیداں" کی تلمیح اس جانب سمجھی گئی اور شاعر صاحب دھر لئے گئے۔ اکبر صاحب بھی نرے شاعر تھے، کوئی داروزنداں کے مردِ میداں تو تھے نہیں، اعلان کر دیا کہ بہت اچھا آئندہ شعرگوئی سے توبہ، نہ معلوم کس وقت کیا نکل جائے، اور آپ کیا گرفت کر بیٹھیں۔ لیکن رندِ قدح خوار کی طرح شاعر کی توبہ ہی کیا، ادھر کے دن کی! توبہ کیجئے! خیر کچھ دن ظاہر کی تو احتیاط رہی بھی لیکن تخلیہ کی مجلسوں میں قاضی و محتسب کی دست رس سے دور، شغل اسوقت بھی جاری ہی رہا ایک آدھ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

سینے ادھر ایسے کہ سہیں جور ر فل بھی، کان ان کے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی

حکم اکبر کو ملا ہے کہ نہ لکھو اشعار      خواجہ حافظ بھی نکالے گئے میخانے سے
جنگ یورپ کی تلمیوں سے اس دور کی غزلیں تک خالی نہیں نئی نئی تشبیہیں، میدان جنگ سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے۔ ایک غزل کا مطلع ہے ؎

یہ بت دل میں گھسے آتے ہیں جرمن کا ستم بن کر
مراتقویٰ کہاں تک ان کو روکے بلجیم بن کر[1]

یہ کونسلیں، یہ اسمبلیاں، یہ ووٹ بازیاں، اور الکشن جنگیاں، یہ علامتیں ہیں ہماری ترقی اور آزادی کی! یا مزید حلقے ہیں زنجیر غلامی کے، اور ہمارے حق میں مزید پھندے؟ اکبر کے ہاں یہ سوالیہ نشان بار بار وضاحت کے ساتھ ملتا ہے ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا      اچھے اچھے ووٹ پہ شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ      اس کو سمجھیں فرض کفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی      سلف گورنمنٹ کے آگے آئی
پاؤں کا ہوش اب فکر نہ سر کی      ووٹ کی دھن میں بن گئے پھرکی

ایک دوسری جگہ ان کی دیوانہ پنی اور اپنی غفلت و کرتاہ بینی کی حکایت یوں کرتے ہیں۔ تاسف اور دلسوزی کا رنگ اب اور گہرا ہے ؎

ہارن تو ہے ہرس کا، دستہ ہے پالسی کا      لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا
ہے کوفت لیکن اس پر مسرور ہو رہے ہیں      ہر سو اچھل رہے ہیں اور چور ہو رہے ہیں
اس قبلہ رو جماعت کا انتشار دیکھو      اس باغ میں خزاں کی اکبر بہار دیکھو
لکھے گا کلک حسرت، دنیا کی ہسٹری میں      اندھیر ہو رہا تھا، بجلی کی روشنی میں

ایک اور مقام جہاں شاعرانہ دوربینی اور حقیقت بینی، اس ظاہر فریب اور دادیہ سے

---

[1] پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کا حملہ اتحادیوں پر بلجیم کے راستہ سے ہوا تھا اور بلجیم بیچارہ پہلی ہی زد میں گر گیا تھا

خوش نما منظر کیوں بے نقاب کر رہی ہے ؎

| | |
|---|---|
| نیٹو ہے خود ہی کا محتاج | کونسل تو ہے انکی جن کا ہے راج |
| کہتے جاتے ہیں یا الٰہی! | سوشل حالت کی ہے تباہی |
| ہم لوگ جو اس میں پھنس رہے ہیں | اغیار بھی دل میں ہنس رہے ہیں |
| دراصل نہ دین ہے نہ دنیا | پنجرہ میں پھدک رہی ہے مینا |
| اسکیم کا جھولنا وہ جھولیں! | لیکن یہ کیوں اپنی راہ بھولیں، |

سُنی وجون کی گرم گرم لو اور تپش میں باہر نکلنا ہر ایک کا کام نہیں، قاضی محتسب کی دھڑپکڑ کی گرماگرمی دیکھ شاعر غریب کو اپنی خیریت تو اسی میں نظر آتی ہے کہ زبان بند رکھی جائے۔ اور منھ کھولنے کے لئے انتظار کسی مناسب موسم کا کیا جائے۔ بے فصل اگر بیج ڈالدیا جائے تو پودا ہرگز نہ اُگے گا۔ کہتا ہے کہ جس طرح ایک وقت گفتگو کا ہوتا ہے، اسی طرح ایک موقع سکوت و بے تعلقی کا بھی ہوتا ہے، اور آج وہی موقع ہے ؎

| | |
|---|---|
| گفتنی ہے دل پر درد کا قصہ لیکن | کس سے کہئے کوئی مستفسر حالات تو ہو |
| داستانِ غم دل کون کہے، کون سنے | بزم میں موقع اظہار خیالات تو ہو |
| عدم نشو و نما سے نہ کہو تخم کو بد | وقت بالیدگی تخم و نباتات تو ہو |

تینوں شعر سوز و درد کی تصویریں، اور انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں کو لئے ہوئے پھر کہتا ہے کہ زمانہ نے مساعدت کی، تو کبھی ہماری بھی زبان کھلے گی ورنہ یہ سکوت، سکوت اجل سے ہم آغوش ہو رہے گا ؎

| | |
|---|---|
| ہم اس زمانہ میں رہتے ہیں اپنے گھر میں پڑے | ہوا ہی بدلی ہوئی ہے، فلک سے کون لڑے |
| خدا ہی ہم کو اٹھائے گا جب تو اٹھیں گے | ابھی تو چپ ہیں، کوئی لاکھ اعتراض جڑے |

---

لہ اشارہ ہے وقت کی چلی ہوئی مانٹیگو ریفارم اسکیم کی طرف۔

اگر اٹھے تو ظلم اپنا گاڑیں گے کہیں جو اٹھ گئے تو یہ قصہ ہی ختم خود ہی گرے

حق پرستوں کیلئے کھلے ہوئے راستے دو ہی ہیں، یا سیدھے سیدھے اس دارِ فانی سے رخصت ہو جائیں، اور یا صبر کے تلخ گھونٹ حلق سے اتارتے رہیں ؎

حق پرستی کا نشاں اب قبر ہے یا صبر ہے اور جو کچھ ہے عقیدوں پر فقط اک جبر ہے

فرماتے ہیں مومن کے لئے فضا یکسر تاریک، ماحول تمام تر ناسازگار۔ ہر ہوا جو چلتی ہے ناموافق۔ اہل ایمان کے لئے اس عالم یاس و حرماں میں بھی بھروسہ صرف رحمت باری کا۔ تاریک خانہ میں بھی ایک شعاع امید ؎

جب آنکھ کو کھلنے میں ہو جھپک، جب منھ میں زباں جنبش سے ڈرے

اس قید میں کیونکر جینا ہو، اللہ ہی اپنا فضل کرے

کیا ناز ہو ایسی ساعت پر، افسوس ہے ایسی حالت پر

یا جھوٹ کہے، یا کچھ نہ کہے، یا کفر کرے یا کچھ نہ کرے

قاتل کو بھروسہ قوت کا، اور ہم کو خدا کی رحمت کا

ہونا تھا جو کچھ وہ ہو ہی لیا، وہ بھی نہ رکا ہم بھی نہ ڈرے

"صاحب" کا ساتھ دیجئے تو دین رخصت۔ بے نیازی اختیار کیجئے تو دنیا سے ہاتھ دھویئے ؎

بے گزٹ ہو کے جو جیئے تو محلہ میں حقیر باگزٹ ہو کے جو رہیئے تو فرشتوں میں خفیف

"گزٹ" کے لفظ سے بھی اکبرؔ نے خوب کام نکالے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بغیر سرکاری اعزاز کے گر رہیئے تو دنیا میں کون بات پوچھے گا؟ مادی تعلق منصب و اعزاز سے دل لگائے رکھئے تو پھر دین کا خدا حافظ۔

اور تو اور، اب اپنے کو مسلمان کہنا اور کہلانا بھی تو مشکل ہو گیا ہے ادھر آپ نے اعلان اپنے اسلام کا کیا، ادھر روشن خیالی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور آپ ٹھکے کے

ہدف بن کر رہے مسلمان کہلانے ہی پر اگر آپ کو اصرار ہے تو چارہ بجز اس کے نہیں کہ اپنے کو تجدد کا بندہ، صاحب زدہ مسلمان کہلائیے ؎

جو پوچھا مجھ سے دورِ چرخ نے کیا تو مسلماں ہے
میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا رازِ پنہاں ہے
کروں اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھ سے
اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قہرِ یزداں ہے
بالآخر کہہ دیا میں نے کہ "گو مسلم تو ہے بندہ
ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے خانساماں ہے"

لیکن اس ساری پستی و ادبار کے اسباب اکبرؔ کی تشخیص میں خارجی نہیں داخلی ہیں۔ جن مصائب کے ہم شکار ہو رہے ہیں یہ خود ہمارے ہی ہاتھوں کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیا، اغیار ہم پر دلیر ہو گئے۔ ہم نے ملی طور طریقے کو خیرباد کہا، اغیار ہم کو نگلنے لگے۔ ہم نے اپنوں کو چھوڑ کر بیگانوں کی تقلید و نقالی شروع کی، بیگانوں نے دیکھتے دیکھتے ہم کو زیر کر دیا۔ جھاڑو جب تک بندھی ہوئی ہے تیز سے تیز آندھی میں بھی محفوظ ہے۔ ادھر اس کا مٹھا کھلا، ادھر اس کی ایک ایک سینک ہوا کے ہر جھونکے کے رحم و کرم پر رہ گئی۔ قوم کا شیرازہ قائم رکھنے والی شے تو صرف قوم و ملت میں خودی و خودداری کا احساس ہے اقبالؔ کی شاعری کا تو خاص موضوع ہی یہی ہے لیکن اس کی جھلکیاں اکبرؔ کے یہاں بھی موجود ہیں فرماتے ہیں ؎

طریقِ حکمت و تزئین ہر ایک رنگ میں ہے — نہ یہ سمجھ کہ فقط مغربی ہی ڈھنگ میں ہے
نگاہ غور کر د سوئے ترکی و ایراں — نئی بنا یہ حریفوں نے کر دیا ویراں
تمہارے دل میں یہ کیا وہم کیا گماں آئے — تمہارے جسم میں کیوں دوسرے کی جاں آئے
جو تو نے بھائیوں کا اپنے ساتھ چھوڑ دیا — تو دستگیر نے تیرا بھی ہاتھ چھوڑ دیا

جو بات ٹھیک ہو کہتا ہوں میں اسے کھل کر کہ سلطنت نہ سہی، تم بہر تو مل جل کر

لیکن آج جو بڑے بڑے اقبال مند نظر آتے ہیں۔ان کی بھی اقبال مندیاں، خوش بختیاں کامرانیاں کب تک ؟ کے دن کیلئے! ایک دن احتساب کا آخران کے لئے بھی آنے والا ہے جہان فانی کو فانی سمجھنے والا مشرقی شاعر اس انجام کی خبر کبھی کبھی ان بدمستوں کے کان تک پہنچا دیتا ہے۔

مجبور بدلتے جانے ہیں اقبال وحشم کے دور بھی ہیں
یکتائی کا دعویٰ خوب نہیں، اللہ کے بندے اور بھی ہیں

کہیں یہ فقیر مدہوشان غفلت کے قصر وایوان کے سامنے آکر صدائے عبرت بلند کرتا ہے ؂

ہرج کیا وقعت نہیں میری جو بزم غیر میں — عزت مسلم ہے اس کی کس میری دیر میں
تار برقی سے ہوا معلوم حال زار روس[1] — شور برپا ہے کلیسا میں، حرم میں دیر میں
آسمانی توپ چلتی ہے کہیں صدیوں کے بعد — لیکن اڑ جاتی ہیں ساری غفلتیں دو فیر میں

اور کہیں اپنوں اور بیگانوں دونوں کو حدود انسانیت کے اندر رہنے کی موعظت و تلقین کرتا ہے ؂

تم ملو یا نہ ملو مجھ سے، سنو یا نہ سنو — ساتھ رہنا ہے اسی ملک میں اے ہم وطنو
اہل مغرب سے بھی کہتا ہوں مبارک ہو یہ قد — آسمان تنگ، ہو تم پر مگر اتنا نہ تنو

ذیل کا شعر اس وقت کا ہے جب پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر صلحنامہ مرتب ہو رہا تھا اور اس کا خاص اہتمام تھا۔کہ اب کی یورپ کی تنظیم جدید کی جو قبا تیار ہو اسکا دامن

---

[1] اشارہ ہے ۱۹۱۷ء کے عظیم الشان انقلاب روس کی جانب ۔ زار شاہی کا خاتمہ آناً فاناً ہوگیا زار روس اپنے وقت کا سب سے بڑا فرعون باسامان، اگلے جباروں کی زندہ یادگار تھا۔

ترکوں کے وجود کی نجاست سے پاک رہے ــــه

کورانہ ترنگیں قوت کی کچھ فائدہ ان کو دیں گی نہیں!
نقشوں میں لکیریں کھینچنے سے فطرت کی حدیں بدلیں گی نہیں!

یہ دوسرا مصرعہ توانائی بلاغت، وایجاز وجامعیت کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ زبان میں ایک مستقل ضرب المثل کی حیثیت حاصل کرلے۔

آج جنھیں اپنی طاقت وتوانائی پر غرہ ہے، کیا انھوں نے کبھی خیال نہیں کیا، کہ شمع نے دم بھر میں سینکڑوں پروانوں کی جانیں لے ڈالیں، لیکن خود صرصر فنا کے ایک طانچہ کے سامنے معًا بے نور تھی۔ ہاتھی نے ایک قدم رکھتے ہی صدہا چیونٹیوں کو کچل ڈالا لیکن قضائے الٰہی کے بیلچن کی ہلکی سی ٹکر کے سامنے خود تودہ خاک تھا۔ طاقتوروں نے کمزوروں کو، زبردستوں نے زیردستوں کو، سرمایہ داروں نے ناداروں کو تختہ مشق ہمیشہ ہی بنائے رکھا ہے لیکن انجام بھی ہمیشہ ہی کیا ہوتا رہا ہے؟ اسکا جواب مصر کے فرعونوں کی لاشیں، روؔمہ کے قیصروں کی ہڈیاں، بابؔل کے کھنڈر، اسیریا کے ویرانے مذبوح ومقتول زار روس کے جسم کی تڑپ، اور زندہ درگور قیصر جرمنی کے دل کی حسرتیں دیں گی۔ اکبر کا مرقع سیاست یہ تصویر بھی رکھتا ہے ــــه

شک اس میں کیا ہے کہ ساری دنیا ہے آج ان کی رفل کی زد پر
اشارہ فطرت کا ہے مگر یہ کہ خود بھی ہیں وہ، اجل کی زد پر

سنت الٰہی ایک یہ رکھی گئی ہے کہ سفینہ ظلم وجور چشم زدن میں غرق ہوکر رہتا ہے لیکن شروع میں نہیں۔ قہر وانتقام کی لہریں چاروں طرف سے لپکتی صرف اسوقت ہیں جب پہلے خوب مہلت مل چکتی ہے اور تمرد ورعونت، خود فراموشی وخدا فراموشی کی کشتی حد سے زیادہ بھاری ہوچکتی ہے اکبر کی زبانت اس اٹل حقیقت سے یہ مضمون پیدا کرتی ہے کہ دامان مشرق کو پارہ پارہ کرنے میں یورپ عجلت کیوں کررہا ہے، جبتک

اس طغیان وتمرد کی کشتی پوری طرح گرانبار نہ ہو چکے گی، غضب الٰہی جوش میں نہ آئے گا گویا اس شغلہ میں دیر تک مصروف رہنا، آنے والے یوم احتساب کو ٹالتے رہنا ہے ؎

یورپ کو پالیسی میں عجلت کی کیا ضرورت
ہے ملتوی قیامت تقسیم ایشیا تک

اس تمام سیاسی کشمکش و بین الاقوامی آویزش سے جو بربادیاں اور ہلاکتیں پیدا ہو رہی ہیں، ان سے تو اب کسی کو انکار نہیں، البتہ سوال یہ ہے کہ آخری فتح کس کے ہاتھ رہے گی "صاحب" اور صاحب زدوں کا کہنا یہ ہے کہ آخری جیت، ہمت و حوصلہ مندی، باقاعدگی، و خوش نظمی "علم" "روشن خیالی" تہذیب و شائستگی کی رہنا یقینی ہے، اکبر کا فیصلہ یہ ہے کہ مشیت الٰہی آخری تائید اسی فریق کی کرے گی جو نیکوکار ہے اور حسن عمل کے حصار میں پناہ گزیں ہے اور استادی کا کمال یہ ہے کہ اس وعظ خشک میں بھی زندہ دلی کی ادائیں بھردی ہیں ؎

شامت آئی ہے یہ مسلّم ہے — بحث اتنی ہی رہ گئی کس کی؟
میری جانب اشارہ غالب ہے — یعنی اکثر یہ کہتے ہیں اس کی
خیر جو کچھ خدا کی مرضی ہو؛ — کھل ہی جائیگا، آئی ہے جس کی
اس قدر تو مجھے بھی کھٹکا ہے — بڑھ گئی ہے بہت مری وسکی

اہل ملک کے لئے اس صورت حال کا آخر علاج کیا ہے؟ جتنی زبانیں، اتنی باتیں۔ اکبر کی تشخیص اور طریق علاج سب سے مختلف ہے، وہ کہتے ہیں کہ پرندہ جال میں کیوں پھنسا؟ کس نے اسے مجبور کیا؟ کسی نے بھی نہیں، بجز اس کی ہوس وطمع کے اکبر بے نیازی بے طمعی، بے غرضی کا آئیڈیل و مطمح نظر پیش کر کے سیاسیات کیا، تصوف کی تعلیم دیتے جاتے ہیں ؎

ہو مجھ پہ بتوں کی چشم کرم دل کو یہ طلب اصلا نہ رہی — مجھ کو بھی خدا نے غیرت دی انکو جو مری پروا نہ رہی

دنیا کا تردد جب تک تھا، جب تک کہ ہم اس کے طالب تھے
پھری جو نظر غم ہو گئے کم، رغبت نہ رہی، دنیا نہ رہی
سچ پوچھئے تو راحت ہی ملی دنیا سے جدا ہو جانے میں
تھوڑی سی اداسی ہے بھی تو ہو آفت تو مگر برپا نہ رہی

تحریک ترک موالات، جوان کے زمانہ میں چلی۔ اکبر اس سے متفق ضرور تھے، پھر بھی تحریک کے علم برداروں میں بڑی خامیاں پاتے تھے، کہتے تھے، یہ بھی کوئی جنگ ہے کہ روٹی نہ ملی نوکری نہ ملی، تو حکومت سے بگڑ بیٹھے، اور روٹھ کر جھنجلاہٹ میں لگے غصہ اس پر اتارنے مولوی ہو یا گریجویٹ، جھنجلاہٹ کا باعث وہی بھوک ہے ؎

نئی روشنی کا ہوا تیل کم — حکومت نے اس سے کیا میل کم
ادھر مولوی کس مپرسی میں تھے — نہ آفس میں تھے، اور نہ کرسی پہ تھے
یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جائیے — سیاسی کمیٹی میں ہل جائیے
اسی روشنی کا ہے بس یہ ظہور — خدا جانے ظلمت ہے اس میں کہ نور

حضرت اکبر نے شخصاً اپنا دامن ہمیشہ ہر قسم کی سیاسی مجلسوں سے الگ رکھا، انکا مطمح نظر وطن کے بجائے عاقبت، ملک کے بجائے حقانیت، اور قوم کے بجائے خدا تھا، اس لئے جن مجلسوں میں سب کی زبانیں چلتیں، خاموش رہتے، اور اسی خاموشی کی تعلیم دوسروں کو بھی دیتے ہیں ؎

آزادی کا شور مبارک — یہ تقلیدی زور مبارک
میرا تو ہے اور ہی منظر — میں تو یہ کہتا ہوں اکبر
عارف کو بے ہوشی زیبا — عاقل کو خاموشی زیبا

ان کے خیال میں سیاسی، ملکی، ملی، ہر مرض کی دوا ایک ہی تھی، طاعت عبادت عقیدت۔ مومن کیلئے ابتلا و آزمائش کا وقت آنا لازمی ہے، مومن وہی ہے جو امتحا

آزمائش میں پورا اترے، اور انتہائے کرب واضطراب میں بھی نظر شافی مطلق پر رکھے، اس مضمون کو لیکر پوری ایک غزل کہہ ڈالی ؎

مسجد میں خدا خدا کئے جاؤ مایوس نہ ہو دعا کئے جاؤ
ہرگز نہ قضا کرو نمازیں مرتے مرتے ادا کئے جاؤ
کتنا ہی ہو وقت بے حجابی تم پیروی حیا کئے جاؤ
امید شفا خدا سے رکھو کیوں ترک کرو، دوا کئے جاؤ

غلامی ومحکومی کا راز صرف یہ بتاتے ہیں، کہ ہم نے بدی کو نیکی پر ترجیح دے رکھی ہے۔ سلطنت وحکومت تو مادی حیثیت سے خلافت ونیابت الٰہی ہے، آج ہم اپنے ایمان کو زندہ اور اخلاق کو درست کرلیں تو مادی غلبہ ابھی حاصل کرلیں،

قوت ایماں سے کہدو سب کو مجھاتی ہے نیکیاں کثرت سے ہوں مغلوبیت جاتی رہے

اس حقیقت کا مشاہدہ تاسف وحسرت کی نظروں سے کرتے تھے کہ نام وطنیت وقومیت کا لیکر ساری دنیا، کیا مشرق اور کیا مغرب محض مادی غرض مندیوں کے لئے ایک دوسرے سے مصروف کا زار ہے، خوف خدا، حق پرستی کا وجود روز بروز عنقا ہوتا جاتا ہے اور اس لئے دنیا میں ہر روز ایک نئی تکلیف کا اضافہ ہو رہا ہے ؎

دین خدا ہے حق کی تجلی کے واسطے دنیا اٹھی ہے اپنی تعلّی کے واسطے
عارف جو ہیں، رہینگے وہ اللہ کیا اللہ ہی بس ہے ان کی تسلّی کے واسطے

سلطنتوں کا عروج وزوال، زمانہ کی معمولی دھوپ چھاؤں ہے آج اس قوم کا طبل اقبال بج رہا ہے، کل اس کا بجے گا۔ دولت کا تاج آج ایک قوم کے سر پر ہے، کل دوسری کے، یہ مدوجزر زمانہ کے سمندر میں ہر وقت اور ہر آن لگا رہتا ہے، ترک اگر اس وقت حکومت سے بے دخل کئے جا رہے ہیں[1] تو یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں

---

[1] جس عہد کے کلام پر یہ گفتگو چل رہی ہے، ترک اسوقت دنیا میں اسلامی اقتدار کے (باقی ملک)

ماتم انگیز حقیقت یہ ہے کہ ہمارا صبر و عزم، غیرت و خودداری، صدق و ثبات، ہم سے رخصت ہو رہا ہے، اور ہم روز بروز بجائے توفیق الٰہی اور قوت ذاتی پر اعتماد کرنے کے دوسروں کے محتاج و دست نگر ہوتے جاتے ہیں، حسرت ہماری اس قلب ماہیت پر نوحہ کرتی، اور عبرت آنسو بہاتی ہے ؎

انتظامی بات ہے یہ، ہوتی رہتی ہے یونہی — اس کا کیا شکوہ جو ہم پر اس کو غالب کردیا
ہاں یہ ہے افسوس، ہم سے چھن گیا صبر و قرار — طالب حق کو فلک نے بت کا طالب کردیا

اس وقت دنیا صرف "صاحب" ہی پر تھوڑے ہی مسلط ہے، ہماری ساری جدوجہد کا مرکز بھی تو دنیا اور محض دنیا رہ گئی ہے، اس سے آگے کی دوربینی رخصت۔ فلاح کی صورت صرف یہ ہے کہ ہم سے سر رشتۂ صبر کسی حالت میں نہ چھوٹنے پائے ؎

ارماں بہ قدر طاقت ہر سو نکل رہے ہیں — "صاحب" تواتر رہے ہیں اور ہم اچھل رہے ہیں
غصہ میں ہیں ہم ان پر، وہ ہم پہ ہنس رہے ہیں — دام فریب دنیا میں دونوں پھنس رہے ہیں
دونوں کو چاہئے یہ طاقت سے منھ نہ موڑیں — وہ اپنا جبر چھوڑیں، ہم صبر کو نہ چھوڑیں

تحریک ترک موالات کو درجہ قبول صرف اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب اس ضابطہ کی پہلی دفعہ کلمہ عبودیت ہو نہ کہ اس کی بنا خود بینی پر ہو کہ یہ توہین اہلیت[۱] ہوئی

---

(باقی حاشیہ صفحہ۔) سب سے بڑے اور زبردست نمائندہ تھے، سلطان المعظم اس وقت تک خلیفۃ المسلمین تھے، اور خادم الحرمین الشریفین۔ ترکوں کو جنگ عظیم اول میں جو شکست ہوئی (۱۹۱۸ء) یہ محض ایک سلطنت یا جغرافیائی اقلیم کی شکست نہ تھی، عالم اسلامی اسے اپنی شکست اور اپنے اوپر ضرب کاری سمجھا، ہندوستان میں جو عظیم الشان تحریک خلافت کے نام سے قائم ہوئی، وہ اسی احساس کا نتیجہ تھی۔

[۱] جولائی ۱۹۲۱ء میں الہ آباد میں نیاز حاصل ہوا تھا، کہ وہی آخری ملاقات تھی (باقی صفحہ پر)

قواب جب ہے کہ ناخوش ہو اس بنا پر تم　　کہ دل کو طاعت حق سے یہ دور کرتے ہیں
نہ یہ کہ عیش میں میرے ہیں یہ خلل انداز　　ہمیں ضعیف سمجھ کر غرور کرتے ہیں

یہ تو سنجیدہ گفتگو تھی، ورنہ جب ہنسنے ہنسانے پر آتے ہیں تو تحریک ترک موالات سے الگ رہنے کی وجہ کچھ اور ہی بیان کرتے ہیں، اس کی حیثیت "خانگی" اتنی ہے کہ کسی نامحرم کی زبان سے کیا ادا ہو۔ بہتر ہوگا کہ اسے خود انہیں کی زبان سے سنئے۔

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا　　اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

یہ شعر سنا کر بولے کہ یہ بھی آپ سمجھے کہ میں نے اپنے کو مدخولۂ گورنمنٹ کیوں کہا؟ پنشن پاتا ہوں نا! ملازمت میں ہوتا، تنخواہ پاتا تو مدخولہ نہیں منکوحہ کہتا!

## (ج) عشق و تغزل

اکبر کی شہرت عام، غزل گو کی حیثیت سے نہیں، تاہم کلیات اول و دوم میں انکی متعدد غزلیں اچھی سے اچھی موجود ہیں، ایسی کہ انہیں بلا تامل استادان غزل اردو کے کلام کے پہلو میں رکھا جا سکتا ہے کلیات اول کا سال طبع ۱۹۰۶ء ہے اسمیں حضرت اکبر نے خود اپنی غزل گوئی کے تین دور قائم کئے ہیں، سلسلہ بیان کے لئے ان میں سے

---

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۷) میرے اوپر نشہ تحریک خلافت و ترک موالات کا طاری تھا، مہاتما گاندھی کی روحانیت اور تقدس کی تعظیم و احترام میں سرشار تھا بات بات پر انکی بزرگی اور حیثیت کا حوالہ، دل میں اسکی آرزو کہ حضرت اکبر پر بھی یہ جادو چل جائے دو چار منٹ تو صبر کیا، اسکے بعد ایکبارگی پوچھ بیٹھے، اچھا صاحب تو گاندھی جی روحانیت کے بڑے قائل ہیں اپنی اس کمیٹی میں داخلہ کی پہلی شرط انھوں نے لا الٰہ الا اللہ تو ضروری رکھی ہوگی، میں چکرا کر ہی بھول گیا، مری ہوئی آواز سے جواب دیا کہ "جی نہیں" ایسا تو نہیں" بولے "بس تو مجھے بھی آگے کچھ پوچھنا نہیں بس ایک سیاسی انجمن ہے، جیسی اور بہت سی انجمنیں آج کل ہیں۔

ہر دور کے نمونۂ کلام پر ایک سرسری نظر کرتے چلئے۔

پہلا دور ۱۸۶۶ء تک اکبر کا سال ولادت ۱۸۴۶ء ہے، گویا یہ دوران کی شاعری کے بچپن کا تھا شاعر کا سن بیس سال کے اندر تھا۔ یہ سن بھی کوئی سن ہے۔ اُپنے اور اپنی شاعری دونوں کے اس لڑکپن میں وہ عام غزل گوئیوں کے بالکل ہم نوا ہیں۔ تاہم بہ جستگی شوخی روانی طبع ولطف زبان کے جوہر جو آگے چل کر اس آب وتاب سے چمکے، اسوقت بھی مخفی وغیر نمایاں نہیں۔ اور رعایت لفظی، لکھنؤ کے رنگ کی بھی خاصی موجود ہے، اشعار ذیل کے پڑھتے وقت یہ خوب یاد رہے کہ زمانہ ۱۸۶۶ء اور اس سے قبل کا ہے اودھ میں انگریزی نئی نئی قائم ہوئی ہے، نوابی کو گئے ہوئے ابھی چند ہی سال ہوئے اودھ ومضافات اودھ میں، زندگی کے ہر شعبہ میں خصوصاً شعر وادب میں پرانے لکھنؤ کی خو بو پوری طرح باقی ہے بلکہ وہی مذاق ابھی تک قائم ہے ؎

بے تکلف بوسۂ زلف چلیپا لیجئے — نقد دل موجود ہے پھر کیوں نہ سودا لیجئے
دل تو پہلے لے چکے اب جان کے خواہاں ہیں آپ — اس میں بھی مجھ کو نہیں انکار اچھا لیجئے
پاؤں پڑ کر کہتی ہے زنجیر زنداں میں رہو — وحشت دل کا ہے ایما، راہ صحرا لیجئے

---

سنتا ہوں چمن میں جو تری زمزمہ سنجی — یاد آتی ہے، بلبل، مجھے تقریر کسی کی

دوسرا مصرعہ غالبًا طرحی ہے۔

پھر گئی آپ کی دو دن میں طبیعت کیسی — یہ وفا کیسی تھی صاحب، یہ مروت کیسی
کوچہ یار میں جاتا تو نظارہ کرتا — قیس آوارہ ہے جنگل میں، یہ وحشت کیسی

---

جذبۂ دل نے مرے تاثیر دکھلائی تو ہے — گھنگھروؤں کی جانب در کچھ صدا آئی تو ہے
عشق کے اظہار میں ہر چند رسوائی تو ہے — پر کروں کیا؟ اب طبیعت آپ پر آئی تو ہے

آپ کے سر کی قسم، میرے سوا کوئی نہیں — بے تکلف آئیے، کمرہ میں تنہائی تو ہے

دوسرا دور ۱۸۶۶ء تا ۱۸۸۴ء، رندی و ہوسناکی کے مضامین اس دور میں بھی باقی ہیں، تاہم جذبات نگاری کی بنیاد پڑ چکی ہے، رنگ تغزل کہیں زیادہ نکھر گیا ہے اور لطف زبان و حسن بیان کے جوہر چمک اٹھے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

آج آرائش گیسوئے دوتا ہوتی ہے — پھر مری جان گرفتار بلا ہوتی ہے
شوق پابوسیٔ جاناں مجھے باقی ہے ہنوز — گھاس جو اگتی ہے تربت پہ حنا ہوتی ہے
پھر کسی کام کا باقی نہیں رہتا انسان — سچ تو یہ ہے، کہ محبت بھی بلا ہوتی ہے
جس نے دیکھی ہو وہ چتون کوئی اس سے پوچھے — جان کیونکر ہدف تیر قضا ہوتی ہے
ہوں فریب ستم یار کا قائل اکبر — مرتے مرتے نہ کھلا یہ کہ جفا ہوتی ہے

اسی زمین میں ایک مشہور و مقبول غزل مرزا لکھنوی کی ہے، اکبر کی غزل اسکے ٹکر کی ہے

---

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا — آنکھ ان سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا
جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا — بلبل گل تصویر کا شیدا نہیں ہوتا
میں نزع میں ہوں، آئیں تو احسان ہے انکا — لیکن وہ یہ سمجھ لیں کہ تماشا نہیں ہوتا
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام — وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

دوسرے شعر میں اکبری معنویت پوری طرح ادا کر دی ہے، اور چوتھا شعر تو گویا اب ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

---

یار نے کچھ خبر نہ لی، دل نے جگر نے کیا کیا — نالۂ شب سے کیا ہوا، آہ سحر نے کیا کیا
کھل گیا سب پہ حال دل ہنستے ہیں دوست برملا — ضبط کیا نہ راز عشق، دیدۂ تر نے کیا کیا

---

دور سوم ۱۸۸۵ء تا ۱۹۰۸ء اس دور کا کلام، رنگ تغزل میں پختگی کا نمونہ ہے۔ طرز ادا میں سنجیدگی بڑھ گئی ہے۔ مضمون آفرینی پر توجہ زیادہ ہو گئی ہے۔ غزل میں اخلاقی و روحانی مضامین کی آمد بے تکلفانہ شروع ہو گئی ہے، ظرافت کا چٹخارا بھی جا بجا موجود ہونے لگا ہے، پھر بھی تغزل کا جو رنگ مسلم و مستند اور ثقہ استادوں کے درمیان متعارف ہے اس سے مجال نہیں کہ مصرعہ الگ جا پڑے۔ ملاحظہ ہو ؎

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا — بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا
بزم یاراں سے پھری باد بہاری مایوس — ایک سر بھی اسے آمادہ سودا نہ ملا
گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش — طالب زمزمہ بلبل شیدا نہ ملا
ہوشیاروں میں تو اک اک سے سوا ہیں اکبر — مجھ کو دیوانوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا

---

دل مرا ان پہ جو آیا تو قضا بھی آئی — درد کے ساتھ ہی ساتھ اس کی دوا بھی آئی
آئے کھولے ہوئے بالوں کو تو شوخی سے کہا — میں بھی آیا ترے گھر، میری بلا بھی آئی
وائے قسمت کہ مرے کفر کی وقعت نہ ہوئی — بت کو دیکھا تو مجھے یاد خدا بھی آئی
ہوئیں آغاز جوانی میں نگاہیں نیچی — نشۂ آنکھوں میں جو آیا تو حیا بھی آئی

---

غنچۂ دل کو نسیم عشق نے وا کر دیا — میں مریض ہوش تھا، مستی نے اچھا کر دیا
شان محبوبیٔ صانع کا نشاں رکھا ہے یہ — ورنہ کیا تھا جس نے دل میں درد پیدا کر دیا
کیا مرے اک دل کو خوش کرنے پہ وہ قادر نہیں — ایک کن سے دو جہاں کو جس نے پیدا کر دیا
سب کے سب باہر ہوئے، ہوش و خرد وہم و تمیز — خانۂ دل میں تم آؤ ہم نے پردہ کر دیا
شاہد بزم ازل نے ایک نگاہ ناز سے — عشق کو اس انجمن میں مسند آرا کر دیا
شور شیریں کا مزہ رکھا، سر فرہاد میں، — قیس کو دیوانہ انداز لیلیٰ کر دیا

گردنِ پروانہ میں ڈالی کمندِ شوقِ شمع — رنگِ گل کو دیدۂ بلبل کا پھندا کر دیا

جس نے یہ سب کچھ کیا اکبرؔ میں تم سے کیا کہوں
اس نے مجھ کو کیا کیا، دل کو مرے کیا کر دیا

---

وہ حجاب ان کا آج تک نہ گیا — نہ گیا ان کے دل سے شک نہ گیا
اک جھلک ان کی دیکھ لی تھی کبھی — وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا

---

سینہ کا زخم آہ کی سختی سے چھل گیا — اچھا ہوا مزا تو محبت کا مل گیا
ایسے ستم کئے کہ مرا قلب ہل گیا — اور اس طرح کہ سینہ کا ہر داغ چھل گیا
تیرا پتہ چمن کو صبا سے جو مل گیا — بلبل کو وجد آگیا، غنچہ بھی کھل گیا
خوش قسمتی پہ اپنی بجا ہے کروں جو ناز — اپنے ہی دل میں مجھ کو مرا رب بھی مل گیا

---

الجھا نہ مرے آج کا دامن کبھی کل سے — مانگی نہ مدد دل نے مرے طولِ امل سے
ان کی نگہِ مست ہے لبریزِ معانی — ملتی ہوئی تاثیر میں حافظ کی غزل سے
ادراک نے آنکھیں شبِ اوہام میں کھولیں — واقف نہ ہوا روشنیٔ صبحِ ازل سے
قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے — کس حسن سے یہ بھی تو سنو، حسنِ عمل سے[1]

---

[1] یہ غزل حضرت اکبرؔ نے لکھنؤ میں ایک مشاعرہ میں پڑھی، لکھنؤ کے ایک مشہور وکیل منشی حاجی اطہر علی کاکوروی مرحوم، ایک صاحبِ علم و صاحبِ دل بزرگ بھی مشاعرہ میں موجود تھے، اکبرؔ نے خود یہ روایت مجھ سے بیان فرمائی کہ جب اس شعر پر پہنچا، ابھی پہلا ہی مصرعہ زبان سے نکلا کہ آنکھیں منشی صاحب سے چار ہوگئیں، منشی صاحب کے تیور بدلے ہوئے تھے، کہ قرآن اور خدا سے یہ شوخی کیا معنی۔ میں تاڑ گیا۔ برجستہ عرض کیا کہ مصرعہ ملاحظہ ہو، اور پھر دوسرا مصرعہ پڑھا، تو منشی صاحب پھڑک اٹھے بے اختیار مجھے گلے لگایا۔

حکم آیا خموشی کا تو بس حشر تلک چپ  ہیبت تیرے پیغام کی ظاہر ہے اجل سے
درجہ تحقیر کا ہے ، بے خود سے فرد تر  ہے روح کو امید ترقی کی اجل سے
بحث کہن ونو ، میں سمجھتا نہیں اکبر  جو ذرہ ہے موجود ہے وہ روز ازل سے

---

یہ تین دور تو خود حضرت اکبر کے قائم کئے ہوئے تھے ، کلیات اول کے زمانہ تک ۔ اب اسکے بعد دور چہارم ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک سمجھئے ۔ یہ کوئی مستقل دور نہیں ، اسے دور سوم کا تکملہ سمجھنا چاہیئے ، دور سوم تک کا کلام ، کلیات اول میں موجود ہے اسکے بعد کے چار سال کا کلام کلیات دوم میں ہے ، بس اسی لئے اس حصہ کے لئے ایک جداگانہ دور قائم کرنا پڑا ۔ ۱۹۰۸ء تک غزل میں جتنی پختگی آنا تھی آچکی تھی ، شاعر کی عمر اب ۶۰ - ۶۲ سال کی ہوچکی تھی ، اور شمار اب استادوں میں تھا اسکے بعد صنف غزل میں کسی جدت کی توقع تھی ، اور نہ کوئی جدت واقع ہوئی ، کیفیت وہی قائم رہی ، البتہ اتنا فرق ہوا کہ کلیات اول بیشتر حصہ غزلوں کا ہے کلیات دوم میں اول تو یہ تناسب ہی گھٹ گیا ہے ، اور پھر جتنا حصہ غزلیات کا ہے بھی ، اس میں بھی صرف عشق و محبت ہی کے بندھے ٹکے ہوئے معاملات نہیں ، بلکہ اخلاق ، معاشرت فلسفہ و سیاست و تصوف و معرفت سب ہی کے مضمون شامل ۔ بایں ہمہ اس دور کا عاشقانہ حصہ بھی کسی معیار سے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ۔ لطف و کیفیت ہر سطر سے نمایاں ۔ پختگی اور شگفتگی کے ثبوت ہر صفحہ پر ۔ مضمون آفرینی اور استادی کا رنگ ایک ایک شعر سے پھوٹا پڑتا ہے ، طبیعت کی آمد ، جدت مضامین کے ساتھ ردیف و قافیہ میں بھی ندرت کی بہار دکھانے لگی ہے ؎

وقت طلوع دیکھا ، وقت غروب دیکھا  اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا
اس نے خدا کو مانا ، وہ بورہا بتوں کا  یا اس نے خوب سمجھا ، یا اس نے خوب دیکھا

نہ یہ رنگ طبع ہوتا، نہ یہ دل میں جوش ہوتا — یہ جنوں اگر نہ ہوتا، تو کہاں یہ ہوش ہوتا
غم دہر سے بچاتا ہے بشر کو مست رہنا — مجھے شاعری نہ آتی تو میں بادہ نوش ہوتا
تمہیں دیکھ سن کے فطرت نے ہیں نقش کھینچے ورنہ — نہ یہ ہوتی چشم نرگس، نہ یہ گل کا گوش ہوتا
دل و دیں سب اُسکے صدقے، جو وہ خود نما نہ ہوتا — کوئی زندہ ہی نہ رہتا جو وہ خود فروش ہوتا
حسنِ نظامی اکبرؔ کا کلام سن کے بولے — تجھے میں ولی سمجھتا جو تو خرقہ پوش ہوتا

---

بتوں سے میل، خدا پہ نظر، یہ خوب کہی — شب گنہ و نماز سحر، یہ خوب کہی
تمہاری خاطرِ نازک کا ہے خیال فقط — دگرنہ مجھ کو رقیبوں کا ڈر، یہ خوب کہی
شباب و بادہ و فکر مآل کار چہ خوش — جنون و عشق و خیال خطر، یہ خوب کہی
سوال وصل کروں یا طلب ہو بوسہ کی — وہ کہتے ہیں مری ہر بات پر یہ خوب کہی

---

آہ دل سے جو نکالی جائے گی — کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی
یادان کی ہے، بہت عزلت پسند — آہ بھی دل سے نکالی جائے گی
نزع کہتی ہے کہ روٹھی تجھ سے جاں — حشر کہتا ہے منالی جائے گی
یاد ابرو میں ہے اکبرؔ محو کیوں — کب تری یہ کج خیالی جائے گی

---

ایک صوت سرمدی ہے جس کا آنا جوش ہو — ورنہ ہر ذرہ ازل سے تا ابد خاموش ہے
آئینہ سے بھی وہ بچتے ہیں کہ پڑ جائے نہ عکس — شرم کہتی ہے کہ یہ بھی صاحب آغوش ہے
حضرت منصور انا بھی کہہ رہے ہیں حق کے ساتھ — دار تک تکلیف فرمائیں جب اتنا ہوش ہے

(یہ تیسرا شعر منصور حلاج کی پرشور و معرکۃ الآرا بحث میں قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے دوسرا مصرعہ پڑھتے وقت "تکلیف شرعی" کی اصطلاح یاد رہے)

شوق وصل شعلہ رویاں کیوں نہ ہو برسات میں    ابر کو بھی دیکھتا ہوں برق درآغوش ہے

---

رنگ شراب سے مری نیت بدل گئی    واعظ کی بات رہ گئی، ساقی کی چل گئی
تیار تھا نماز پہ میں سن کے ذکر حور    جلوہ بتوں کا دیکھ کے نیت بدل گئی
مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمہ پر شاد ہو    صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی
چمکا ترا جمال جو محفل میں وقت شام    پروانہ بے قرار ہوا شمع جل گئی
حسرت بہت ترقی دختر کی تھی انہیں    پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

---

دور پنجم ۱۹۱۷ء تا ۱۹۱۹ء۔ اس دور کا کلام کلیات سوم میں ہے اور وہی اس تبصرہ کا اصل موضوع ہے۔ شاعر کی عمر اب ستر کے لگ بھگ یا ستر سے اوپر ہے اور اب وہ شاعر سے کہیں زیادہ مفکر ہے، دل شاہد و شراب چنگ و رباب کے تذکروں سے اچاٹ ہو چکا ہے، آگ معرفت اور عشق حقیقی کی بھڑک چکی ہے، رواجی مجازی تغزل کا رنگ ہلکا پڑ چکا ہے۔ غزل کہنا بھی اس زمانہ میں بہت کم ہو گیا تھا زیادہ تر سیاسی، اخلاقی عارفانہ و ظریفانہ نظمیں کہا کرتے تھے۔ بظاہر عنوان غزلیات کا کلیات سوم میں بھی خاصہ بڑا ہے، لیکن درحقیقت غزلیت کا عنصر ان میں بہت ہی کم ہے عموماً واقعات حاضرہ پر شاعر کے خیالات اور تبصرے ہیں، صرف موزوں انھیں غزل کے سانچے میں کر دیا گیا ہے۔ یہ خصوصیت موجود تو ان کی ابتدائی غزلوں میں بھی تھی درمیانی کلام میں اور بڑھی اور آخری زمانہ میں تو یہی خصوصیت، دوسری خصوصیتوں پر چھا گئی، اور کلام پر غالب آ گئی۔

کلیات اول کے پہلے ایڈیشن کے شائع ہونے پر ایک سنجیدہ ناقد نے اپنی رائے ظاہر کی تھی کہ:۔

ومصنف بہ نسبت شاعر کے بہت زیادہ ایک مفکر (سوچنے والا، صاحب فکر) یا فلاسفر ہے، جس نے اپنے خیالات کو خوبی کے ساتھ نظم کر دیا ہے۔"

حضرت اکبر کو یہ رائے بڑی پسند آئی، اسے وہ اپنی حقیقی داد سمجھے اور واقعہ ہے بھی یہی، کہ جوں جوں ان کی شاعری نکھرتی گئی، وہ روز بروز اس کے مصداق صحیح سے صحیح تر ہوتے گئے ابھی کلیات سوم کی دو ایک غزلیں درج ہوتی ہیں، ان سے معلوم ہوگا کہ قالب اگرچہ غزل کا ہے، لیکن روح ذرا بھی غزل کی نہیں (غزل اپنے عام عرفی و مقبول معنی میں) جام و سبو کی شکل پر جائیے تو اب بھی ہر طرف شراب ہی شراب نظر آئے گی، لیکن چکھ کر دیکھئے تو آپ خود ہی پکار اٹھیں گے کہ استغفر اللہ، شراب یہاں کہاں، یہ تو پیالیوں میں عرق ماءاللحم یا شربت روح افزا چھلک رہا ہے ظرافت کی چاشنی اخلاق وسیاسیات کے شربت میں شیر و شکر ہوتی نظر آرہی ہے۔"

ذیل کی غزل کو آپ غزل کہیں گے، یا ایک درس تصوف ومعرفت "سخن بازنان گفتن[1]" یہ کس معنی میں ہے؟

| | |
|---|---|
| نگاہ اٹھی ہے احساس ماسوا کے لئے | کہاں ہے دل ذرا رو کے اسے خدا کیلئے |
| رواں ہو کار جہاں کیوں ہماری مرضی پر | خدا ہمارے لئے ہے کہ ہم خدا کے لئے |
| عمل خدا کے لئے ہو تو اس کا کیا کہنا | مگر ریا یہ بری صرف واہ وا کے لئے |

---

لیلائے تغزل کے مجنوں دور سے محل کو دیکھ شوق سے اس کی طرف لپکتے ہیں پاس آکر اندر جھانکتے ہیں، تو نہ کوئی عشوہ فروش ہے، نہ کوئی زہرہ جبیں، بلکہ کوئی شیخ وقت کچھ تسبیح وتہلیل کرتے سے نظر آتے ہیں ؎

---

[1] غزل کے لغوی معنی۔

خدا کے نام کا ہے احترام عالم میں — نہ صرف آپ میں ہم میں، تمام عالم میں
اسی کا نام نہ کیوں مرکز زباں ہو جائے — کہ اختلاف سے خالی ہو کام عالم میں
خدا پرست کو کافی ہے شغل ابراہیم — زوال شمس و قمر، صبح و شام عالم میں
یہی مشن تھا جناب رسول اکرم کا — اور آج انہیں کا تو روشن ہے نام عالم میں

ذوق نظر کے شیدائی، چنگ ورباب کے رسیا، دور سے باجے گاجے کی آواز سن سنا دوڑتے ہوئے آتے ہیں کہ جلسۂ اندر سبھا ناٹک کا لطف اٹھائیں، جلوہ گاہ کا جب پردہ اٹھتا ہے تو سارا وہم وتخیل ہی برباد۔ نہ مطرب ہے نہ ساز، نازبنا انداز محفل میں بجائے ساز کے سوز ہے لبوں پر بجائے واہ کے آہ ہے طبلہ کی تھاپ کی جگہ ضربیں کچھ اللہ ہو کی سی لگ رہی ہیں۔ چہروں پر بجائے ہنسی کی کھلکھلاہٹ کے، خشیت کے آثار وانوار اور وسط بزم میں ایک صاحب حال بیٹھے ہوئے اپنی آگ سے دوسروں کو گرمارہے ہیں

گو سعی ہوائے شوق نے کی۔ بو اس کی نہ نکلی محفل سے
مجنوں نے اُڑائی خاک بہت، لیلیٰ نہ نہ جھانکا محمل سے
دنیا کے تغیر کا نہیں حس شیدائے جمال یاری کو
پروانہ کو مطلب شمع سے ہے، کیا کام ہے رنگ محفل سے
احساس ہی ایذا کا نہ ہوا، فریاد وفغاں میں کیا کرتا
جس وقت نہ خنجر تھا گلا، آنکھ اپنی لگی تھی قاتل سے

طبیعت زہد خشک سے اکتا چلی ہو، اور دل میں ظرافت کی گدگدی اٹھ رہی ہو، تو اس رنگ کو بھی کہیں دور نہیں جانا ہے۔ ندرت قافیہ کے طلسم ساز کے لئے آگ کو برف بنا کر پیش کر دینا کیا مشکل ہے، اس نمونہ کا کلام بھی غزلوں کے تحت موجود ہے۔

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے — صرف تعویذ اور گنڈا ہے
کیا ہے باقی جناب قبلہ میں — کچھ صدریاں ہیں ایک ڈنڈا ہے

غرض یہ تو ایک حقیقت ہے کہ آخری دور کا جو کلام غزلیات کے زیرِ عنوان رکھا گیا ہے، اس کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ بس وہ غزلیں نام ہی کی ہیں۔

ہاں یہ جب کبھی غزل سرائی پر آئے ہیں، پورے عاشق بن گئے ہیں جو کچھ بھی عاشقانہ رنگ میں کہا ہے، خوب کہا ہے اپنے مرتبۂ کمال کو اس رنگ میں بھی قائم رکھا ہے، اور درجۂ استادی کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ لطف زبان و سلاست بیان، ان کی غزل کی جان ہے۔ دشوار پسندی نے بعض اچھے اچھے غزل گویوں کو غارت کر دیا ہے۔ اکبرؔ کا گلستان ان کانٹوں سے پاک ہے۔ پھر بیان کی لطافت کے ساتھ خیال کی بلندی بھی قائم و برقرار۔ صورت کے بناؤ سنگار میں اتنا محو نہیں ہوتے کہ معنی کی پاکیزگی کی طرف سے آنکھ ہی بند کر لیں جانتے ہیں کہ قافلہ میں لوگ سب ہی طرح کے ہیں۔ ایسے بھی جو نقش محمل کی آب و تاب، چمک دمک سے جی خوش کریں گے ایسے بھی جو محمل نشین کی زیارت کئے بغیر دم نہ لیں گے۔ دونوں طرح کے دلوں کی ڈوریں یہ نافہ بارِ سخن اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔

رسمی غزل گوئی کے برخلاف، ایک غزل میں تماشا گاہ فطرت کا نظارہ کرتے ہیں اور فطرت کے کھلے ہوئے میدان میں دن دوپہر وہ مزے حاصل کرتے ہیں، جن کی تلاش رسمی شاعروں کو خدا نے کہاں کہاں سرگرداں رکھتی ہے لیکن پھر آخر جذبات مشرقی شاعر کے رکھتے ہیں، اور اس شان کو مقطع میں نباہ لے جاتے ہیں ؎

جلوہ عیاں ہے قدرت پروردگار کا ۔۔۔ کیا دل کشا یہ سین ہے فصل بہار کا
نازاں ہیں جوش حسن پہ گلہائے دلفریب ۔۔۔ جوبن دکھا رہا ہے یہ عالم ابھار کا
ہیں دیدنی بنفشہ و سنبل کے پیچ و تاب ۔۔۔ نقشہ کھنچا ہوا ہے خط و زلف یار کا
سبزہ ہے یا یہ آب زمرد کی موج ہے ۔۔۔ شبنم ہے، بحر یا گہر آبدار کا
مرغان باغ زمزمہ سنجی میں محو ہیں ۔۔۔ اور ناچ ہو رہا ہے نسیم بہار کا

موج ہوا ہے زمزمۂ عندلیب مست — اک ساز دل نواز ہے مضراب و تار کا
ابر تنک نے رونق موسم بڑھائی ہے — غازہ بنا ہے روئے عروس بہار کا
افسوس اس سماں میں بھی اکبر اداس ہے — سوہان روح ہجر ہے اک گلعذار کا

حقیقت سے بے نیاز ہو کر بھی شاعر محض الفاظ کی تراش خراش میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی شاعری پر، یہ حقیقی شاعر کیسی جچی تلی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ رائے شاعرانہ بھی اور مطابق واقعہ بھی ہے۔

معنی کو چھوڑ کر جو ہوں نازک بیانیاں — وہ شعر کیا ہے رنگ ہے لفظوں کے خون کا

ذیل کی غزل میں تغزل کے پامال مضمونوں کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ اور آخری شعر عجب نہیں، کہ کہنے والے کی نجات کے لئے بس ہو جائے۔

گھٹتا جاتا ہے مری نظروں میں مقدور مرا — بڑھتا جاتا ہے شمار ان کے خریداروں کا
بحث میں عفو و سزا کے یہ لڑے مرتے ہیں — فیصلہ کریں وہ اب اپنے گنہگاروں کا
بے خطر پھرتا ہوں بازار جہاں میں ہر سو — کیسہ خالی ہے تو کیا خوف ہے عیاروں کا
فطرت اچھی ہے شفاعت کو ملائک ہیں خموش — حشر ہے عشق و محبت کے گنہگاروں کا

غزلیہ شاعری کا سب سے زیادہ پامال مضمون عشق ہے۔ ہر سخن گو کا تختہ مشق کہنا چاہئے یا تکیہ کلام۔ دفتر کے دفتر اس کی شرح میں سیاہ ہو چکے ہیں، اور عاشقوں کی تعداد کا تو کوئی شمار و حساب ہی نہیں۔ لیکن عشق جس کیفیت قلب سے عبارت ہے، وہ لفظ و عبارت کی گرفت اور حد بندی سے اب بھی پرے ہے۔ اکبر اس گونگے کے خواب کی مصوری اپنے مرقع میں یوں کرتے ہیں، اور خوب کرتے ہیں ؎

عشق میں حسن بیاں وجہ تسلی نہ ہوا — لفظ جو کا مگر آئینہ معنی نہ ہوا

اسلوب بیان کی ندرت و بلاغت ملاحظہ ہو۔ شاعر کو دعویٰ اپنی قوت گویائی پر ہے، بڑے بڑے پیچیدہ مسئلوں کو وہ دو دو باتوں میں نمٹا دیتا ہے، دقائق کی گتھیاں

وہ اشارے اشاروں میں سلجھا دیتا ہے "حسن بیان" اس ساری داستاں کا ترجمان ہے، لیکن عاشق ہونے کے بعد اسے کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ اس کی یہ ساری قوت گویائی بیکار ہی گئی، الفاظ کا ذخیرہ اب بھی وہی، بیان کا ملکہ اب بھی وہی، قدرت زبان وہی، لفظ محل اور سلسلہ تقریر بلیغ و شستہ یہ سارا مفہوم "لفظ چمکا" سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے، لیکن پھر بھی کوئی بات تو ایسی ہے کہ معنی کی توضیح نہیں ہو پاتی، کیفیت قلب کا عکس دوسروں پر نہیں پڑنے پاتا شیشہ میں آب و تاب، چمک دمک سب موجود لیکن عکس قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے، آئینہ سعی نہ ہوا، جام بلوریں اس پوری کیفیت کا آئینہ ہے، ضمناً یہ پہلو بھی وجہ تسلی نہ ہوا پیر آگیا ہے، کہ تسلی کا تعلق زبان و بیان سے نہیں، بلکہ قلب اور اس کے احساس سے ہے۔

اسی زمین میں ایک دو شعر بھی ہے افسردگی یاس و حرماں نصیبی کی ایک بولتی ہوئی تصویر۔ ایسے کلام کی قدر چڑھتی جوانی میں نہیں، بڑھاپے کے ڈھلتے ہوئے سن کو پہنچ کر ہوتی ہے ؎

دل میں کہتے تھے کہ یہ ہوگا وہ ہوگا لیکن　　کٹ گئی عمر امیدوں ہی میں کچھ بھی نہ ہوا

اکبر کے دور آخر کی اکثر غزلوں کی تان، یاس و افسردگی کی آہوں پر آکر ٹوٹتی ہے دنیا کی بے ثباتی، اور اس سے اپنی بے تعلقی، لذت دنیا کی بے حقیقتی یہ موضوع اکبر کی اکثر آخری غزلوں میں مشترک ہے، ذیل کی غزل انہیں جذبات کی ترجمان ہے بعض، تشبیہوں کی ندرت پر لطافت لوٹ لوٹ جاتی ہے،

دنیا میں ہوں، دنیا کا طلبگار نہیں ہوں　　بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں
زندہ ہوں مگر زیست کی لذت نہیں باقی　　ہر چند کہ ہوں ہوش میں ہشیار نہیں ہوں
اس خانۂ ہستی سے گزر جاؤں گا بے لوث　　سایہ ہوں فقط نقش بہ دیوار نہیں ہوں
افسردہ ہوں عبرت سے، دوا کی نہیں حاجت　　غم کا مجھے یہ ضعف ہے، بیمار نہیں ہوں

وہ گل ہوں خزاں نے جسے برباد کیا ہو　　الجھوں کسی دامن سے، میں وہ خار نہیں ہوں

یارب مجھے محفوظ رکھ اس بت کے ستم سے　　میں اس کی عنایت کا طلبگار نہیں ہوں

گو دعویٰ تقویٰ نہیں درگاہ خدا میں　　بت جس سے ہوں خوش ایسا گنہگار نہیں ہوں

افسردگی و ضعف کی کچھ حد نہیں اکبر　　کافر کے مقابل میں بھی دیندار نہیں ہوں

دنیا میں رہ کر دنیا سے بےلوث وبے تعلق رہنے کو بہت سے شاعروں نے باندھا ہے لیکن یہاں پہلے اور تیسرے شعر میں جن دلنشیں تشبیہات کی مدد سے یہ مضمون باندھا گیا ہے، وہ اکبر ہی کا حصہ ہے۔ ضعف کا مضمون بھی پامال ہو چکا ہے، لیکن اکبر چوتھے شعر میں ایک نیا پہلو یہ نکالتے ہیں کہ غم و افسردگی میں اس قدر لاغر ہوں کہ لوگ مجھے بیمار سمجھ رہے ہیں، اور دوا کی فکر میں ہیں، چھٹے اور ساتویں شعر میں سیاسی رمز اور کنائے ہیں۔

عشق کا، بانی دم بھرنے والے بے شمار ہیں لیکن، واقعی عشق کی کسک اپنے پہلو میں رکھنے والے کہیں دو چار ہی ملیں گے۔ آہیں سب کرتے ہیں۔ لیکن مجنوں کا سوز کسی کی آہ میں نہیں ملتا سوز عشق کی اہلیت بس مخصوص اور گنے گنے دلوں میں ہوتی ہے، عام خلقت کو اس سے کوئی حصہ نہیں ملا ہے۔ اس مفہوم کو یہ شاعر یوں ادا کرتا ہے ؎

باطن بہت ہیں ایسے جو مشتعل نہیں ہیں　　سینہ میں سب کے دل ہیں پر اہل دل نہیں ہیں

اس مضمون کو ایک مطلع میں بھی ادا کیا ہے۔

مقبول جو ہوں شاذ ہیں، قابل تو بہت ہیں
آئینہ کے مانند ہیں کم، دل تو بہت ہیں

"مقبول" و "قابل" کا تقابل بھی کیا خوب!

اسی زمین میں ایک اور شعر ہے، اور وہ بھی اسی مضمون سے متعلق ہے ؎

وہ کم ہیں تڑپنے میں جنہیں ملتی ہے لذت
یوں آپ کی شمشیر کے بسمل تو بہت ہیں

تیغ کے بسمل تو ہزار ہا عمل آئیں گے، لیکن اس تڑپ میں لذت پانے والے کتنے نکلیں گے! مجاز پر محمول کیجئے یا حقیقت پر سیاست میں لے جائیے یا معرفت میں، واقعیت سے خالی کوئی بھی پہلو نہ نکلے گا۔

عاشق خوب جانتا ہے کہ کوئے قاتل میں گھومنا پھرنا اپنی جان سے ہاتھ دھونا ہے لیکن اگر انجام بینی اس قصد سے باز رکھے، اور دل پر اسے اتنا ہی قابو حاصل رہے تو پھر وہ عاشق کیوں کہلائے؟

ذوق ہوائے کوچۂ قاتل کو کیا کروں
ہرچند بھی یہ شوق مگر دل کو کیا کروں

اس کی تڑپ، اس کا سوز، اس کا جوش و خروش، ان میں سے کوئی شے اس کے قصد و اختیار کے اندر نہیں۔ یہ ساری کیفیات تو اضطراری ہیں، اس کا اثر زدہ قلب اس سے خود بخود یہ سب کچھ کراتا رہتا ہے ؎

اظہار اضطراب کا شائق نہیں ہوں میں
پہلو میں لیکن اس دل بسمل کو کیا کروں

ناصح کہتے ہیں کہ نظارۂ گل ترک کردو تو دل خود بخود قابو میں آجائے گا، لیکن کوئی بہتا تا کہ ہوا کی مستی اور دوسرے عاشقوں کی صدائیں، دل پر قابو ہی کب رہنے دیں گی ؎

قطع نظارۂ گل سے نہیں مانع جنوں بوئے بہار و شور عنادل کو کیا کروں

داغ کی ایک مشہور غزل ہے ؎

بات ری کبھی سنی ہی نہیں جانتے وہ بری بھلی ہی نہیں

اس کا یہ شعر خوب چلا ہوا ہے ؎

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

اس زمین میں اکبر نے جو گل بوٹے کھلائے ہیں، ذرا اس کی بھی سیر ہو جائے ؎

چرخ سے کچھ امید تھی ہی نہیں — آرزو میں نے کوئی کی ہی نہیں
مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں — فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
چاہتا تھا بہت سی باتوں کو — مگر افسوس اب وہ جی ہی نہیں
جرأت عرض حال کیا ہوتی — نظر لطف اس نے کی ہی نہیں
اس مصیبت میں دل سے کیا کہتا — ایسی کوئی مثال تھی ہی نہیں
آپ کیا جانیں قدر "یا اللہ" — جب مصیبت کوئی پڑی ہی نہیں
شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا — میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں

پوچھا اکبر ہے آدمی کیسا!
ہنس کے بولے وہ آدمی ہی نہیں

"فالتو" عجب محاورے لفظ کو کس خوبی سے کھپا دیا ہے۔ اور "سوسائٹی" کا قافیہ لانا تو اکبر کا حصہ تھا گردش چرخ کا شکوہ سب ہی شاعر شروع سے کرتے آئے ہیں، اکبر نے دوسروں کے تجربہ سے فائدہ یہ اٹھایا کہ سرے سے کوئی آرزو ہی فلک سے قائم نہ کی اور مزے میں رہے پانچویں شعر میں ایک نادر مضمون باندھا ہے۔ مصیبت زدہ کی تسکین کیلئے دوسروں کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں، لیکن ہمارے شاعر کو جن مصائب کا سامنا ہوا ہے، ان کی کوئی نظیر ہی نہ تھی، وجہ یہ تھی، وہ کس کی مثال سے اپنے دل کو تسکین دیتے مصیبتوں کے بے پناہ اور بے حد حساب ہونے کا یہ ایک اچھوتا انداز بیان ہے چھٹے اور ساتویں شعر کا تعلق ذاتی تجربہ سے ہے، انکی داد کے لئے آپ بیتی کی مدد لینی لازمی ہے۔

ایک اور غزل ملاحظہ ہو

جلوہ ساقی دے جان لئے لیتے ہیں — شیخ خوش ہوں کہ خفا ہم تو پئے لیتے ہیں
دل میں یادان کی جو آئی ہوئی شرماتی ہے — درد اٹھتا ہے کہ ہم آڑ کئے لیتے ہیں
دور تہذیب میں پریوں کا ہوا دور نقاب — ہم بھی اب چاک گریباں کو سئے لیتے ہیں

خودکشی منع، خوشی گم، یہ قیامت ہے گر جینا ہی کتنا ہے اب خیر جئے لیتے ہیں
لذت وصل کو پروانہ سے پوچھیں عشاق وہ مزہ کیا ہے جو ہر جان دئے لیتے ہیں

دوسرا شعر عاشقانہ رنگ میں لیجئے تو پھڑکا دینے والا اور عارفانہ اعتبار سے بھی گرا ہوا نہیں، مضمون کتنا سچا کہ بغیر درد کے ان کی یاد ہی نہیں ہو سکتی۔ اور اسے ادا کس بانکپن سے کیا ہے آخری شعر بھی اسی رنگ میں ہے، تیسرے اور چوتھے شعر میں شاعر پھر اپنے اصلی عالم میں چلا گیا ہے۔

نامانوس قافیہ لاکر کلام میں شعریت باقی رکھنا، بلکہ اس کے لطف و ذوق کو دوبالا کر دینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، ازل سے یہ دولت اکبر کے حصہ میں آچکی تھی، فرماتے ہیں، اور کس بے تکلفی کے ساتھ فرماتے ہیں۔

اس دور میں شاعر کے لئے قوت نہیں ہے
اس باغ میں طوطی کے لئے قوت نہیں ہے
بخیہ میں جدائی کو تو موجود ہی پایا
سائنس سے سنتے تھے کہیں بھوت نہیں ہے
لفظوں ہی کے چکر میں ہیں اب فاعل و افعل
چرخا ہی ملا جاتا ہے اور سوت نہیں ہے
زنجیر ہی کا سلسلہ ہے بہت معتبر اکبر
تم دیکھتے ہو جل میں کہیں چھوت نہیں ہے

اکبر کا مقام معرفت و حقائق کا "لاہوت" ہے، لیکن جب قافیہ پیمائی کے "ناسوت" میں اترتے ہیں تو دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتے ہیں، اور اب مزید تو صیف سے "سکوت" ہی اولیٰ۔

خالص عاشقانہ رنگ کے شیدائی، اپنے ذوق کی تسکین کا کچھ نہ کچھ سامان ان

غزلوں میں پائیں گے ۔۵

عشق کہتا ہے بیان حال کی پروا نہ کر
تیرے دل کی خود بخود ان کو خبر ہو جائے گی
میں شب فرقت میں تڑپوں اور وہ سوئیں چین سے
کس طرح مانوں محبت بے اثر ہو جائے گی

---

تجھے اے امید فردا، دل و جاں سے پیار کرتے ہیں
مگر اپنی زندگی کا نہیں، اعتبار کرتے
ہے بتوں کی خود نمائی مری غفلتوں سے قائم
میں اگر نظر نہ کرتا تو وہ کیوں سنگار کرتے
ترے ہاتھوں کی یہ زینت تر ہو شاخ گل سے افزوں
ہمیں دسترس جو ہوتا تو گلے کا ہار کرتے

---

صبر رہ جاتا ہے اور عشق کی چل جاتی ہے
ضبط کرتا ہوں، مگر آہ نکل جاتی ہے
کچھ نتیجہ نہ سہی عشق کی امیدوں کا
دل تو بڑھتا ہے، طبیعت تو بہل جاتی ہے
شمع کے بزم میں جلنے کا جو کچھ ہو انجام
مگر اس عزم سے سانچہ میں تو ڈھل جاتی ہے
کتمان راز عشق مرے آب و گل میں ہے
خاموش ہے زبان، جو کچھ ہے وہ دل میں ہے

افعی و زلف مس کا تو سودا برا نہیں
پیچیدگی جو کچھ ہے فقط اس کے بل میں ہے

"بل" دفتر حساب کا تعلق "سودے" سے تو خاص انگریزی دکانداری کا ضلع ہے۔ لکھنؤ کا ذوق قدیم اس کی زیادہ قدر نہ کر سکے گا۔ البتہ یہ "افعی" "وزلف" دونوں کے ساتھ "پیچیدگی" خوب! عجب نہیں جو اہل لکھنؤ اس شاعری پر لوٹ پوٹ ہو جائیں، اکبر کے سارے قصور اس ایک شعر کے خاطر معاف کردیں رادیں، دفتر کے دفتر سیاہ کردیں نقطہ نقطہ کی تشریح "مو بمو" کرنے لگیں، بلکہ بال کی کھال نکالنے لگیں اور "مسلسل" بیان رہے نہ "مبہم" نہ ہونے پائے۔

کہیں کہیں شعر اس رنگ کے بھی نظر آگئے ہیں، جو استاد امانت کی روح کو وجد میں لے آئے، مثلاً ؎

اس سرو قد پہ اکبر مدت سے مر رہا ہوں
ان شاء اللہ راست لانے کی کوشش تو کر رہا ہوں

گو تصنع سے زیادہ بے ساختگی یہاں بھی موجود ہے بہ حیثیت مجموعی لفظی گورکھ دھندے کی مثالیں شاذ ہی ملیں گی۔ عموماً کہتے وہی ہیں، جو دل میں محسوس کر چکے ہوتے ہیں ان کی شاعری اکھاڑہ کا کرتب نہیں، واردات قلب کا عکس ہے۔ اپنے پر جو گزرتی ہے، وہی دوسروں کو بھی سنا جاتے ہیں۔ خود بھی اپنے اس ہنر سے واقف ہیں، اور اعتراف کرتے ہیں کہ بجز اس کے اور میرے کلام میں ہے کیا؟ ؎

شعر اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گذری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

اپنے میں اور رسمی شاعروں میں جو فرق پایا، اسے بھی صاف صاف بیان کردیا ہے۔

میں اپنے آپ میں، ان شاعروں میں فرق پاتا ہوں
سخن ان سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں

اتنا نمونہ حضرت اکبر کے آخری دور تغزل کا کافی ہوگا، ضمناً ابتدائی اور وسطی دور کے کلام سے بھی تعارف ہوگیا۔ یہ صحیح ہے، کہ اکبر کی عظمت کی بنیاد ان کے عاشقانہ کلام پر نہیں، حکیمانہ، عارفانہ، ظریفانہ اصناف سخن پر ہے، لیکن اس کے باوجود خاص تغزل میں بھی ان کا مرتبہ اردو شاعروں میں کچھ ایسا نہیں، کہ جوان کے لئے باعث ننگ و عار اور ان کے شیدائیوں کے لئے باعث شرم ہو، روزمرہ کی شیرینی اور زبان کی صفائی میں ان کی متعدد غزلوں پر داغ کے کلام کا دھوکا ہو جاتا ہے، اور معنوی بلند پروازیوں میں وہ اگر غالب کے ہم سطح نہیں، تو بھی مومن اور شیفتہ کے طبقہ میں تو انہیں ہر حال جگہ مل سکتی ہے رنگ تغزل کی مثالیں کلام کے ابتدائی اور درمیانی دور میں کثرت سے ملیں گی، آخری دور میں کمتر۔

## (د) اخلاق و معاشرت

اکبر کے صحیفہ کمال کا روشن ترین عنوان اخلاق و معاشرت ہے انکی شاعری کی روح، ان کی اخلاقی و معاشرتی تعلیمات ہیں۔ ابتدائی دور میں تغزل کی شوخیاں غالب تھیں آخری دور میں تصوف کے خرقہ پوش ہو گئے تھے۔ لیکن دو چیزیں ایسی تھیں، جنھوں نے اول سے آخر تک کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا ہر دور میں رفاقت قائم رکھی۔ ایک زبان کی لطافت اور انداز بیان کی ظرافت۔ دوسرے معنی موضوع کلام کے حدود کے اندر، بھلائی کی پکار اور خیر کی طرف دعوت۔

ان کی شاعری کے عروج و شہرت کا زمانہ بیسویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی ہے لیکن ان کی اصلاحی شاعری کی بنیاد انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں پڑ چکی تھی

اور بیسویں صدی کے شروع ہی سے وہ خاصے مشہور ہو چکے تھے، ہندوستان خصوصاً مسلم ہندوستان میں۔ عین یہی زمانہ، مغربی تمدن، مغربی معاشرت، مغربی علوم غرض مغربیت کے ہر شعبہ کے انتہائی عروج، مقبولیت و فروغ کا ہے، اکبر جب دنیا میں روشناس ہوئے ہیں، تو اس وقت کی صورت حال کا نقشہ ذرا تصور میں لے آئیے۔

ہنگامہ ۱۸۵۷ء کو فرو ہوئے، ابھی چند ہی سال ہوئے ہیں اور ہندوستان پوری طرح مزہ چکھ چکا ہے کہ زبردست کے مقابلہ میں کمزور کے سر اٹھانے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے ملت اسلامی خصوصیت کے ساتھ اپنی غفلتوں اور عیش پرستیوں کے نتائج بھگت رہی ہے صدیوں تک جس ملک میں حکومت کی، کروفر کے ساتھ، شان و شوکت کے ساتھ کبھی ترکوں اور کبھی پٹھانوں کا جھنڈا اڑا کر۔ اور آخری تین چار سو سال مغلوں کے نام سے۔ اس ملک میں مسلمان، اب سب سے زیادہ حقیر و ذلیل تھے، ہر سمت سے پٹے ہوئے، چاروں طرف سے مار کھائے ہوئے۔

اسلامی اخلاق، اسلامی آداب، اسلامی شعائر مدت ہوئی رخصت ہو چکے، وہ اگر زندہ ہوتے تو مغلوبیت کی یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ ثروت و خوشحالی اول تو باقی ہی کہاں تھی جائیدادیں بار قرض سے دبی ہوئی اور زیور، مہاجنوں ساہوکاروں کے یہاں رہن اور پھر جو کچھ روپیہ پیسہ رہا بھی وہ ناچ رنگ کھیل تماشے، ٹیم ٹام کی نذر۔ نہ اعلیٰ تعلیم و تربیت۔ نہ کوئی ملی اتحاد و تنظیم، نہ ہمت و خودداری، نہ جوش توحید و ولولۂ دینی نہ قناعت و ایثار۔ عقیدے مشرکانہ، اخلاق جاہلانہ معاشرت مسرفانہ آپس میں حسد بغض، ایک کی تاک میں ایک لگا ہوا۔ مجیت اور ہندیت کے حملے تو سینکڑوں سال سے جاری تھے، اب آخری زبردست ٹکر، فرنگیت سے ہوئی، اور اس نے کہنا چاہئے کہ پرانے سفینۂ عرب کو پاش پاش ہی کر دیا۔ ادھر مغرب کی اس زیرک و زمانہ شناس اور اقبالمندی کے لحاظ سے پر شباب قوم انگریز نے تیر و تبر، توپ و تفنگ سے کہیں زیادہ

بے پناہ حربہ تعلیم اور پروپگنڈا کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اور اپنے ایجنٹوں، گماشتوں کارندوں کو اسکول اور کالج کے قالب میں بنا کھڑا کیا! نتیجہ یہ ہوا کہ ہر دل پر عظمت فرنگ کا نقش۔ ہر زبان پر اقبال سرکار کا کلمہ! داد خواہی کے لئے گھر سے نکلئے تو قانون انگریزی عدالتیں انگریزی۔ لڑکوں کو پڑھنے بٹھائیے تو اسکول انگریزی کالج انگریزی، کتابیں انگریزی زبان انگریزی۔ سفر کے لئے باہر نکلئے تو سڑکیں انگریزی سواری (ریل) انگریزی ٹکٹ انگریزی، سفر کی منزلیں (اسٹیشن) انگریزی دکھ درد میں مبتلا ہو جیئے، تو علاج کے لئے دوائیں انگریزی، تشخیص انگریزی، شفاخانے انگریزی، مرہم پٹی انگریزی۔ خط بھیجئے، رسل منگائیے تو ڈاک انگریزی، ڈاک خانہ انگریزی۔ روپیہ جمع کرنے، بہی کھاتا کھولنے کا شوق ہوا۔ تو بینک انگریزی سیونگ۔ بینکس انگریزی، شترکہ سرمایہ کی کمپنیاں انگریزی قصہ کہانی کے لئے جی لہرائے تو افسانے انگریزی۔ ناول اور ڈرامے انگریزی ورزشی کھیلوں کے لئے دل للچائے تو کھیل انگریزی، فٹ بال اور کرکٹ اور ٹینس اور رانٹا[۱] شام کو سیر و تفریح کے لئے قدم اٹھائیے تو سامان تفریح انگریزی، پارک میں، لان میں کلب میں، ہوٹل اور رسٹوران میں۔ رات کو رنگ رلیاں منانے کو جی چاہے تو تماشے انگریزی، تھیٹر، کنسرٹ، آپیرا[۲]۔ ماضی کو جاننا چاہئے تو تاریخیں انگریزی۔ حال سے باخبر

---

[۱] ایک بہت پرانا انگریزی کھیل، اب مدت ہوئی متروک ہوگیا ہے شروع انگریزی راج میں اس کا بڑا رواج تھا، جن شہروں میں شروع شروع انگریزی چھاؤنیاں قائم ہوئی تھیں، وہاں انٹا گھر کے نام سے عمارتیں اب بھی موجود ہیں میاں منیر شکوہ آبادی ایک پرانے اردو شاعر ہوئے ہیں صاحب دیوان۔ وہ بھی ایک جگہ اسے باندھ گئے ہیں،

جیت جاتے ایک مہینہ بھر کے بوسہ بات میں ہم جو انٹا اس قمر سے فیس دے کے کھیلتے

[۲] پکچر ہاؤس

رہنا چاہئے تو اخبارات انگریزی، تاربرقیاں انگریزی پیشے انگریزی، بیرسٹری وکالت ڈاکٹری انجینیری۔ عہدے انگریزی، علوم انگریزی، فنون انگریزی۔ مختصر انگریزی خلاصہ یہ کہ زمین انگریزی، آسمان انگریزی۔

اپنی یہ پستی اور "صاحب" کی یہ بلند پروازی، اپنی خاک نشینی، اور صاحب کی فلک پیمائی دیکھ، حواس بجا کس کے رہ سکتے تھے، خصوصاً جبکہ دل کا سرمایہ پہلے ہی لٹ چکا ہو۔ حواس گم، نگاہیں خیرہ، عقل دنگ، مرعوبیت غالب، دماغ مفلوج، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی نظر آیا، اندھیرے میں اپنے ہی سایہ پر بھوت کا گمان گذرا التباس حواس میں دیو میں پری کا حسن و جمال معلوم ہوا، دیر میں حرم کا تقدس دکھائی دینے لگا اچھے اچھے ہوشمند اور مخلص سید احمد خاں اور ان کے سارے رفیق یک زبان ہو کر پکار اٹھے کہ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" بھائیو بجز مذہب کے ہر چیز میں انگریز بن جاؤ، فلاح اور زندگی کا سہارا بس اسی میں ہے ـــــ حالی بڑے خشوع و خضوع سے مسدس اسلام کھول کر بیٹھے لیکن مناجات کا خلاصہ بس یہی کہ اے پاک پروردگار ہم کو اگر قدیم مسلمانوں کا سا نہیں تو آج کے انگریزوں سا بنا دے شبلی نے بڑے ٹھاٹھ سے ناموران اسلام کا دربار سجایا۔ لیکن لب لباب اس کا بھی یہی، کہ ہمارے اکابر سلف دانا یان فرنگ سے کتنا قریب تھے، اور نذیر احمد ذکاء اللہ، محسن الملک، چراغ علی بچاروں کا تو ذکر ہی نہیں، اور بات علیگڈھ تک محدود نہ تھی۔ فرنگی محل ہو یا ندوہ، سب ہی خیر سرکار کی مناتے تھے۔

اب قوم تھی اور اس کے سر پر باد و رئے فرنگ! ہر طرف سحر سامری کا دور دورہ ہر سمت سے دجالی تہذیب کا حملہ۔ معیار کمال یہ ٹھہرا کہ انگریزی بول چال میں کسی طرح لب و لہجہ "صاحب" کا سا ہو جائے۔ یہاں تک کہ اس کی خاطر قصداً اپنی زبان بگاڑ کر بولی جائے، اپنی زبان، اپنے علوم، اپنے ہاں کے کھانے پینے اپنے طرز کے پہننے اور

رہنے اپنی ساری معاشرت، اپنے خاندان، اپنی برادری، یہاں تک کہ اپنے ماں باپ سے بھی شرم آنے لگے۔ اپنے ہاں کی ایک ایک چیز میں ذلت وحقارت نظر آنے لگے معزز صرف "صاحب" اور "میم صاحب" ٹھہر جائیں۔ اپنے ہاں کی شرم وحیا، حجاب ونقاب اس لئے قابل نفرت کہ میم صاحب کھلے بندوں سب کچھ دکھلتی دکھاتی پھرتی ہیں، جن وملائک کا شمار اس لئے اوہام میں داخل کہ مل اور اسپنسر ان کے قائل نہیں عرش کا وجود اس لئے باطل کہ جغرافیہ کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں آتا۔ وحی، نبوت توحید کے بنیادی مسائل اس لئے فرسودہ ومتروک کہ مشرکانہ مسیحیت ان پر دلائل عقلی قائم کرنے سے قاصر رہی، داڑھی منڈانا اس لئے واجب کہ صاحب جو روزانہ شیو کرتے ہیں، سود جیسی حرام کمائی اس لئے جائز کہ صاحب کے دیس میں شہر شہر سودی بینک گھر کھلے ہوئے ہیں "سرا" ذلیل ہوٹل معزز مختار کارندہ حقیر، ایجنٹ، قابل عزت "حکیم" غریب کس مپرسی میں پڑے ہوئے "ڈاکٹر" ہاتھوں ہاتھ لئے جا رہے ہیں،

غرض فرش سے لے کر عرش تک علم وعمل، معاشرت، اخلاق، عقائد کے دائرہ میں کوئی شے ایسی نہ تھی جو "صاحب" کے نام کا کلمہ نہ پڑھ رہی ہو، ساری فضا اسی مرعوبیت سے معمور "دانش فرنگ" "حکمت مغرب" "عقلائے فرنگ" "اقبال سرکار" "دانایان مغرب" وغیرہ خدا جانے کتنے فقرے اور ترکیبیں اس دور مرعوبیت کی یادگار "مسلم وبدیہی علوم متعارفہ کی طرح بے تکلف زبانوں پر چڑھ گئے، اور اردو ادب کا گویا جزو بن گئے" فرنگی "کا لفظ اس سے قبل ذم وہجو کا پہلو لئے ہوئے تھا اس دور میں "فرنگ" محل مدح وعظمت میں استعمال ہونے لگا۔ دنیا کی تاریخ میں یہ واقعہ انوکھا نہیں، زبردست جب کمزوروں پر غلبہ پا جاتے ہیں، تو بس یہی ہونے لگتا ہے، ہر چیز حاکموں کی عینک سے محکوم خود بھی دیکھنے لگتے ہیں، اور اب نہ اپنی عقل باقی رہ جاتی

ہے، نہ اپنی نظر۔ اور تاریخ کا بیان ہے کہ قوموں کی قسمت میں یہ دستور ازل سے لکھا چلا آرہا ہے ؎

وفا جفا کی طلبگار ہوتی آئی ہے  ازل سے یوں ہی مرے یار ہوتی آئی ہے

تو یہ تھی وہ فضا جس میں اکبر نے اپنی آنکھیں کھولیں، یہ تھا وہ ماحول جس میں انہیں اپنا پیام پہنچانا تھا۔ رسمی شاعر نہ تھے، ہوتے تو کوئی ایسی بات نہ تھی جس طرح اور ان کے ہمعصر اچھے اچھے خوش فکر شاعر، زینت مشاعرہ بنے ہوئے تھے، یہ بھی آراستہ پیراستہ طرحی غزلیں کہتے رہتے۔ باہے طرح بھی قافیہ پیمائی میں لگے رہتے۔ لیکن مشکل یہ تھی، کہ صاحب نظر تھے، ایک خاص دل و دماغ رکھتے تھے، ایک خاص مقصد حیات لے کر آئے تھے، ایک مخصوص پیام کی، تبلیغ کا بار ان کے شانہ پر تھا، یوں کہئے کہ فطرت کی جانب سے ایک "رسول" ہو کر آئے تھے، صاحب کتاب حقیقی رسولوں کے جانشین ادنیٰ خادم۔ دل کڑھا، دماغ متاثر ہوا، آنکھوں نے بہت کچھ دیکھ لیا، جو دوسروں کی نظر سے اوجھل تھا، ان کا پیام اسی تحریک مغربیت کے خلاف ردعمل تھا، ان کی شاعری اول سے آخر تک، اس مادیت و فرنگیت کا جواب ہے، ان کے ترکش کا ایک ایک تیر اسی نشانہ پر آکر لگتا ہے، ان کے فلسفہ ان کی ظرافت، ان کی سیاست کے دائرہ کی معمولی سی بھی پیمائش ممکن نہیں، تاوقتیکہ نظر اس مرکزی نقطہ پر نہ جمالی جائے۔

یہ رنگ موجود شروع ہی سے تھا، سن و تجربے میں پختگی کے ساتھ نکھر تا گیا یہانتک کہ آخر میں ہر ساز سے یہی نغمہ پیدا ہونے لگا، عورتوں کی بے پردگی سے متعلق ان کا مشہور وضرب المثل قطعہ ان کے آخر زمانہ کا نہیں، شروع ہی کا ہے، اور کلیات سوم میں نہیں "کلیات اول" میں درج ہے،

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں  اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جوان سے آپکا پردہ وہ کیا ہوا کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑگیا
"عقل پر پردہ پڑجانا" اس محاورہ کا تصرف اس خوبی سے، اس سے قبل کبھی کیوں ہوا ہوگا!

قوم کی انتشاری و اضطرابی حالت خود اپنی ہی شامت اعمال کا نتیجہ ہے اسکا نقشہ بھی، ان کے قلم کا کھینچا ہوا بہت مدت کا ہے ؎

مذہب کو لیا تو بحث میں سر ٹوٹا چاہی اصلاح تو خدا ہی چھوٹا
شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبرؔ اپنوں ہی نے ہم کو ہر طرح سے لوٹا

کلیات سوم میں اصلاح معاشرت ہے، تزکیۂ اخلاق ہے، شعائر اسلامی کا احیاء ہے تہذیب اسلامی کی تجدید ہے اور یہ وعظ سطر سطر میں موجود ہے لیکن ہاں حالی کی طرح اکبر خشک واعظ نہیں وہ پہلے شاعر ہیں، پھر کچھ اور پہلے ظریف ہیں، پھر مصلح۔ پہلے نقاش فطرت ہیں، پھر معلم اخلاق۔ ان کی مجلس میں شراب کے گلاس گردش میں رہتے ہیں، خوش رنگ، خوش مزہ تلخی کے پیالے تقسیم نہیں ہوتے[1] اور یہ اس رند پاکباز کی کرامت ہے کہ حلق سے اترتے ہی وہ "شراب خانہ خراب" نہیں رہ جاتی، شراب طہور ثابت ہوتی ہے لا فیہا غول ولا ہم عنہا ینزفون۔

اکبر سے قبل بنگال کا ایک نامور فرزند بنکم چندر چٹرجی بیچ مَتن سے کر پیدا ہوا تھا تہذیب جدید کے خطرات کا اس نے پوری طرح اندازہ کر لیا تھا، اور بنگالی زبان میں اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ سے اس سیلاب کے روکنے کی اپنے امکان بھر

---

[1] یہ تشبیہ بھی خود حضرت اکبر ہی کی سجھائی ہوئی ہے۔ کہیں فرما گئے ہیں (افسوس ہے کہ کلیات میں کہیں وہ قطعہ نہ ملا) کہ لوگ مجھ میں اور حالی میں فرق دریافت کرتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ کہاں وہ کہاں میں آخری مصرعہ کا آخری ٹکڑا ہے، "وہ تلخی ہیں میں شراب"

کوشش کی تھی، اردو میں بھی اس کا ایک آدھ ترجمہ درگیش نندنی وغیرہ کے نام سے آچکا ہے، بنکم نے اپنا حربہ نثر کی شمشیر عریاں کو رکھا تھا، اکبر نے اس کے بجائے نظم کے نشتر کو اختیار کیا، بنکم کی تلوار کا کاٹ سب نے دیکھا، اکبر کا نشتر عموماً زیر آستین رہا، جدید تہذیب و تمدن کا ایک بہت بڑا مظہر "آزادیٔ نسواں" ہے اس شاندار لفظ کے عقب میں حقیقت عریاں بے پردگی، بے حجابی و بے عصمتی کی ہے، اکبر کے ترکش کے اکثر تیروں کا ہدف یہی ہے،

اس تہذیب کا ایک نمایاں کرشمہ یہ ہے کہ جہاں بیوی سے شرم و حیا رخصت ہو چکی ہے، وہاں شوہر سے بھی حمیت وغیرت سلب ہو جاتی ہے، اکبر کے نگارخانے میں یہ مرقع ایک ممتاز مقام پر آویزاں ملے گا،

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا!

یورپ کی عدالتوں میں مقدمات طلاق جس افراط سے دائر ہوتے رہتے ہیں اور شہادتوں میں جیسے جیسے حیاسوز واقعات کا انکشاف ہوتا رہتا ہے، وہ وہاں کی زندگی کا جزو بن چکے ہیں اور "صاحب" کے قدموں کے طفیل ہندوستان بھی ان برکتوں سے مستفید ہو چکا ہے اب یہاں بھی ایسے واقعات الشاذ کالمعدوم کے حکم میں نہیں رہے ہیں۔ لیکن یہاں ابھی احساس حمیت وغیرت بہرحال کچھ نہ کچھ زندہ ہے اسلئے واقعہ ہو چکنے کے بعد حسرتیں بھی ہوتی رہتی ہیں، اور ندامتیں بھی۔ یہ کیفیت اکبر کی زبان سے سنئے ؎

کیا گزری جو اک پردہ کے عدو، رو رو کے پولس سے کہتے تھے
عزت بھی گئی، دولت بھی گئی، بیوی بھی گئی، زیور بھی گیا،

اس غزل کے چند اور شعر بھی ہیں، درد و عبرت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے،

بے محل نہ ہوگا۔ اگر انہیں بھی اس سلسلہ میں سن لیا جائے ؂

اکبر نہ تھا بت خانہ میں زحمت بھی ہوئی اور رزر بھی گیا
کچھ نام خدا سے انس بھی تھا، کچھ ظلم بتاں سے ڈر بھی گیا

پروانہ کا حال اس محفل میں ہے قابل رشک اے اہل نظر
اک شب ہی میں یہ پیدا بھی ہوا، عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

کعبہ سے جو بت نکلے بھی تو کیا کعبہ ہی گیا جب دل سے نکل
افسوس کہ بت بھی ہم سے چھٹے اور چھوٹ خدا کا گھر بھی گیا

جو گونج رہا تھا خوشیوں سے اس قصر پہ کل یہ رویا بہت
کوئی متنفس تھا، نہ وہاں اندر بھی سہرا باہر بھی گیا

آخری شعر میں، شاعر جگ بیتی سے زیادہ آپ بیتی بیان کر رہا ہے، اکبر دنیوی حیثیت سے بھی ایک خاصے بڑے آدمی تھے، وطن (الہ آباد) میں عشرت منزل کے نام سے کوٹھی بنوائی (اپنے صاحبزادہ کے نام پر) ایک زمانہ میں واقعی عشرت منزل ہی تھی، دعوتیں جلسے ابیسیمیں، شعر و سخن، چہل پہل، فرنیچر اور سامان آرائش وغیرہ۔ آخر زمانہ میں حالت اس کے ٹھیک برعکس۔ پہلے محبوب بیوی نے داغ مفارقت دیا، پھر نوجوان محبوب بیٹا رخصت ہوا، جج صاحب کی پنشن ہوئی، آنکھیں خراب ہوئیں، صحت نے جواب دیا، صاحبزادے پردیس میں ملازم۔ مکان سنسان، پائیں باغ ویران، سامان آرائش وغیرہ غائب: ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہو حق کا عالم، ایک حضرت اکبر خود، ایک مرد ملازم، ایک بوڑھی ماما، بس کل اتنی آبادی۔

خیر، یہ ایک جملہ معترضہ آ گیا تھا، اب پھر پہلے شعر کیا گزری جوانی کو دہرا کر آگے چلیے۔

ایک جگہ بے پردگی اور تعلیم نسواں کو لازم و ملزوم بتاتے ہیں، اور دو مختلف مفہوموں

(پردہ اٹھنے اور تعظیم کے لئے اٹھنے) کے لئے لفظ "اٹھنے" کے اشتراک سے فائدہ اٹھا کر کیا خوب شاعرانہ استدلال سے کام لیتے ہیں ؎

مجلس نسواں میں دیکھو عزت تعلیم کو
پردہ اٹھا چاہتا ہے، علم کی تعظیم کو

تخیل ہے تو شاعرانہ، لیکن اس واقعیت کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے کہ پردہ شکنی کی حمایت میں ہے بھی تو بڑی دلیل یہی، کہ پردہ کی چار دیواری کے اندر رہ کر علم کی تازہ ہوا نصیب ہونا ممکن کہاں ؟ اور علم و تعلیم کے جو معنی اس گروہ کے ذہن میں ہیں ان کے لحاظ سے یہ قول ہے بھی بالکل بجا۔

ہمارے ہاں بہترین عورت کا تخیل یہ تھا کہ شروع سے دبی لچی رہے خانہ داری کے طور طریقے سیکھے، کہ آگے چل کر اسے گھر کی ملکہ بننا ہے، بچپن میں والدین کی اطاعت اور شادی کے بعد شوہر کی رضامندی کو پروانہ جنت خیال کرے، خانگی شیرازہ اسکی ذات سے بندھا ہوا رہے، خاندان کی مسرتیں اس کے دم سے قائم رہیں، صحیح معنی میں "اہل خانہ" ثابت ہو اولاد کو تربیت کے بہترین راستہ پر ڈال سکے، شوہر کی عزت و محبت، بڑوں کی تعظیم و خدمتگذاری اور چھوٹوں کی الفت و شفقت کے جذبات لے کر دنیا میں آنکھ کھولے اور انہیں جذبات کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو، فرنگیوں کے یہاں عورت کی عزت کا معیار ہی کچھ دوسرا ہے، انکے نزدیک عورت کا یہ مشرقی تخیل عورت کے لئے باعث توہین ہے، موجب تحقیر ہے ان کی فرہنگ میں ادب و تعظیم، اطاعت و خدمت گذاری مرادف ہیں محکومی کے، غلامی کے، انکا قول ہے کہ عورت اپنے کو چھپانے کے لئے نہیں، دکھانے کے لئے آئی ہے، اس کا کام یہ نہیں ہے کہ جب دیکھئے گھر ہی کے اندر، شوہر کے، یا ساس نند کے پہلو سے لگی بیٹھی ہے، وہ عورت ہی کیا جس کے حسن گفتار حسن رفتار، حسن صورت، زیب و زینت، خوش لباسی

ٹلے بازی، رقاصی، کے چرچے سوسائٹی میں عام نہ ہوں؟ اخبارات میں اس کے فوٹو شائع ہوں، اسکا نام زبانوں پر لذت کے ساتھ آئے۔ اسکا جلوہ آنکھوں میں چمک پیدا کردے، اور اس کا تصور دلوں میں شرق۔ بہترین عورت وہ نہیں جو بہترین بیوی ہو یا بہترین ماں، بلکہ وہ ہے، جس کی ذات، دوست احباب کی خوش وقتیوں کا دلچسپ ترین ذریعہ ہو۔ اور ایسی ہو کہ اس کی رعنائی و دلربائی کے نقش ثبت ہوں، کلب کے درو دیوار پر، پارک کے سبزہ زار پر۔ ہوٹل کے کوچ اور صوفے پر "ہمارے" اور "ان" کے تخیل کے اس بعد المشرقین کو اقلیم لفظ ومعنی کا یہ تاجدار دو لفظوں میں جس جامعیت اور جس ندرت کے ساتھ بیان کرجاتا ہے یہ اسی کا حصہ تھا

حامدہ چمکی نہ تھی، انگلش سے جب بیگانہ تھی

اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

"چمکی" میں وہ بلاغت ہے کہ سننے والا لوٹ لوٹ جائے، یہ "چمک" مخصوص ہے "نئی روشنی" کی چمنیوں کے ساتھ۔ پرانے فانوسوں میں ڈیوٹ والے چراغوں میں چمک دمک بھلا کہاں! شرم وحیا سے آزادی، دنیا کی دل ستانی کے لئے نازوانداز قابلیت کے جوہر کی جلا، یہ سب کچھ اس ننھے سے لفظ "چمکی" سے ظاہر وآشکار۔ اور یہ "شمع انجمن" اور چراغ خانہ کی مثال کس قدر روشن کیسی ضیا بار۔ تشبیہ کی تشبیہ اور پھبتی کی پھبتی! شعر کیا ہے بیسویں صدی کی "کالج گرل" کی قد آدم تصویر۔

حسن دناز کی دنیا میں قابل داد اب تک کم سخنی، کم گوئی و بے زبانی تھی۔ مشرقی شوہر، چاندسی دلہن "بیاہ کر اسلئے لاتا تھا، کہ وہ اسے اپنے اندھیرے گھر کا چراغ بنائے۔ اور تخیل "خانہ آبادی کا غالب رہتا۔ اب جو جاکر دیکھتے ہیں تو محفل کے طور ہی کچھ اور ہیں نقشہ ہی بدلا ہوا۔ ٹھاٹھ بزم آرائی کے جمے ہوئے حجاب کی جگہ بے حجابی۔ سکوت کی جگہ طوفان تکلم۔ مستوری کی جگہ نمائش۔ عاشق بیچارہ، اس کایا پلٹ

بے رنگ حیران، گم صم۔ کل تک جو نقش تصویر تھا، وہ آج گراموفون نظر آرہا ہے۔

خامشی سے نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق      اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق

شانِ سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں      بت جو بیٹھے دیر میں تا توس ہوئے جاتے ہیں

چوتھا مصرعہ، اپنی لطافت کے، جامعیت کے لحاظ سے اپنا جواب بس آپ ہی ہے۔ تیسرا مصرعہ اس پہلو کی جانب رہنمائی کر رہا ہے۔ کہ جو کچھ ہوا ہے قدرتی نتیجہ ہے تغیر ماحول کا۔ جب فضاؤں میں آسائش کی جگہ آرائش نے لے لی، راحت پر لذت مقدم ہوگئی، شوہروں کا منتہائے نظر بجائے تسکینِ قلب کے ہیجانِ نفس قرار پا گیا، تو قدرتاً عورت نے بھی اپنی محبوبیت کے انداز بدل دیئے۔ مردوں کے دل میں جگہ پانے کے طریقے بھی اب دوسرے ہوگئے۔

اکبر کے اسی مرقع کا ایک اور منظر ؎

اعزاز بڑھ گیا ہے۔ آرام گھٹ گیا ہے      خدمت میں ہے وہ لیزی[1] اور ناچنے کو ریڈی[2]

تعلیم کی خرابی سے ہوگئی بالآخر      شوہر پرست بیوی، پبلک پسند لیڈی

"شوہر پرست بیوی" اور "پبلک پسند لیڈی" ان دو لفظوں کے کوزہ میں گویا مشرق و مغرب کا سمندر بھر دیا ہے! مشرق کا منتہائے نظر تو خدمت تھا۔ زہرِ خانہ تھا اور بار بار تھا مغرب کے ہاں معیار ناچ ہے، بال روم ہے، کنسرٹ ہے، اور اب عورت بھی کرے کیا، نظامِ تعلیم ہی اس ڈھنگ کا ہے۔ شروع سے سکھایا یہی جاتا، دل میں بٹھایا یہی جاتا ہے۔

آج یورپ و امریکہ کے بڑے بڑے ماہرین نفسیات (سائیکالوجی) و حیاتیات بشری (ہیومن بیالوجی) کہہ رہے ہیں، اور لکھ رہے ہیں کہ دونوں صنفوں کے درمیان کشش جنسی بالکل طبعی ہے۔ دونوں جب باہم ملیں گے۔ اور کوئی امر مانع موجود ہوگا

---

[1] سست کاہل (LAZY) [2] آمادہ، تیار، مستعد (READY)

نہیں، تو آگ کا دفعتاً بھڑک اٹھنا، اور بجلی کا اکبارگی رگڑ سے پیدا ہو جانا بالکل قدرتی ہے، شریعت اسلامی نے اس گہری اور بنیادی حقیقت کے پیش نظر بدکاری کے نفس عمل ہی کو حرام نہیں قرار دیا، بلکہ اس منزل تک پہنچنے کی جتنی راہیں ہیں، ان پر بھی پہرے بٹھا دیئے۔ گویا دشمن کی پوری ناک بندی کر دی۔ بانس ہی نہ ملے گا تو بانسری کہاں سے بجے گی۔ بیگانہ عورت و مرد کو تنہائی و اختلاط کے جب موقع ہی نہ ملیں گے، تو پینگ بڑھنے ہی کہاں سے پائیں گے۔ بالکل بچپن کو چھوڑ کر۔ باقی آگے بڑھ کر شرکت پڑھنا لکھنا، شرکت کھیل کود۔ بلا ضرورت یکجائی سب ناجائز۔ تاک جھانک تک حرام، تاکہ سوسائٹی میں، مفاسد کا زہر سرے سے پھیلنے ہی نہ پائے معاشرت ہمیشہ بے داغ رہے۔ تعلیم جدید نے۔ تہذیب جدید نے ان میں سے ایک ایک بند کو توڑا، نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا تھا۔ آزادیاں بڑھیں، بے حیائیاں آئیں، بے حجابیاں دلیل ترقی بنیں جو باتیں کل تک ان ہونی تھیں آج ہو کر، گذر کر رہیں، بھولے بھالے لوگوں نے کہا کہ محافظ عصمت یہ تعلیم ہوگی نہ! سبحان اللہ! زنگی کا نام اگر کافور رکھ دیا گیا تو گویا چہرہ کی سیاہی بھی دور ہو جائے گی! توقع لٹیروں سے بہرہ داروں کے کام کی کی جانے لگی! اب تو مثالیں کوئی کہاں تک گنا سکتا ہے۔ لیکن اکبر کے زمانہ میں بھی فرانس کی میڈیم ڈی اسٹیل[1] اور انگلستان کی جارج ایلیٹ[2] کی سی ہستیاں خال خال نہ تھیں۔

اکبر کے توسط سے ایک مختصر سا کالمہ، ایک صاحب اور صاحبہ کے درمیان سنئے ؎

---

[1] فرانس کی مشہور ادیبہ، اخلاق کے قانون سے آزاد۔

[2] انگلستان کی مشہور ناول نویس، مردانہ نام رکھنے والی خاتون جو ایک اہل قلم مرد، جارج ہنری لوئیس کے ساتھ مدتوں بے نکاحی بیوی کی طرح رہی۔

میں بھی گریجویٹ ہوں تو بھی گریجویٹ — علمی مباحثے ہوں ذرا پاس آ کے لیٹ
دونوں نے پاس کر لیے ہیں سخت امتحان — ممکن نہیں کہ اب ہو کوئی ہم سے بدگمان
بولی یہ سچ ہے، علم بڑھا، جہل گھٹ گیا — لیکن یہ کیا خبر ہے کہ شیطان بٹ گیا

یہ سب سچ، لیکن پھر بھی یہ کہیے اور سوچتے ہیں کہ حیا و حجاب کے قیود دا حکام تو مسلمان عورت کے لئے ہیں، جب دین ہی سرے سے غائب ہو گیا تو اب اس اخلاقی جکڑ بند سے آخر حاصل کیا؟ پردہ تو بقائے ناموس کیلئے ہے۔ جب ناموس ہی نہیں تو اس کی بقا کیسی! کھانا پینا زندہ جسم کی ضرورت کیلئے ہے۔ لیکن جب زندگی ہی رخصت ہو چکی تو مردہ کو کوئی نہیں کھلاتا پلاتا۔ صندوق میں قفل اس وقت تک پڑے رہتے ہیں، جب تک اس میں قیمتی مال محفوظ ہے لیکن جب وہ خالی ہو گیا تو اب اس کی حفاظت خود ایک دردسر ہے، پھولوں کی قدر جب ہی تک ہے جب تک وہ تازہ و شاداب ہیں، باسی سوکھے مرجھائے پھولوں کو گلے کا ہار بنانا کوئی کیوں پسند کرنے لگا۔ فرماتے ہیں ؎

نئی تہذیب کی عورت میں کہاں دین کی قید — بے حجابی جو ہوا اس میں تو قباحت کیا ہے
نور اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ! — شمع خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

جو تھے مصرعہ کی تشبیہ اکبر ہی کا حصہ تھا۔

خاتون مشرق کو مغربی میم بنا دینے کا اب تک نتیجہ کیا نکلا ہے! خود مردوں ہی نے شیکسپیر و ملٹن کی ورق گردانی اور مل و اسپنسر پر دماغ سوزی کر کے اب تک دنیا بلکہ ہندوستان ہی کی محدود دنیا میں کون سے خاص امتیازات حاصل کر لئے ؎

شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا رعب و وقار
کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید

خیر یہاں ذکر مردوں کا نہیں، عورتوں کی تعلیم کا ہے، مرد جس طرح پڑھ پڑھ کر بڑھ بڑھ کر

صاحبیت میں ضم ہوتے گئے، انہوں کے ہاتھ سے نکلتے گئے، اسی طرح عورتیں بھی بڑھ بڑھ کر میم صاحبیت میں گم ہوتی گئیں، ہاتھ سے نکلتی گئیں کلیات اول میں جوان کا قدیم ترین کلام ہے۔ اس حقیقت کو ظرافت کی کشتی میں لگا کر پیش کرتے ہیں۔

ترقی کی نئی ہیں ہم پر چڑھائیں — گھٹا کی دولت آ نہیں بڑھائیں
رہیا سر پھر کے آیا بی نصیبن! — وہ گو اسکول میں برسوں پڑھائیں

کلیات سوم میں اس مرقع میں آب ورنگ ذرا اور زیادہ بھر دیتے ہیں ؎

ایک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو ابھارا — ایک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا
کچھ جوڑ توان میں کے ہوئے بال پرتھا — باقی جو بچے، گھرانکا تھا افلاس کا مارا
"بیرا" وہ بنا کیمپ میں یہ بن گئیں "آیا" — بی بی نہ رہیں جب تو میاں بن بھی سدھارا
دونوں جو کبھی ملتے ہیں، گاتے ہیں یہ مصرع — آغاز سے بدتر ہے سرانجام ہمارا

خیال نہ گذرے کہ اکبر سرے سے تعلیم نسواں کے مخالف تھے، اور لڑکیوں کو بالکل ہی ناخواندہ رکھنے کے حامی وہ تعلیم نسواں کے حامی و ہمدرد یقیناً تھے، لیکن تعلیم تعلیم میں بھی تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ تائید میں اس تعلیم کے تھے جو قوم میں نمونے رابعہ بصریہ کے نہ سہی دور مغلیہ کی جہاں آرا بیگم کے پیدا کرے، نہ اس تعلیم کے جو زینت ہو ہر اپیرا ہاؤس کی، ہر پکچر پیلس کی۔ اس تعلیم کو وہ رحمت نہیں، خدائی قہر سمجھتے تھے، جس پر بنیادیں تعمیر ہوں، ہالی وڈ[1] کی، وہ آرزومند تھے اس نظام تعلیم کے، جو مہربان مائیں، وفا شعار بیویاں اور اطاعت شعار لڑکیاں پیدا کرے، نہ اس کے جو تھیٹر میں ایکٹری اور نیم برہنہ رقاصی کے کمالات کی جانب لے جائے۔ وہ ملک میں حوریں پیدا کرنا چاہتے

---

[1] امریکہ کا مشہور شہر فلمی دنیا کا کہنا چاہئے کہ دارالسلطنت، ہزارہا کی آبادی، روزانہ فلم سازی کی مختلف شاخوں، محکموں میں سرگرم رہتی ہے (باقی حاشیہ نمبر ۲ صفحہ ۱۰۶ پر ملاحظہ ہو)

تھے، کہ دنیا نمونہ جنت بن جائے۔ پریوں کے مشتاق نہ تھے کہ ملک کا ملک راجہ اندر کا اکھاڑہ ہو کر رہ جائے ان کا قول تھا سے

دو شوہر و اطفال کی خاطر اسے تعلیم     قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

مزید توضیح سنئے سے

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر     خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ذی علم متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم!     استاد ایسے ہوں مگر استا رجی نہ ہوں

"استارجی" آپ سمجھے، محاورۂ لکھنؤ میں ارباب نشاط کے "تعلیم" دینے والوں کو کہتے ہیں خود لفظ تعلیم بھی لکھنؤ کی زبان میں اسی خاص معنی میں مستعمل ہے۔ ایک طویل نظم میں اپنا پورا

---

[1] سنہ ۱۹۱۲ء کے آخر کا ذکر ہے کہ ایک برطانوی "مس صاحبہ، ماڈائین (MAUDAAIN) نامی مشہور "آرٹسٹ" ہندوستان تشریف لائیں۔ بڑی دھوم دھام کے ساتھ انگریزی اخبارات روزہی ان کے تذکروں اور کارناموں سے بھرے رہتے تھے، ان کا خاص آرٹ "ناچ" تھا، ایک مخصوص ناچ کے وقت جسم پر ہلکا باریک سا لباس، غالباً موتی کی لڑیوں کا رہتا تھا، تو برہنہ تو خیر شروع ہی سے رہتی تھیں، رقص جب شباب پر پہنچتا تو گردش اس تیزی سے کرتیں کہ گویا جسم میں کوئی کمانی لگی ہوئی ہے لباس کی لڑیاں ایک ایک کر کے ہوا میں اڑنے لگیں، یہاں تک کہ جسم پر ایک تار بھی سلامت باقی نہ رہ جاتا! یہ ضرور ہے کہ گردش رقص اس مسلسل تیزی کے ساتھ ہوتی کہ دیکھنے والے کی نظر کا جمنا ناممکن تھا اور یہی ان کے آرٹ کا کمال تھا حضرت اکبر نے اپنے ایک مکتوب میں مجھے تحریر فرمایا کہ "مس ماڈاین آئی ہوئی ہیں سنا ہے کہ برہنہ ہو کر اس طرح ناچتی ہیں کہ شائقین سانس کو وجد آجاتا ہے اور یہ ذکر دسمبر ۱۹۱۲ء کا ہے، اسوقت تک یہ کمالات بہرحال بعض پیشہ ور میواؤں ہی تک محدود تھے، مگر اب حدیث نبوی میں جو الکاسیات العاریات آیا ہے یعنی لباس مگر برہنہ اس کی صحیح تفسیر اس دور سے قبل کیونکر کسی کی سمجھ میں آسکتی تھی۔

مسلک وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے (صفحہ ۱۶۰ تا ۱۶۲) چند شعروں سے اندازہ کیجئے

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے — لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے
بیشک معاشرت میں سراسر فتور ہے — اور اس میں والدین کا بیشک قصور ہے
لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت — جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت
آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت — ہو وہ طریق جس میں ہو نیکی و مصلحت
ہر چند ہو علوم ضروری کی عالمہ — شوہر کی ہو مرید تو بچوں کی خادمہ
عصیاں سے محترز ہو، خدا سے ڈرا کرے — اور حسن عاقبت کی ہمیشہ دعا کرے

آگے حساب کتاب، نوشت و خواندہ، اصول حفظ صحت، کھانا پکانے، کپڑے سینے وغیرہ کو درس نسوانی کا لازمی نصاب بتاکر آخر میں فرماتے ہیں ؎

داتا نے دھن دیا ہے تو دل سے غنی رہو — پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی بنی رہو
مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے — مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے
دنیا میں لذتیں ہیں، نمائش ہے شان ہے — ان کی طلب میں، حرص میں سارا جہان ہے
اکبر سے یہ سنو کہ جو اس کا بیان ہے — دنیا کی زندگی فقط اک امتحان ہے
حد سے جو بڑھ گیا تو ہے اس کا عمل خراب — آج اس کا خوشنما ہے، مگر ہوگا کل خراب

عجب دقیانوسی خیال کے تھے، آخر تک "آج" اور "کل" کے چکر میں پڑے رہے "آج تو خیر آج ہی ہے۔ یہ "کل" آخر کیا بلا ہے! خواہ مخواہ ہر عیش کو منغص کر دینے والا فرماتے، یہ سب کچھ جانتے تھے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانے ہوئے، سمجھے ہوئے تھے، کہ رفتار زمانہ کا رخ پھیرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، انبیاء تک کو یہ قدرت نہیں مشیت تکوینی ہر صورت میں اپنا چکر، اپنا دورا ہو را کرکے رہتی ہے۔ [illegible] حمائج کی نصیحت کس نے سنی؟ یحییٰ و عیسیٰ پر کتنے ایمان لائے؟ یونس و لوط کی تصدیق کتنوں نے کی؟ دنیا سے ہر دور میں طعنے ہی سنا کئے، شاعر ہونے، مجنوں ہونے کے۔

آج کی اصطلاح میں VISIONARY یاں یا اور بات ہے کہ اس کے بعد ہی عذاب الٰہی کے زلزلہ نے یک بیک، دھڑ پکڑا ہو، اور مایۂ ناز نظام تہذیب وتمدن کی بنیادیں تک ہلا کر رکھ دی ہوں۔ زار روس کی جباریت وشہنشاہیت مطلقہ کا چشم زدن میں مٹ کر رہنا[1]، اس غیبی گرفت کی تازہ چشم دید مثال ہے۔ اور پھر اس سے بھی بڑھ چڑھ کر یورپ کی پہلی مہابھارت[2]، اور یہ دوسری مہابھارت[3] جو ان سطروں کی تحریر کے وقت تک ناتمام ہے۔

حضرت اکبر بھی اپنے مشن کی کامیابی سے مایوس تھے اور بارہا اس کا اظہار فرمایا ہے۔ کلیات دوم میں ایک قطعہ میں آزادئ نسواں کے مستقبل کا مرقع کھینچتے ہیں، حسب معمول دلکش انداز میں فرماتے ہیں کہ ضبط نفس، اور تقویٰ وایمان رکھنے والے تو گذر گئے، اب دور دورہ ہے "صاحب" کے قائم کئے ہوئے کالج کے نوجوانوں کا سے

اٹھ گئے وہ جنھیں مقدور رہا خودداری کا

نہ وہ تقویٰ نہ وہ تعلیم، نہ وہ دل کی امید

ولولہ لے کے نکلنے لگے کالج سے جواں

شرم مشرق کے عدو، شیوۂ مغرب کے شہید

کرکٹ فیلڈان کی مسجد، تھیٹران کی عیدگاہ۔ اس تمدن کے لازمی نتیجہ کے طور پر سے

بحث میں آہی گیا فلسفہ شرم وحجاب

دور گردوں کی کہاں تک کوئی کرتا تردید

عورتوں کو "حقوق" سیاسی حقوق مل گئے "مطالبات" منظور ہو گئے۔ کام وہ مردوں کے دوش بدوش کرنے لگیں ع

---

[1] ۱۹۱۷ء میں [2] ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء [3] ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء

زہرہ ممبر ہوئیں، دو ڈھ یتیں جناب خورشید

کچھ پرانے بڈھے ٹھڈے زندہ تھے، ڈرے ہوئے سہمے ہوئے بوئے کہ گل کھلانے کے لئے صاحبزادے کچھ کم تھے، جو اب صاحبزادیوں کو بھی اس میدان میں لایا جارہا ہے

شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا رعب وقار
کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید

روشن خیال دنیا کی لعنتوں، متمدن دنیا کی ملامتوں کی بجلیاں، ان دقیانوسیوں پر ٹوٹ ٹوٹ کر گریں ع

نعرے تحقیر کے اس پر ہوئے یاروں میں بلند

اور تو اور گھر گھرانوں کی کنواریاں، المومنات الغافلات نہیں، شوخ و بیباک کھیلی کھائی ہوئی ؂

لڑکیاں بول اٹھیں خود بہ طریقِ تائید

دولہا بھائی کی یہ ہے رائے نہایت عمدہ ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

اور شعر تو یہ ہوا ہے، بیت الغزل سارے قطعہ کی جان ؂

خود تو گٹ پٹ کے لئے جان دیئے دیتے ہو
ہم پہ تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

شیخ بیچارہ اس حملہ کی تاب کہاں سے لاتا، بھاگ کر حجرہ میں پناہ لی، کنڈی اندر سے چڑھالی ؂

اکبر افسردہ شد از گرمی ایں طرز سخن
شیخ بگریخت و در صومعہ خویش خزید

تجدد کی جے! تالیوں کی گونج میں پکاری گئی۔ اور آدم کے بیٹوں اور حوا کی بیٹیوں دونوں نے مل کر حصول آزادی کی مبارکباد گائی ؂

کھل گیا در، نہ رہا شاہد مشرق کو حجاب
غل مچا ہر سے کا، بول اٹھے یہ مغرب کے مرید
للہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید

ایک پرانی غزل میں بھی مضمون اس آزادی نسواں کا آگیا ہے ؎

بٹھائی جائیں گی پردے میں بیبیاں کب تک
بنے رہوگے تم اس ملک میں میاں کب تک
جو منھ دکھائی کی ہے رسم پر مصر ابلیس
تو منھ چھپائیں گی حوا کی بیٹیاں کب تک

مقطع میں انجام کی پیشین گوئی ہے ؎

سنا ہے حضرت اکبر ہیں حامی پردہ
مگر وہ کب تک اور ان کی رباعیاں کب تک

اسلامی نظام تہذیب کے جوہر لطیف یہی عصمت وعفت، شرم وحیا کے جذبات ہیں۔ اور فرنگیت کی زد سب سے پہلے اخلاق کے انہیں ستونوں پر پڑتی ہے، اس لئے قدرتاً اکبر نے بھی طبع آزمائی اس موضوع پر بہت زائد کی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی مغربیت وفرنگیت کے جو نمایاں مظاہر ہیں، انھوں نے تقریباً ان سبھی پر کم وبیش توجہ کی ہے۔ عبرت پذیری ان کے قلب کا، اور عبرت آموزی ان کے قلم کا جوہر ہے، اس ایک قوت کے سہارے ہر تختۂ زمین میں نئے نئے شگوفے کھلے ہیں، اور ہر ریگستان کو لالہ زار بناتے چلے گئے ہیں۔

کمیٹی بازی اور جلسہ بازی کے مشغلوں میں ٹرگرویوں کی طلب اور روح کے تعلق کے ضعف کا عکس ذرا اکبر کے جام جم میں ملاحظہ ہو ؎

جن پہ ہر گام پر اک دام بلا ہے در پیش
نفس کو تو انہیں باتوں میں مزا آتا ہے
اس کمیٹی میں نہیں روح کی لذت کا خیال
ممبر اٹھ جاتے ہیں جب ذکر خدا آتا ہے

خالص دوستی اور بے غرض محبت کے لفظ سیاسیات حال کے لغت میں بے معنی ہیں، ہندو اگر اتحاد کا ہاتھ مسلمانوں کی طرف بڑھا رہا ہے تو صرف اس لئے کہ دونوں مل کر انگریز سے مقابلہ کریں، انگلستان اگر روس سے لگا وٹ کر رہا ہے۔ تو محض اس غرض سے کہ جرمنی سے لڑنے کے لئے ایک زبردست حلیف ہاتھ آجائے۔ خود مطلبی کا نام مہذبوں کی اصطلاح میں ڈپلومیسی ہے، دل سے نہ یہ ان کا شریک، نہ وہ انکا دلوں میں زہر کے انگارے بھرے ہوئے، لبوں پر میٹھے بول، اسلام کے شاعر کو عبرت کا یہ منظر دیکھ، اپنے ہاں کا بھولا اور بھلا یا ہوا سبق الحب اللّٰہ والبغض للّٰہ کا یاد آجاتا ہے۔ اور اس کے منہ سے یہ نالۂ موزوں نکلتا ہے سے

اب تو یاری کا اسی پر رہ گیا ہے انحصار  جس کا تو حاسد ہے اس کا جو ہو حاسد تیرا یار
واسطے اللہ کے جو دوستی اب وہ کہاں

جنگ جب تک تھی بتوں سے نام تھا اللہ کا  اب تو ہر اک ہے مجاور راک صدا درگاہ کا
واسطے اللہ کے جو دوستی اب وہ کہاں

ہاں تجارت اور پالٹکس میں دکھیں جو سود  چند روزہ متفق ہوں، ورنہ یہ شیخ و ہنود
واسطے اللہ کے جو دوستی اب وہ کہاں

۱۹۱۱ء کا ذکر ہے کہ ہندوستان کے اخباری میدان میں بحث طریقت و شریعت کے درمیان چھڑ گئی۔ شریعت کا جھنڈا لاہور میں دفتر زمیندار[1] سے بلند ہوا۔ طریقت والوں نے دہلی کی ایک خانقاہ[2] میں پناہ لے، یہیں سے ضربیں لگانا شروع کیں۔ اور جب دیکھا کہ حریف کی گولہ باری بے پناہ ہے، تو جھٹ حکومت سے فریاد نقض امن عامہ کے نام پر کر دی۔ اکبر نے عین اس وقت جبکہ اشتعال جذبات کا شباب

[1] لاہور کا مشہور روزنامہ ایڈیٹر ظفر علی خاں
[2] رین بسیرا۔ خواجہ حسن نظامی

تھا مصلحت شناسی و مصالحت جوئی کے چھینٹے ڈالنے شروع کئے۔ آگ اپنے وقت پر بہرحال بجھتی ہی، (اور مدت ہوئی کہ اب اس کی خاکستر بھی باقی نہیں) البتہ اکبر کے چشمۂ اصلاح کے وہ قطرے یادگار رہ گئے۔ وہ کبھی انشاء اللہ خشک نہ ہوں گے، پوری نظم ذرا طویل ہے، اقتباس ملاحظہ ہو ؎

اس وقت مولویت صوفیت سے بھڑگئی ہے
اغیار کو ہو مژدہ، آپس میں چھڑگئی ہے
ملا کو زعم ہے یہ دائم چراغ کریم!!!
صوفی کو یہ کہ دارم پائے چراغ بوئم
ملا یہ کہہ رہے ہیں میرا رسالہ دیکھو
صوفی کا ہے اشارہ، میرا پیالہ دیکھو
ملا یہ کہہ رہے ہیں قرآن ہی سے پڑھئے
صوفی یہ کہہ رہے ہیں معنے سمجھ کے پڑھئے
کہتے ہو کر رہے ہیں ہم یہ رفارمیشن
دیکھا نہیں تھا لیکن مردوں پہ آپریشن
اس وقت کیا تمھاری یہ خوش خیالیاں ہیں
آپس میں گالیاں ہیں، غیروں کی تالیاں ہیں
شیعہ ہوں خواہ سنی، ملا ہوں خواہ صوفی!
بے سود جنگ باہم ہے سخت بے وقوفی!
دیکھو ذرا تنزل تو خود ہی زور پر ہے
موقوف کب یہ حالت آپس کے شور پر ہے
وقت نزاع باہم ہرگز نہیں ہے یارو اللہ کو پکارو، اللہ کو پکارو!

تو

سب سے گہرا دام لفظ "ترقی" میں ہے۔ مغرب کا ہر عیب آج ہماری نظر میں ہنر ہے، اس کی ہر بدروئی ہماری آنکھ میں حسن ہے، اگر ہم عیب کو عیب سمجھ لیں، جب بھی کوئی صورت اس سے بچنے کی بھر بھی نکالیں یا سوچیں۔ لیکن مصیبت تو یہی ہے کہ معائب کو مناقب نقائص کو کمالات سمجھ رہے ہیں۔ اور زہر کو تریاق کے درجہ میں رکھ رہے ہیں "ترقی" تہذیب "شائستگی" ارتقا" روشن خیالی" وغیرہ چند الفاظ کان میں پڑ گئے ہیں! الٹ پلٹ کر یہی ہماری زبان پر آرہے ہیں یہی ہمارے دلوں میں بسے ہوئے ہیں شوق انہیں مقصدوں کی تحصیل کا، ارمان انہیں مقصدوں کی تکمیل کا داد دیجئے، فرشتوں کے مشہور معلم کی ذہانت کی، شکار کو پھانسنے کے لئے کیا افسوں کانوں میں پھونک گیا ہے۔

شیطان نے ترکیب تنزل کی نکالی
ان لوگوں کو تم شوق "ترقی" کا دلا دو

شکاریوں کا بیان ہے کہ جب شیر کا شکار منظور ہوتا ہے تو درختوں میں بھینسے باندھ دیئے جاتے ہیں، شیر ان کی خوشبو پاکر انھیں نوش جان کرنے جلدی جلدی لپکتا ہوا جھپٹتا ہوا آتا ہے، اور شکار کرنے کے عوض خود ہی شکار ہو جاتا ہے، شاعر اس تشبیہ کو بھی کام میں لاتا ہے ؎

شیران ترق کا انہیں منظور ہے شکار
بھینسے بندھے ہوئے ہیں ترقی کے شوق کے

حقوق سیاسی کی توسیع پر مسرور ہیں اور خوش ہو رہے ہیں کہ اب ہمارے نمائندے اتنوں کے بجائے اتنے ہو گئے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس طرز انتخاب نے خود ہماری جماعت کے اندر کیسی پھوٹ پیدا کر دی ہے، باہمی رشک وحسد، بدگمانی ونفسانیت خودغرضی، ونا اتفاقی میں کتنی ترقی دے دی، اور طرح طرح کی ناجائز لالچوں،

ترغیبوں کا دامن ہمارے نفس کے لئے کتنا وسیع کر دیا ہے، عذابِ عقبیٰ کو چھوڑیئے، یہ عذابِ دنیوی اپنے ہاتھوں مول لیا ہوا کچھ کم ہے! ؎

عزیز لڑنے نہیں آئے تھے یہ تم کیا ہے
خدا کی مار سے ووٹوں کی مار کم کیا ہے

یہی راگ ایک دوسری دھن میں سنئے ؎

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا — اچھے اچھے ووٹ پہ شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ — سمجھیں اس کو فرض کفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی — سلف گورنمنٹ آگے آئی
پاؤں کا ہوش اب فکر نہ سر کی — ووٹ کی دھن میں بن گئے پھر کی

اس جدید نظامِ اخلاق کو تعلق نہ والدین کی خدمت و تعظیم سے، نہ بزرگوں کی بزرگداشت سے، نہ اللہ و رسول کے احکام اور حقوق و فرائض سے فضا ہی ایسی تیار ہو گئی ہے، ماحول ہی ایسا بن گیا ہے ؎

باپ ماں سے بیخ ہے، اللہ سے، کیا انکو کام
ڈاکٹر جنوا گئے، تعلیم دی سرکار نے

یہ شاعری شاعری نہیں، حقیقت کی ترجمانی ہے۔

آخرت کا خیال جانے دیجئے، یہ ارشاد ہو کہ تہذیب جدید نے اس دنیا کی زیست کی سہولتیں کہاں تک پیدا کی ہیں؟ جینا آسان کر دیا ہے یا اور مشکل؟ جنگ، ہلاکت غارت گری و سفاکی کے وہ حیرت انگیز آلات و وسائل، جو چنگیز و ہلاکو کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے، کس کے ایجاد کئے ہوئے ہیں؟ موٹر، موٹر سائیکل، ریل، لاری،

---

سلہ لکھنؤ اور دہلی کے روزمرہ میں سِر (بالکسر) ہے نہ کہ سر (بفتح)

جرم کے روزانہ اگہانی حادثوں نے ہر بڑے اور متمدن شہر میں موت وہلاکت کا اوسط کچھ گھٹا دیا ہے یا اور بڑھا دیا ہے؟ روزمرہ کی ضروریات زندگی کی ارزانی یا گرانی اب تو نوبت نایابی تک پہنچ چکی ہے، کی کوئی مثال پچھلی تاریخ میں ملے گی؟ طرح طرح کی بھیماریوں کی افراط، انجنوں کی ریل پیل کے مزدوروں کی آبادی کی گنجانی، ہر وقت کی گھڑگھڑاہٹ، ہر گھڑی کے شور و ہنگامہ دم بدم کے دھوئیں نے بڑے بڑے متمدن شہروں کی صحت کا کیا حال کر دیا ہے؟ بڑے شہروں کے شہریوں میں فی صدی کتنوں کے دانت درست ہیں؟ معدے ٹھیک ہیں؟ آنکھیں عینک سے بے نیاز ہیں، جو سکون قلب، آسائش و راحت، تمدن سے بیگانہ دیہاتیوں کو حاصل ہے اس کا کوئی حصہ بھی تمدن جدید کے پرآشوب، ہنگامہ پرور ہیجان انگیز، مرکزوں میں رہنے والوں کو نصیب ہوتا ہے؟ اس قسم کے سوالات کا حل اکبرؔ کی زبان حقیقت ترجمان یوں بیان کرتی ہے ؎

تہذیب تو جسے تم کہتے ہو اس سے اکبرؔ دنیا بگڑ رہی ہے اب یا سنور رہی ہے
نقشوں کو تم نہ جانچو خلقت سے مل کے دیکھو کیا ہو رہا ہے آخر کیسی گذر رہی ہے
دل میں خوشی بہت ہے یا رنج اور تردد کیا چیز جی رہی ہے، کیا چیز مر رہی ہے

سنتے آئے ہیں، کہ ہر درد کی دوا علم ہے، خاک سے پاک کرنا علم کا کام ہے محتاج کو غنی کرنا علم کا فیض ہے، بیمار کو تندرست کرنا علم کی مسیحائی ہے، کہیں اور کبھی بے شک یہی ہوتا ہوگا! لیکن اپنے نصیب کو کیا کہیے کہ یہی تریاق زہر بن گیا ہے ہمیں سابقہ جس علم سے اس دور میں پڑا ہے وہی تو امراض کا مورث ہے، مفاسد کی اصل اور بدبختیوں کی جڑ ہے شربت کا نام دیا گیا، وہی جام زہر نکلا، جسے رہبر کہہ کر پکارا گیا وہی رہزن ثابت ہوا جس نظام کو ہم نے نام علم و تعلیم کا دے رکھا ہے، وہی تو عین جہل ہے۔ یہ تو عین وہی علم ہے جس کا مقصود دلوں میں حب دنیا اور پختہ

وراسخ کرنا ہے، خیالِ عقبیٰ وآخرت کے لئے اس تعلیم کے نصاب میں کوئی جگہ نہیں۔ نصابِ تعلیم کا فلسفہ خدا اور رسول کے اعتقاد سے ناآشنا۔ اس کا سائنس مادیات کے اوپر کچھ دیکھنے سے اندھا۔ اس کی حکمت میں جنت و دوزخ، حور و ملک کا وجود عنقا اس پڑھائی لکھائی کے نتیجے جو نکلنے تھے، نکل کر رہے۔ ان پر برہم ہونا اور ساتھ ہی اس نظام کی تائید کئے جانا، تو گویا یہ چاہنا ہے کہ آگ پیدا ہو جائے لیکن اس میں جلانے کی قوت نہ ہو، پانی کا وجود ہو، لیکن وہ کسی شے کو تر نہ کر سکے۔ آفتاب نکل آئے لیکن کوئی شے اس سے منور نہ ہونے پائے! اکبر کی تشخیص میں یہی! نظامِ تعلیم تو ہے جس نے ابتری ہمارے اخلاق میں معاشرت میں، مذہب میں پیدا کر رکھی ہے ؎

اک علم تو ہے بت بننے کا، اک علم ہے حق پر مٹنے کا
اس علم کی سب دیتے ہیں سند اس علم میں ماہر کون کرے
جب علم کی عاشق دنیا ہو، پھر کون بتائے راہ خدا
جب خضر اقامت پر ہوں فدا، تائید مسافر کون کرے
سودا بھی ہے رنگِ طبع بشر، فطرت ہی میں ہیں اسبابِ جنوں
اکبر کو بھی ہوش آ جائے، تو پھر اس کام کو آخر کون کرے

اسی حقیقت کی ترجمانی، ایک دوسرے وزن و قافیہ میں ؎

مسٹر نقلی کو عقبیٰ میں سزا کیسی ملی — شرح اس کی نامناسب ہے پلی جیسی ملی
اس نے بھی لیکن ادب سے کر دیا یہ التماس — چارہ کیا تھا اے خدا تعلیم ہی ایسی ملی

یہی مضمون ایک تیسری جگہ ؎

اس چیز کا کیا کہنا اکبر، تھا جس نے دلوں کو نیک کیا
لاکھوں ہی طبائع کو کھینچا، ہموار کیا، اور ایک کیا

جو قوم کو ابتر کرتے ہیں، اب انکا اثر پررونا ہے — معلوم نہیں کیا مطلب ہے معلوم نہیں کیا ہونا ہے

اس کا جو سبب ہے سن لو، سب پر وہ عیاں ہے ظاہر ہے
الفاظ صریح و واضح ہیں، یہ مطلع اکبرؔ حاضر ہے
تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں، وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے، وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

فرماتے ہیں کہ ملت کی شیرازہ بندی اگر مقصود ہے تو علیگڈھ اس درد کی دوا نہیں ہو سکتا ملازمت اور چاکری کے سکوں کی ٹکسالوں کا کام تو یہ قومی کالج ضرور دے سکتے ہیں، لیکن قوم کا قوام قوانگریزی سے نہیں، عربی ہی سے درست ہو سکتا ہے، خشک حقیقت کو ظرافت کے چٹخارہ کے ساتھ یوں پیش کرتے ہیں ؎

یہ بات تو کھری ہے، ہرگز نہیں ہے کھوٹی عربی میں نظم ملت، بی اے میں صرف روٹی
لیکن جناب لیڈر یہ شعر سن کے بولے بدھوائیں گے یہ حضرت اس قوم کو لنگوٹی
اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہے کس کی نظر ہے غائر، کس کی نظر ہے موٹی

لیکن نظم ملت واصلاح امت کی اب پروا ہی کس کو ہے؟ دین کا اب سوال ہی کیا! پیش نظر تو صرف دنیا اور اس کی ترقیاں ہیں۔ کونسل اور اسمبلی، اسکول اور کالج، جاہ و منصب، مشاعرہ و اعزاز۔ خودی کی پرستش سے اب فرصت کس کو جو خدا کی پرستش پر توجہ کرے۔ شاعر یہی منظر دیکھ کر صدا لگاتا ہے ؎

مذہب نے پکارا اے اکبرؔ، اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط، تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

نظام کائنات میں اذیت وتکلیف کا وجود رکھا ہی اس غرض سے گیا ہے کہ اس سے نفس میں شکستگی و تضرع پیدا ہو۔ وحن بجائے ”اسباب“ کے مسبب الاسباب کی پیدا ہو مخلوق اپنے ہم جنسوں سے بے آس ہو کر خلوص و خضوع کے ساتھ اپنے خالق کی جانب رجوع کرے۔ چنانچہ دنیا میں جو عذاب نازل ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا فلسفہ یہی ہے۔

فطرت سلیم ایسے موقعوں پر راہ ہدایت پا جاتی ہے۔ لیکن ایسی مخلوق کی بھی کمی نہیں جو الٹا اثر لیتی ہے، اسکی شقاوت و قساوت کے لئے یہ تمام تازیانے بے اثر رہتے ہیں۔ ہر تازہ نشان غیبی، ہر جدید آیت الٰہی، ہر تنبیہ فطرت غفلت وجمود والحاد اعراض میں اضافہ ہی کرتی رہتی ہے۔ جو تریاق ہونا چاہئے تھا۔ وہ اس کے حق میں زہر کا کام دینے لگتا ہے۔ ہجوم مصائب میں بھی اسے تکیہ مادی اسباب پر، اور بھروسہ دنیوی وسائل پر رہتا ہے دست سوال ہر بڑی کوٹھی کے مکین، ہر اونچے دفتر کے سر دفتر کے آگے، دراز ہوتا رہتا ہے۔ پیٹ کا سوال ہر عالیشان دفتر کا طواف کرتا رہتا ہے ہر امیر ہر وزیر، ہر بڑا افسر امیدوں کا مرکز، حاجتوں کا قبلہ بنا رہتا ہے۔ اللہ سے بے تعلقی مصیبتوں کے ہجوم کے وقت بجائے گھٹنے کے کچھ اور بڑھ ہی جاتی ہے۔ اکبرا پنے گردو پیش یہ منظر دیکھ، اپنی زبان حقیقت ترجمان سے اس پر نوحہ خوانی کرتے ہیں۔ لیکن خوب سمجھے ہوئے ہیں کہ یاران مجلس کو درد و عبرت کے تذکروں سے واسطہ کیا۔ یہ تو اس کے نام ہی سے وحشت کرتے ہیں، بزم میں قدم اس شان سے رکھتے ہیں، کہ چہرہ پر ظرافت کا نقاب پڑا ہوا ہے نشاط و زندہ دلی کا ساز ہمراہ ہے، لیکن منہ سے صدائیں درد و عبرت کی نکل رہی ہیں۔ اور زیر لب آواز سوز و فغاں ہی کے سروں میں آرہی ہے۔ بزم میں تماشائی زیادہ ہیں۔ اہل نظر چند۔ تماشائی یہ سوانگ دیکھ کر تالیاں بجاتے ہیں اور اہل نظر کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ ایک جھلک دیکھتے چلئے ؂

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں ۔۔۔ میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

مصیبت میں بھی اب یاد خدا آتی نہیں ہم کو ۔۔۔ دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

فضا کی حالت یہ ہے کہ سچی بات زبان سے نکالنا مشکل، بس جو کچھ سب کہہ رہے ہیں وہی

---

لے حالی ؂ اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی ۔۔۔ بزم میں اہل نظر بھی ہیں، تماشائی بھی

کہے جائیے جو کچھ دوسرے کر رہے ہیں۔ وہی کئے جائیے۔ جس حمام میں سب ہی ننگے ہیں، اسی میں آپ بھی بلا تامل بے پردہ ہو جائیے۔ جب تو آپ اچھے، آپ کی باتیں اچھی آپ کی سوسائٹی اچھی، ادھر کلمۂ حق زبان سے نکالا کر مارے گئے۔ ہر طرف سے آوازے کسے گئے، نکالے گئے، اعزاز و عافیت کی تلاش ہے، تو جو رنگ چھایا ہوا ہے بس اسی میں چپکے سے خود بھی رنگ جائیے ؎

یہ عجب عمل، یہ عجب اثر، یہ عجیب نقش ابھرے گئے
جو بچے بہت تو بچے ذرا، جو کھری کہی تو دھرے گئے
تری بزم اکبر خوش بیاں ہے محل فرحت دوستاں
جو ملول آئے وہ خوش گئے، جو فسردہ آئے ہرے گئے

مذہب اور اخلاق، خدا اور رسول، حشر و ملائکہ کو چھوڑیئے، اس وقت ڈگری حاصل کرنے گریجویٹ ہونے، ڈاکٹریٹ کی سند ہتیانے، کونسل کی ممبری اچک لینے، ملازمت میں داخل ہو جانے کی دھن میں اتنے حواس بھی کسی کے نہیں، کہ خشک عقلی و علمی بحثوں پر قوت خوض صرف کی جائے اور اتنی فرصت کسے کہ ذوقی و رازی نہ سہی سعدی و طوسی کیلئے ہی وقت نکالا جائے! معیار تو صرف یہ ٹھہر گیا ہے کہ فلاں مطالعہ جلب زر میں، حصول جاہ میں، کہاں تک معین رہا اور بس۔ یہ لمبی کہانی، اکبر کی زبانی دو لفظوں میں سن لیجئے ؎

اس سے تو اس صدی میں نہیں ہم کو کچھ غرض
سقراط بولے کیا اور ارسطو نے کیا کہا
بہر خدا جناب، یہ دیں ہم کو اطلاع
صاحب کا کیا جواب تھا، بابو نے کیا کہا

لڑائیاں حکومتوں کے درمیان پہلے بھی ہوتی تھیں، اب بھی ہوتی ہیں۔ البتہ پہلے

ان کی بنیاد تحفظ عقائد، پاس عزت، حتیٰ ناموس تھی۔ گویا کوئی نہ کوئی پہلو خودداری کا لئے ہوئے، اب دنیا اس درجہ غالب آگئی ہے کہ یہ سب اڑا ڈالا، جنگ کی محرک تقریباً ہر جگہ تجارتی رقابت رہ گئی ہے اور معاشی مسابقت، فرماتے ہیں ؎

مذہب کے واسطے نہ شرافت کے واسطے ہے اب تو جنگ حکم وتجارت کے واسطے
لے ہی گئے گھسیٹ کے مجھ کو پرے پرے تیار ہو رہا تھا میں جنت کے واسطے

کس زمانے میں نہیں یہ تعلیم ملی تھی۔ کہ راہ خدا میں جو کچھ دو، حتی الامکان خلق کی نظر سے پوشیدہ کر کے، اور جو کچھ بھی خیرات کرو، اس سے مقصود بس اللہ کی رضا جوئی ہو، نہ کہ بندہ پر کوئی احسان۔ لیکن اب حالت یہ ہے کہ چندہ بعد کو دیا جاتا ہے اور اعلان پہلے کیا جاتا ہے، جلسوں میں بھی، تالیوں کی گونج کے درمیان اور پھر اخبارات کے ذریعہ سے بھی، بلکہ بہت سی صورتوں میں تو بس اعلان ہی اعلان وعدہ ہی وعدہ رہتا ہے، اس سے آگے کی نوبت بھی نہیں آتی۔ اور پھر اس "کار خیر" سے مقصود کیا ہوتا ہے! عموماً وبیشتر یہی نہ کہ فلاں انجمن کی صدارت، فلاں مدرسہ کی سرپرستی ہاتھ آجائے، فلاں پارٹی پر اثر اور اپنا حق قائم ہو جائے " یا پھر یہ کہ چندہ خان بہادری آنریری مجسٹریٹی، نائٹ ہڈ[1]، غرض کسی معزز منصب یا خطاب کی قیمت سمجھ لیا جائے۔ شاعر اپنے چاروں طرف یہ سماں دیکھ کر حسرت و یاس کی لے میں پکار اٹھتا ہے ؎

کچھ دیکھتا نہیں میں دل زار کیلئے جو کچھ یہ ہو رہا ہے سب اخبار کیلئے

ایک دوسری جگہ عبرت وحسرت کے اس گنجینہ کو شوخی وشرافت کے دوشالہ میں ڈھانپ کر پیش کرتا ہے ؎

---

[1] خان بہادری، آنریری مجسٹریٹی، نائٹ ہڈ ("سر" کا خطاب) انگریزی دور حکومت کے خاص اعزاز تھے

چرخ نے پیش کمیشن کہہ دیا اظہار یہ    قوم کالج میں اور انکی زندگی اخبار میں
شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں    بیبیاں اسکول میں ہیں شیخ جی دربار میں

انتشار ملت کی اس سے صحیح تر تصویر اور کیا ہو سکتی ہے ؟

حمایت مذہب کے دعوی، اب بھی زبانی بہت کچھ کئے جا رہے ہیں لیکن عموماً اس طبل بلند بانگ کے پیچھے حقیقت کیا ہوتی ہے ؟ یہی ہے ناکہ ذاتی مخالفتوں، مخاصمتوں کی تسکین کا موقع ہاتھ آئے اور مخالف کی رسوائی اور بدنامی جی بھر کے ہو رہے مخالف اگر "وہابی" ہے تو آپ اس کے مقابلہ میں "صوفی" اپنے کو کہنے لگے۔ اور اس کی وہابیت کو خوب خوب اچھالئے۔ حریف اگر "بدعتی" ہے تو آپ اس کے جزو برا تباع سنت کے مدعی ہو جائیے۔ اور اس کے بدعتی ہونے کو خوب چمکائیے، خوب پھیلا لیے۔ اکبر کا قلم یہ تصویریں پیش کرتا ہے، بلاغت کے رنگین نقش اس پر اضافہ ؎

ہادی کے کبھی پیرو نہ ہوئے، ہاں اسکے لئے لٹھ تان سکے
مذہب نے ہمیں پہچان لیا، ہم اس کو نہیں پہچان سکے

اور کہیں بالکل سادگی سے یہی مقصود یوں ادا کر دیا ہے ؎

مذہب کا نام لیجئے۔ عامل نہ ہوجئے    جو متفق نہ ہو اسے بدنام کیجئے

خدا فراموش نظام معیشت اور خود پرست آئین معاشرت کے اختیار کر لینے کا نتیجہ کیا ہوا ؟ یہی کہ امن و عافیت کا نشان نہ رہا۔ انبساط قلب وسکون خاطر کے الفاظ بے معنی رہ گئے، آئین ہمدردی کے بجائے فلسفہ "تنازع" للبقا اور کارزار حیات کا رائج ہو گیا زندگی کی ضرورتیں گراں ہوئیں، بدکاریاں ارزاں ہوئیں، ہلاکتیں بڑھیں، عمریں گھٹیں، ہیجان میں بیشی، اطمینان میں کمی آئی، محبتیں مٹیں، خصومتیں ابھریں خدا فراموشی کا نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ زندگی تلخ ہو جائے یہ "تمدن و تہذیب" کی اس زندگی سے عقبیٰ جیسی سنورتی ہے اسے تو "کل" پہ اٹھا رکھئے۔ آج کا مشاہدہ تو یہ ہے کہ دنیا برباد ہوئی جاتی ہے۔

گلشن مشرق کا باغبان اپنی آنکھوں سے اپنے چمن کی بربادی دیکھتا ہے، اتنا بس نہیں کہ صیاد کا ہاتھ پکڑ سکے۔ ہاں اپنے اوپر تو کسی حد تک، اختیار اب بھی باقی ہے، زبان پر مرثیہ ہے۔ لب پر آہ ہے۔ آستین آنکھوں پر ہے اسے ہٹا کر دیکھئے تو کچھ بوندیں چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں، ممکن ہے مستقبل کا جوہری ان موتیوں کی قیمت لگا سکے ؎

ہم کوئی روش کے حلقے جکڑ رہے ہیں — باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں
ذاتی ترقیاں ہیں، قومی ہے یا تنزل — گرہیں یہ کھل رہی ہیں یا پیچ پڑ رہے ہیں
ٹانکے وہ اُگ رہے ہیں جو کرو ٹوں میں ٹوٹیں — بخئے جو فطرتی تھے، وہ اب اُدھڑ رہے ہیں
سطح زمیں سے پوچھو کیا مل رہا ہے اس کو — نظروں میں پھلجڑی ہے گو پھول جھڑ رہے ہیں
چلتی تو ہیں زبانیں اور بھرتے ہیں شکم بھی — لیکن امید کیا ہو جب دل اجڑ رہے ہیں
یہ زیور معانی کس کی کریں گی زینت — لفظوں میں یہ نگینہ کیوں آپ جڑ رہے ہیں

فلسفہ کو چھوڑیئے کہ یہ تو خود ہی ظنیات و احتمالات کی بھول بھلیاں ہے سائنس کو لیجئے کہا جاتا ہے کہ یہ قطعیات، و یقینیات کا ہادی ہے اور سائنٹیفک ترقیاں مخصوص فیض ہیں تمدن جدید کا۔ لیکن یہ ارشاد ہو کہ یہ آلات و نت نئی ایجادات والی ترقیوں سے دنیا میں برکتیں زیادہ پھیلی ہیں یا لعنتیں ؟ مجموعی طور سے ان سے اب تک دنیا کے ذخیرۂ مسرت و راحت میں اضافہ ہوا ہے یا جنگ و جدال میں، قتل و غارت میں جعلسازی اور دھوکہ بازی میں ؟ ان سے تحریک و تقویت انسان کے جذبات ملکوتی کو زیادہ پہنچی ہے یا جذبات بہیمی کو ؟ شاعر کے ذہن میں یہ سب واقعات و مشاہدات محفوظ ہیں، آہ سرد کے ساتھ وہ "صاحب" اور "صاحب" کے لائے ہوئے سائنس کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ہم نے تو اپنا اخلاق، اپنا جوہر شرافت، سب آپ کی خوشی پر نثار کر دیا تھا، اپنوں کو بیگانہ بنا لیا تھا، لیکن اب جو نظر پھیر کر دیکھتے ہیں تو آپ کی تشریف آوری سے الٹی مصیبتیں ہی بڑھ کر رہیں ؎

مرے عمل سے نہ شیخ خوش ہیں، نہ بھائی خوش ہیں، نہ باپ خوش ہیں
مگر میں سمجھا ہوں اس کو اچھا، دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں
جو دیکھا سائنس کا یہ چکر، دھرم پکارا کہ اے برادر
ہمارے دورے میں بن مگن تھے تمھارے دورے میں باپ خوش ہیں

"مشرق و مغرب" کا جو فرق ہے وہ مشرق و مغرب کا فرق ہے بعد المشرقین ہے جزئیات میں نہیں، کلیات میں ہے فروع میں نہیں اصول میں ہے عرض میں نہیں جبلت و سرشت میں ہے وہ مادیت میں مست ہیں، ہم روحانیت میں غرق۔ وہ تجارت و ثروت کے گھوڑ دوڑ میں سرگرم عمل ہیں۔ ہم صبر و قناعت کے حجرہ میں خرقہ کمالی لپیٹے ہوئے ہیں، وہ دنیا کے چپہ چپہ سے واقفیت کی دھن میں ہیں، ہمیں اپنے عرفان نفس کی کوششوں سے کہاں فرصت وہ اس پر تلے ہوئے ہیں کہ مادہ کے ایک ایک قانون کو دریافت کرکے رہیں گے، ہم اپنے سفر میں کائنات مادی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ وہ مادہ کے ایک ایک قانون کو دریافت کرکے اچھل پڑتے ہیں، کہ "انسان کی اصل بندر ہے" ہم بدمستی و بیہوشی میں بھی نعرہ لگاتے ہیں تو یہ کہ "انسان خدا میں گم ہے" اکبر اس سارے دریا کو کوزہ میں بند کرکے پیش کرتے ہیں ؎

مشرقی کو ہے ذوق روحانی مغربی میں ہے میل جسمانی
کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈاردن بولے بوزنہ ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست "فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست"

اکبر نرے واعظ نہ تھے۔ حکیم اخلاق بھی تھے۔ راہ راست کی جانب اشارہ کرکے خاموش ہو جانے والے نہ تھے۔ راستہ کی پیچیدگیوں راہ روی کی دقتوں سے بھی واقف، تھے اس لئے مسافروں کو راہ کے پیچ و خم، منزلوں کی مشکلات کی بابت بھی ہدایتیں دیتے جاتے

ہیں۔ اخلاق کے اکثر مرحلے بڑے ہی پیچیدہ واقع ہوئے ہیں، حساب کے پہاڑے نہیں کہ چھوٹا بچہ بھی آنکھ بند کرکے رٹ ڈالے۔ جذبات کی کشش ایک سمت ہوتی ہے عاقبت اندیشی کا فتویٰ دوسری جانب۔ اور پھر خود جذبات کے اندر بھی باہمی آویزش وکشمکش۔ اکبر کہیں کہیں ان گتھیوں کو بھی سلجھاتے گئے ہیں، جابجا ان کی حکیمانہ فکر و عارفانہ نظر نے اخلاق و معاشرت کے محض جزئیات کو نہیں، بلکہ فلسفہ اخلاق کے اصول کو لیا ہے، اور بنیادی مسائل کو کھول کر رکھ دیا ہے۔

شباب کی بدمستیاں و بے احتیاطیاں کس نوجوان اور پختہ عمر والے کو نہیں معلوم ساتھ ہی مذہب و اخلاق کی عدالت کا فیصلہ بھی سب پر روشن ہے۔ اکبر کا کمال یہ ہے کہ کل چار مصرعوں کے اندر (اور چار مصرعوں کی بھی کوئی بساط ہے؟) پہلے تو انسان کی نفسیاتی کیفیت کا نقشہ کھینچتے ہیں، آپ ابھی اسی کو دیکھتے ہوتے ہیں کہ وہ مرض کی ایک ایک علامت بیان کرنے لگتے ہیں۔ آپ اس کی دادا بھی دینے نہیں پائے کہ جھٹ پٹ وہ ایک نسخہ شفا بھی تجویز کر ڈالتے ہیں، مکمل تشخیص اور علاج کل چار مصرعوں میں! ؎

نیچر کو ہوئی خواہش زن کی، اور نفس نے چاہا رشک پری
شیطان نے دی ترغیب کہ ہاں لذت تو ملے زانی ہی سہی
نیچر کی طلب بالکل ہے بجا، اور نفس کی خواہش بھی ہے روا
شیطان کا ساتھ البتہ بُرا، اور خوف خدا ہے اس کی دوا

دین و مذہب کی تحصیل بہتوں نے محض ایک علم وفن کے طور پر کرنا شروع کی ہے یعنی بجائے اس کے کہ اس کو برتیں، اسے اپنی زندگی میں نباہیں، اسے ایک مسلک حیات قرار دیں۔ محض اس کے کچھ مسائل یاد کر لیتے ہیں۔ مقصود ان معلومات پر عمل کرنا نہیں ہوتا بلکہ دوسروں پر اپنی قابلیت کا سکہ جمانا ہوتا ہے، یا پھر دوسروں کی لتاڑ

کرنا۔ اکبر کا قول ہے کہ مذہب و اخلاق سے فائدہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے، جبکہ ان کی تعلیمات پر عمل کر کے انہیں جزو زندگی بنا لیا جائے، نہ یہ کہ ان کے قیل و قال سے کام محض گرمی محفل کا لیا جائے۔ لیکن عمل میں ظاہر بینوں کو لذت کہاں، نفس کو لذت تو دوسروں ہی کے بتانے، پڑھانے سکھانے میں آتی ہے ؎

علم دین حاصل کیا لیکن قباحت یہ ہوئی صرف سکھلانے میں لذت ہی عمل میں کچھ نہیں
زیست کا مصرعہ بنے خود آہ سوزاں، تب ہے لطف ورنہ اے اکبر تری نظم و غزل میں کچھ نہیں

مذہب کا لیبل چپکا لینے، مذہب کا محض نام رٹ لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل شے ایمانیات میں عقیدۂ توحید ہے، اور اعمال میں درستی اخلاق۔ جب یہ حاصل ہے، تو سب کچھ حاصل اور جب یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں حاصل۔ باقی سب لفاظیاں اور اصطلاحی بولیاں ہیں ؎

مرے نزدیک تو بے اصل یہ اشکال ظاہر ہیں!
جو اچھے ہیں وہ مومن ہیں، برے جو ہیں وہ کافر ہیں
وہی ہیں پاک طینت، لو لگی ہے جن کی خالق سے
نہیں ہے شرک کی جن میں نجاست، بس وہ طاہر ہیں

مذہب کی حیثیت انفرادی سے زیادہ جماعتی تھی تو پہلے بھی، لیکن اب تو کہنا چاہیے کہ یہی جماعتی حیثیت اور سب حیثیتوں پر غالب آگئی ہے کوئی شخص عیسائی ہے تو اس کے معنی اب یہی رہ گئے ہیں کہ اس کا میل جول، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا عیسائیوں کے ساتھ ہوگا۔ اس کے طور طریقے فرنگیوں کے سے ہوں گے، سال میں "بڑا دن" منائے گا، خوشی کریگا۔ کیک کھائیگا۔ ہفتہ میں اتوار کو کام کاج بند رکھیگا۔ ملنے جلنے میں رہے گا۔ عجب نہیں کہ گرجا بھی ہو جائے۔ کوئی صاحب اگر شیعہ ہیں، تو معنی یہ ہیں کہ محرم میں مجلس کریں گے عزاداری میں پیش پیش ہوں گے۔ آمد و رفت شیعوں کے ہاں رکھیں گے

کوئی بزرگ اگر سُنی ہیں، تو میل جول اہل سنت سے رکھیں گے، مدح صحابہؓ کے جلسہ جلوس میں شریک ہوں گے۔ گھر کی ریت رسم سنیوں کی سی رکھیں گے۔ کسی شخص نے تبدیل مذہب کر دیا تو اس کے معنی اب یہ ہوتے ہیں کہ اس نے اپنی سوسائٹی بدل دی اپنے جماعتی ماحول میں تغیر کر دیا۔ فلاں فلاں کے بجائے فلاں فلاں سے تعلقات اور رابطے بڑھ گئے۔ عقائد کا سوال بالکل دوسرا ہے۔ اس کا تعلق صرف خدا اور بندہ کے درمیان ہے۔ یہاں گفتگو مذہب کے صرف ظاہری، معاشری و مجلسی پہلو سے متعلق ہے اس لئے اکبر کہتے ہیں کہ معتقدات کی کریدکی حاجت دنیا کو بالکل نہیں۔ دنیا کے دیکھنے کی بات تو صرف اتنی ہے کہ وضع و طرز اعمال اور اخلاق کیسے ہیں ؎

مذہب ہے امر قومی، مجبور نہ فعل ذاتی — معذور سب ہیں اس میں، گنگوہی ہوں یا دناتی
شیعہ ہوں خواہ سُنی، لامذہب ہوں یا برہمن — مذہب کو سورتوں سے پاتے ہیں سب عموماً
پولٹیکل ضرورت بیشک تھی اس کی اول — اب اس طرف توجہ لازم ہے صرف سوشل
اچھا بُرا نہ کہہ دو تم مذہبی بنا پر — اخلاق اس کے دیکھو ہے اصل تو یہ جوہر
تعلیم جو ہے عمدہ صحبت اگر ہے اچھی — پاؤ گے اس کو اچھا، طینت اگر ہے اچھی
ناری ہے یا کہ ناجی، اسکا بیاں نہیں ہے — سوشل طریق یہ ہے، اور وہ تو راز دیں ہے

دنیا کا قانون تکوینی کچھ ایسا رکھ دیا گیا، کہ ایک کے بڑھنے کے معنی دوسرے کے گھٹنے کے ہوتے ہیں، ایک آج ملازمت سے موقوف ہوا، یا پنشن پر بٹھا۔ اس کے گھر میں ماتم برپا ہوتا ہے۔ لیکن جس نے اس کی جگہ پائی، کوئی اس کے گھر میں دیکھے، کیسے شادیانے بجتے ہوتے ہیں۔ پرانی آبادی ویران کر کے، محکمۂ آرائش بلدۂ جہاں ایک خوشنما و خوش فضا پارک بناتا ہے خلقت وہاں تفریح کیلئے امنڈ امنڈ کر جمع ہوتی ہے، اور ہر وقت ہنستی بولتی ہستیوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ لیکن ادھر بھی کبھی خیال کیا گیا ہے، کہ کتنے بھرے بھرے گھر مسمار ہو گئے ہوں گے۔ جب جا کر یہ قطعہ زمین پارک کے لئے نکلا ہے۔ ان

بستے بولتے گھر والوں پر کیا کچھ گذری ہوگی۔ اپنے اپنے پیارے گھروں کو چھوڑتے وقت۔ اپنے گھروں سے بے گھر ہوتے وقت، انہیں کھدتے دیکھ کر، اپنی کھیل کود کی جگہ پر اپنے کھانے پینے، لیٹنے سونے کی جگہ پر پھاوڑے چلتے دیکھ کر، انہیں خاک میں اٹتے اور رستے دیکھ کر!۔ فاتح اپنی فتحمندیوں کا جشن مناتا ہے۔ بھلا ہوا، بالکل بھلا ہوا۔ کہ کتنی سہاگنیں بیوہ ہوگئیں کتنے بچے یتیم ہوگئے۔ کتنے خاندان برباد اور کتنے گھر بے چراغ! ؎

یہ بات ہے صاف مجھ سے سن لے کتاب میں اسکو کیا پڑھیگا
حدود دنیا کے ہیں معین، جو یہ گھٹے گا تو وہ بڑھیگا

انسان معصیت سے ہاتھ اگر کھینچتا ہے تو عموماً اسی وقت، جب خود گناہ ہی کی قوت سلب ہو چکی ہے، ورنہ جب تک قوت وسامان موجود ہے، نفس پرستیوں اور سیہ کاریوں کا سلسلہ ذرا مشکل ہی سے موقوف ہوتا ہے ؎

معترض بھی کوئی حق گو کبھی ہو جاتا ہے مگر اس بزم میں سچ یہ ہے کہ جی ہاں ہے بہت
وعظ تقوے نہ کہو، رحم کرو اکبر پہ، چشم بد دور، ابھی طاقت عصیاں ہے بہت

نیکی اور بدی پر آخرت میں ثواب وعذاب جو کچھ بھی مرتب ہو، وہ تو ہو گا ہی ایک بین فرق دونوں کے درمیان تو اس دنیا میں بھی محسوس ہوتا ہے کہ طاعت کے بعد طبیعت میں شگفتگی، اطمینان، سکون پایا جاتا ہے، اور معصیت کے بعد طبیعت کو اضطراب لاحق ہوتا ہے ؎

شگفتہ پایا طبیعت کو بعد کار ثواب
دلیر دل کو نہ پایا کبھی گناہ کے بعد

محض کتابی معلومات، انسان کے جوہر باطن کو صیقل نہیں کر سکتے، اس کیلئے اچھی صحبت لازمی ہے زندگی پر اثر زندہ شخصیت ہی کا پڑتا ہے ایمان میں، قوت عمل

میں رسوخ زندہ معلم ہی کے واسطہ سے نصیب ہوتا ہے عالم بے عمل وہی کہلاتے ہیں جن کے دماغ کتابی معلومات سے لبریز ہیں۔ لیکن دل غفلت کی نیند سو رہے ہیں ؎

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں　　آدمی آدمی بناتے ہیں
جستجو ہم کو آدمی کی ہے،　　وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں

ایک اور موقعہ پر ؎

کام نکلے گا نہ اے دوست کتبخانوں سے
رہئے کچھ روز کسی محرم اسرار کے ساتھ

انسان کو اپنے خلاف مزاج دنیا میں ہزار ہا واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ لیکن کارخانہ دہر کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا۔ اس کے بس کی بات نہیں، یہ نظام کائنات تو اس کی مرضی کا نہیں کسی اور ہی کی مشیت کا پابند ہے اس لئے مآل اندیشی کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان ہر نا ملائم واقعہ پر، ہر حادثہ پر، صبر و تحمل، بلکہ رضا و تسلیم سے کام لے۔ یہی اصول ایسے ہیں جو زندگی کو ہر طرح خوشگوار بنا دیں گے ؎

اپنی مرضی کے موافق دہر کو کیوں کر کروں
بے حد آتا ہے مجھے غصہ مگر کس پر کروں
چل بسے چھوٹے بڑے، تھا جن سے لطف زندگی
مجھ کو کس کا ناز ہے، میں ناز اب کس پر کروں
وصل کی شب حسب موسم ہو ہی جائے گی بسر!
لطف اٹھاؤں یا درازی کی دعا شب بھر کروں

کائنات کا ذرہ ذرہ کسی خاص غایت و مصلحت کے ماتحت حرکت کر رہا ہے ہر چھوٹے سے چھوٹے فعل کا معاوضہ کسی نہ کسی صورت میں مل کر رہے گا۔ ہر مبتدا کی خبر ضرور نکلے گی۔ ہر ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت کوئی نتیجہ پیدا کر کے رہے گی، انسان اگر

اس حقیقت کو ہر وقت پیش نظر رکھے، اور دل کو عیش و عشرت کی غفلتوں میں نہ پھنسنے دے تو زندگی بڑے امن و عافیت کے ساتھ گزر سکتی ہے، جام حیات میں تلخی پیدا کرنے والی ہماری ہی فراموش کاریاں، غفلت شعاریاں ہوتی ہیں۔ اس فلسفہ کو ایک مسلسل غزل میں کس خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے ؎

اکبر اس فطرت خاموش کو بے حس نہ سمجھ — ہاں بصیرت سے تہی، دیدہ نرگس نہ سمجھ
راحت زیست کے سامان سے دھوکے میں نہ آ — امتحان گاہ کو تو عیش کی مجلس نہ سمجھ
جاہ و منصب میں نظر عاقبت کار پہ رکھ — خاتمہ جس کا ہو افسوس اسے اکسِ نہ سمجھ
صبر کے ساتھ مصیبت میں جو ہو حسن عمل — پھر انجام پہ امرت ہے اسے بس نہ سمجھ
دل کا دنیا کی امید وں سے بہلنا ہے برا — زندگی تلخ جو کر دیں، انہیں مونس نہ سمجھ

تعصب اور غصہ کے جذبات عموماً تنگ نظری کی بنا پر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کی نظر جوں جوں وسیع ہوتی جاتی ہے دل میں ہمدردی، رواداری، دوسروں کی ہوا خواہی زیادہ پیدا ہوتی ہے البتہ فطرت کی نیرنگیوں، مشیت تکوینی کی عجائب کاریوں، علم مطلق کے مظہروں کو دیکھ کر حیرت ضرور طاری ہوتی رہتی ہے ؎

شیخ جی کی نظروں میں ہوں فقط — میری نظروں میں ساری دنیا ہے
بس یہی وجہ ہے کہ اے اکبر — مجھ کو حیرت ہے ان کو غصہ ہے

علائق دنیوی کی جتنی بہتات ہوگی، اسی نسبت سے سامان غم و الم بھی بڑھتے رہیں گے۔ امن و عافیت مقصود ہے تو دنیوی تعلقات جہاں تک ممکن ہو کم کرنے چاہئے ؎

ایک جمتا ہے، ایک پگھلتا ہے — کام دنیا کا یوں ہی چلتا ہے
دل تعلق بڑھا کے پچھتایا — پاؤں پھیلا کے ہاتھ ملتا ہے

انسان دوسرے کی عیب چینی و نقص جوئی میں تو بہت پیش پیش رہتا ہے، لیکن خود اپنی کمزوریوں اور خطا کاریوں کی جانب ذرا توجہ نہیں کرتا۔ اس حقیقت کو کس

پرلطف انداز سے ادا کرتے ہیں۔ ے

میری نسبت جو بہا ارشاد، وہ میں نے سنا
یہ تو کہئے اپنی نسبت آپ کی کیا رائے ہے

انسان کی نسبت سب سے زیادہ صحیح رائے خود اس کا ضمیر قائم کرسکتا ہے کہ وہی اسکی اصل کمزوریوں سے واقف ہوتا ہے انسان ساری دنیا کو دھوکہ میں ڈال سکتا ہے لیکن خود اپنے ضمیر سے کوئی شے مخفی نہیں رکھ سکتا ہے

نہ بھول اس پر کہ یہ اور وہ تجھے ایسا سمجھتا ہے
تو اپنے دل میں اپنے آپ کو کیسا سمجھتا ہے

اخلاق کی صفائی، نفس کے تزکیہ کیلئے محض گوشہ نشینی کافی نہیں۔ اصل شے قلب کی بے تعلقی ہے اور اس کا مدار عمل پر ہے اچھی باتوں کی داد دینے والے بہت سے مل جاتے ہیں۔ لیکن انھیں، تہ دل سے ماننے والے، ان پر عمل کرکے دکھا دینے والے کم ہی نکلتے ہیں سے

حرص دنیا سے نہیں ہر صاحب عزلت بری
خانقاہیں اور ہیں اور دل کا کونہ اور ہے

مدحت گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند،
خوب کہنا اور ہے، اور خوب ہونا اور ہے

نفس بشری کی ایک خاص کمزوری دنیا پر ہمیشہ سے مسلط رہی ہے اور اب تو بہت ہی بڑھی ہوئی، پھیلی ہوئی ہے۔ انسان دوسروں کی بدکاری پر انہیں برا بھلا کہہ لینا اپنے لئے بالکل کافی سمجھتا ہے اور خود اپنی اصلاح کی طرف ذرا توجہ نہیں کرتا۔ گویا عبادت و حسن عمل کا بنیادی پتھر، اللہ کی حمد نہیں، بلکہ شیطان پر لعنت ٹھہر گئی ہے یہ صورت حال اکبر کے فلسفۂ اصلاح کے بالکل مخالف ہے۔ اہل فرنگ اگر ہیں ناتوان دبے بس

باہر ہیں اپنا تختہ مشق بنائے ہوئے ہیں تو اس کا یہ علاج نہ صحیح ہے نہ کافی، کہ ہم بس انہیں کوستے کاٹتے رہیں ان کے طور طریق پر لعنت بھیجتے رہیں۔ ہم کو اصل فکر اپنی ترقی و اصلاح کی ہونا چاہئے۔ حضرت اکبر فرماتے ہیں کہ شیطان نے اس دور میں شیطنت کی یہ ترکیب خوب نکالی ہے کہ کچھ بندوں کو بس اس پر لگا دیا ہے کہ وہ اس کے اوپر لاحول پڑھنے میں لگے رہیں اور حمد و مناجات توحید و حسن عمل کے لئے وقت ہی نہ نکال سکیں ؎

نئی ترکیب اب شیطان کو سوجھی ہے اغوا کی
خدا کی حمد کیجئے ترک، بس مجھ کو بُرا کہئے

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں کہ حریف اگر ہمارے اوپر ستم پر ستم توڑ رہا ہے اور ہم بجائے اپنی اصلاح حال و تصحیح اعمال کے محض اس پر لعنت بھیجنے میں لگے ہوئے ہیں، تو تباہ ہم اور وہ دونوں ہو کر رہیں گے قانون فطرت، انتقام دونوں سے لے گا حریف سے اس کی زیادتیوں کا، ہم سے ہماری کوتاہیوں کا اس اقدام جبر و ستم کا، ہم سے غفلت و جمود کا۔ دشمن کی تباہی، ہماری فلاح کی خود بخود مستلزم ہرگز نہیں ؎

یہی خصائل یہی طبیعت رہی تو قسمت یہی رہیگی
زمانہ بدلے گا بھی تو پھر کیا، ہماری حالت یہی رہیگی
یہی سیہ کاریاں اگر ہیں تو نور صبح امید کیسا،
یہی ہے زلف بتاں کا سودا، تو سر کی شامت یہی رہیگی
عمل جب اپنے نہیں ہیں اچھے تو ذکر عصیان غیر کیسا
عدو کی قسمت بگڑ بھی جائے تو اپنی قسمت یہی رہیگی

سکون خاطر و اطمینان قلب اگر مقصود ہے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے، سارے اولیا

انبیاء کا بتایا ہوا راستہ ع

صد ہزاراں پیر بر روے سقف

یعنی دنیا سے بحیثیت دنیا کے بے تعلقی و بیزاری۔ دل میں لو اور لگن کسی اور ہی کی لگی رہے۔ باقی ہاتھ پیر، چلتے، پھرتے حرکت، اسی دنیا میں کرتے رہیں بقول عارف روم ؎

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست　　جز بہ خلوت گاہ حق آرام نیست

یہی نصیحت بیسویں صدی کے اس عارف نے بھی کی ہے ؎

جو اہل دنیا کا رخ کرو گے سکون خاطر کبھی نہ ہوگا
شریک غفلت بہت ملیں گے، شریک عبرت کوئی نہ ہوگا
یہی ہے مذہب کا جزو اعظم کہ دین دنیا پہ ہو مقدم
نئے طریقے ہیں لیکن اے دوست ہو گا سب کچھ یہی نہ ہوگا

صدیوں پیشتر اس آوازۂ حق کی منادی کردی گئی تھی کہ اطمینان قلب و راحت دل صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو ایمان کامل رکھتے ہیں، اور اپنی بدعملیوں سے اپنے ایمان کو زنگ نہیں لگاتے۔ اکبرؔ کی آواز بھی اس آوازہ حق کی صدائے بازگشت ہے خلقت کو اصلاح دنیوی کا راستہ بتاتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کلام مجید کے اوراق سامنے کھلے ہوئے ہیں انہیں کا ترجمہ اپنی زبان میں کرتے چلے جاتے ہیں۔ ذرا کان لگا کر سنئے ؎

یہ عزم ترا سعی سے دمساز ہو کیوں کر　　اسباب نہ ہوں جمع تو آغاز ہو کیونکر[1]

---

[1] "جو بھی مصیبت تمہارے اوپر آتی ہے خود تمہارے ہاتھوں آتی ہے" (سورہ شوریٰ رکوع ۴) "تمہیں جو کچھ بھی برائی پیش آتی ہے خود تمہارے نفس کی لائی ہوئی ہے" (سورۂ نساء رکوع ۱۱)، "اللہ کسی قوم کی حالت اسوقت تک نہیں بدلتا جبتک وہ خود اپنی حالت نہ بدل دے" (سورۂ رعد رکوع ۱۲)

اسباب کرے جمع خدا ہی کا یہ ہے کام
طالب ہو خدا ہی سے دعا ہی کا یہ ہے کام[1]

بے طاعت و نیکی نہیں تاثیر دعا کچھ،
آنے کی نہیں کام فقط حرص و ہوا کچھ[2]

منظور مفاخر کا اگر تجھ کو سبق ہے
تخصیص تری کیا ہے حریفوں کو بھی حق ہے[3]

یہ کشمکش فطرت دنیا ہے مسلسل
اک آج اگر صاحب طاقت ہو تو اک کل[4]

نیکی کی طرف رخ ہو یہی ناموری ہے
کھوٹے کو جدا کر دے، وہی بات کھری ہے[5]

لیکن یہ سارا دفتر وعظ و پند، یہ ساری شاعری و بلاغت، یہ ساری فلسفہ سنجی و نکتہ آفرینی ایک طرف، اور فطرت کی رفتار تکوینی، مشیت الٰہی کا رخ دوسری طرف مشیت نے بڑے بڑے انبیاء و رسل کو ظاہری نتیجہ کے اعتبار سے ناکام رکھا۔ حکمت تکوینی نے خدا معلوم کتنے ہی معرکوں میں صورت و ظہور کے اعتبار سے کفر کو ایمان پر، اور ظلمت کو نور پر غالب رکھا۔ اس کی عادت میں بیسویں صدی کے ایک مصلح

---

[1] اللہ ہر قسم کی فراہمی اسباب پر قادر ہے لیکن اکثر لوگ اس سے بے خبر ہیں (سورہ کہف رکوع ۵) "ساری قوت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے" (سورہ بقرہ رکوع ۲۰) "حکومت و اختیار صرف اللہ کا ہے" (سورہ یوسف رکوع ۵)

[2] مسلمانو، فلاح عاقبت نہ تمہاری تمناؤں پر موقوف ہے، نہ اہل کتاب کی تمناؤں پر بلکہ عمل پر موقوف ہے، پس جو شخص برا کرے گا، اس کی سزا پائے گا (سورۂ نساء رکوع ۱۸)

[3] وہی اللہ تو ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا، تمہیں میں کافر بھی اسی نے پیدا کئے اور مومن بھی (سورۂ تغابن رکوع ۱)

[4] ہم یہ زمانہ حکومت و کامرانی باری باری لوگوں کو دیتے رہتے ہیں (سورہ آل عمران رکوع ۱۴)

[5] "تم میں جو سب سے زیادہ پاکباز ہے وہی اللہ کے نزدیک سب سے معزز ہے (سورۂ حجرات رکوع ۲) "جو لوگ عزت کے خواستگار ہیں، سو عزت تو ساری کی ساری صرف اللہ ہی کی ہے" (سورۂ فاطر رکوع ۲)

شاعر کی خاطر فرق کیونکر پڑ سکتا تھا؟ ہدایت وگمراہی کے دور کا آخری سلسلہ انسان کے نہیں، انسان آفرین کے ہاتھ میں ہے۔ اس کارخانہ کائنات کی بنیاد جس غفلت پر رکھی گئی ہے۔ اسی پر کارخانہ برابر چلتا رہے گا۔ پیمبروں جیسی مقبول و برگزیدہ ہستیاں جب فطرت کی رفتار کو نہ بدل سکیں تو کسی شاعر غریب کی بساط ہی کیا۔ اکبر بھی اس تماشاگاہ عالم میں اپنا جلوۂ حسن دادا، کمال وجمال کے ساتھ ادا کر کے رخصت ہو گئے۔ لیکن چلتے چلتے یہ بھی کہہ گئے۔ کہ زمانہ کا رخ میری یا کسی کی بھی تبلیغ سے نہیں پھر سکتا، چند ہی روز میں یہ حال بھی ماضی بن جائے گا، یہ "آج" بھی "کل" میں تبدیل ہو جائے گا۔ حال کی تازگی، ماضی کا افسانہ پارینہ بن جائے گی۔ اسوقت کوئی نوحہ پڑھنے والا بھی نہ ہوگا احساسات خود ہی تبدیل ہو چکیں گے عیب ہنر بن جائیں گے، اور کمال کا نام بے کمالی پڑ جائیگا۔ عقل کو جنون کا لقب دے کر پکاریں گے اور جنون کی تعبیر عقل سے کریں گے ؎

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ کون سی چیز گم ہو گئی۔ عنفوان شباب کی لذتوں اور مستیوں میں پڑ کر یاد بھی کس کو رہ جاتا ہے، کہ بچپن کی معصومیت کا زمانہ رخصت ہو گیا۔ بےفکریوں کا وقت کیسا خواب وخیال بن گیا، اور نئی نئی فکروں ذمہ داریوں کا کتنا سخت بوجھ سر پہ آ پڑا ہے، آنکھ کھلتی ہے مگر کب! جب وقت ہاتھ سے نکلے ہوئے بہت عرصہ ہو چکا ہوتا ہے عجب نہیں کہ کچھ ویسا ہی حشر ہماری موجودہ معاشرت کا بھی ہو۔ اکبر کے جام جم میں اس قلب ماہیت کے ایک ایک جزو کا عکس موجود ہے۔ بہتر ہوگا کہ مرثیہ کا آخری بند سنا کر مجلس کو کسی دوسرے وقت کیلئے ملتوی کر دیا جائے ؎

---

[1] افسوس کہ وہ "دوسرا وقت" کبھی نہ آیا۔ مضمون کی تقسیم شروع میں پانچ حصوں میں کی گئی تھی اور پانچویں حصہ کا عنوان "تصوف، معرفت، فلسفہ" تھا۔ لیکن مضمون جب ۱۹۲۳ء میں رسالہ اردو میں (باقی صفحہ ۱۲۵ پر)

یہ موجودہ طریقے رہائے ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے سامان بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسین اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسوؤں میں یہ خم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردہ کی پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہونگے
بدل جائے گا انداز طبائع دورِ گردوں سے،
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے سامان غم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا، مغربی پتلے صنم ہوں گے
بہت ہوں گے مغنی نغمہ تقلید یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لئے بے تال بے سم ہونگے
ہماری اصطلاحوں سے زبان ناآشنا ہوگی لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے

---

(بقیہ صفحہ ۱۳۴) نکلا، تو صرف چار ہی حصے نکلے، اور پانچواں حصہ جو سب سے زیادہ ضخیم ہوتا سارے کا سارا لکھنے سے رہ گیا تھا۔ اب ۱۹۴۲ء میں نظر ثانی کے وقت اتنی ہمت نہ ہوئی کہ تکملہ کیلئے پوری محنت ایک مستقل مقالہ کی گوارا کی جائے۔ یوں ہی بہت زیادہ وقت نظر ثانی کی نذر ہو گیا تھا۔ مضمون اسی طرح ناتمام صورت میں شائع ہوتا ہے! دنیا میں خدا معلوم کتنی خیالی اسکیمیں اور کتنے منصوبے اسی طرح ناتمام رہ جاتے ہیں۔ اور انسان انہیں چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہو جاتا ہے ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! (عبدالماجد مئی ۱۹۴۲ء)

بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ ہیں جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے
گذشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ وحشم ہوں گے
تمھیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

---

# اُردو کا ایک بدنام شاعر[1]

## یا

## گنہگار شریف زادی

لکھنؤ ہے اور واجد علی شاہ "جانِ عالم" کا لکھنؤ۔ زمانہ یہی انیسویں صدی عیسوی کے وسط کا۔ آج سے کوئی ستر پچھتر سال قبل۔ ہر لب پر گل کا افسانہ، ہر زبان پر بلبل کا ترانہ۔ ہر سر میں عشق کا سودا، ہر سینہ میں جوشِ تمنا۔ ہر شام میلوں ٹھیلوں کا ہجوم، ہر رات گانے بجانے کی دھوم۔ یہاں رہس کا جلسہ، وہاں اندر سبھا کی پریوں کا بیڑا۔ ادھر زبان پر ضلع جگت اور پھبتیاں، ادھر گلے سے نکلی ہوئی تانیں اور ہاتھوں سے بجتی ہوئی تالیاں گلی گلی "جنتِ نگاہ و فردوسِ گوش" چپہ چپہ "دامانِ باغبان و کفِ گل فروش" بڑے بڑے متین اور ثقہ، گویوں اور سازندوں کی سنگیت میں اچھے اچھے مہذب اور مقطع بھانڈوں اور ڈھاریوں کی صحبت میں۔ سفید پوشوں کے دامن عبیر اور گلال کی پچکاریوں سے لالوں لال، جبے اور عمامے والے، پیشوازوں کی گردش پر نثار۔ غرض یہ آج کی اصطلاح میں ہر طرف "آرٹ" اور "فائن آرٹ" کا دور دورہ عشق کا چرچا، حسن کا شہرہ۔ اس فضا میں ایک صاحب حکیم تصدق حسین نامی آنکھیں کھولتے ہیں، کوئی عالمِ دین نہیں، صوفی درویش نہیں، واعظ و مصلح نہیں جو کلوں کے آدمی، یار باش زندہ دل، رند مشرب، اہلِ بزم کے خوش کرنے کو شعر و شاعری کا ساز لیکر بیٹھے تو انگلیاں انہیں پردوں پر پڑیں جن کے نغمے

---

[1] رسالہ سہیل (علیگڈھ)

کانوں میں رچے بسے ہوئے تھے اور منہ سے بول نکلے تو وہی، جن کے نقش دلوں میں جمے ہوئے تھے۔

غزلیں شاید زیادہ نہیں کہیں، کہیں ہوں گی بھی، تو اس وقت کسی کی زبان پر نہیں۔ تھوڑا بہت، جو کچھ کہا اس کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

کہنے میں نہیں ہیں وہ ہمارے کئی دن سے
پھرتے ہیں انھیں غیر ابھارے کئی دن سے
اک شب مرے گھر آن کے مہمان رہے تھے
ملتے نہیں اس شرم کے مارے کئی دن سے
آخر سری آہوں نے اثر اپنا دکھایا،
گھبرائے ہوئے پھرتے ہو پیارے کئی دن سے
پھر شوق سے کیا اس بت عیار سے بگڑی
ہوتے نہیں باہم جو اشارے کئی دن سے

حکیم صاحب کی حکمت و طبابت سے یہاں غرض نہیں۔ شاعری کی دنیا میں حکیم صاحب کا نام نواب مرزا ہے اور تخلص شوق۔ اور ان کے نام کو قائم رکھنے والی، ان کی غزلیں نہیں مثنویاں ہیں۔ تذکروں میں ہے کہ خواجہ آتش کے شاگرد تھے۔ ہوں گے، لیکن یہ یقیناً یا تو استاد کے بعد کی ہیں۔ یا ان کی زندگی میں ان سے چرا چھپا کر کہی ہیں، ورنہ آتش کی نظر پڑنے کے بعد عجب نہیں کہ نذر آتش ہو جاتیں۔ خواجہ آتش کی متانت کب اس کی روادار ہوتی کہ سعادت مند شاگرد آوارگی اور تماش بینی کی بولی ٹھولی میں وہ نام پیدا کر جائیں کہ تہذیب کی آنکھیں ان کا نام آتے ہی نیچی ہو جائیں، اور عریاں نگاری کے وہ شرارے چھوڑ جائیں کہ ان کی یاد کی چمک دمک قائم رہے بھی تو اسی روشنی میں!

ان مثنویوں کا نام پڑھے لکھوں کے مجمع میں لیا جائے؟ تہذیب جدید کی اجازت ہے کہ ایک مشرقی شاعر کی عریاں نگاری کی نقلی یا دگاروں کا نام لیا جائے؟ نواب مرزا غریب لکھنؤ کا تھا۔ انگلستان کا نہ تھا، فرانس کا نہ تھا۔ امریکہ کا نہ تھا۔ کہ اس کی ہر بیحیائی "آرٹ" کا کمال سمجھ لی جاتی، اس کی ہر عریاں نگاری پر کمال فن کی داد ملتی اور اس کا ہر عیب ہنر بن جاتا! بیسویں صدی کا نہیں، انیسویں صدی عیسوی کے وسط کا تھا، "نئے ادب" کے دور سے بہت قبل کا تھا۔ آج کے "ترقی پسند" ہندوستان کا نہ تھا کہ اس کی ہر فحش نگاری، "ترقی پسندی" کی سند اور دستاویز بن جاتی۔

بہرحال مثنویاں منسوب تو ان کی جانب کئی ایک ہیں، لیکن لذت عشق کی زبان قطعاً شوق کی زبان نہیں[1]۔ اور فریب عشق مشکل ہی سے ان کی تسلیم کی جاسکتی ہے ہاں ہو سکتا ہے، تو مشق کے زمانہ کی کوئی ابتدائی کوشش ہو۔ یقین کے ساتھ جن دو مثنویوں کو ان کی تصنیف تسلیم کیا جاسکتا ہے ان میں ایک کا نام بہار عشق ہے اور دوسری کا زہر عشق۔ اور ان دونوں میں شہرت عام زہر عشق ہی کے نصیب میں آئی دونوں میں نہ کوئی پلاٹ ہے اور نہ کوئی طلسم کشائی، نہ شاعر منبر پر بیٹھ کر اخلاق کا وعظ کہہ رہا ہے نہ کالج کے لکچر روم میں تحلیل نفسیاتی کر رہا ہے اسے محض اپنی ہوسناکی کی کہانی سنانی ہے اور یہی وہ خوب مزہ لے لے کر سنا رہا ہے پھر چونکہ محض "آپ بیتی" ہی سنانی ہے۔ اس لئے "جگ بیتی" سنانے والوں کی طرح کسی دوسرے کو عاشق فرض کرنے کی بھی ضرورت نہیں پیش آتی ہے۔

---

[1] سنہ ۱۹۲۲ء میں یہ محض قیاس سے لکھا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں لذت عشق کا ایک بہت قدیم مطبوعہ نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی کے کتب خانہ میں نظر سے گذرا۔ اسکے سرورق پر تصریح ہے کہ یہ مثنوی شوق کے ہمشیرزادہ ایک اور حکیم صاحب کی ہے۔

بہار عشق میں افسانہ کا انجام، شادی پر ہوتا ہے۔ پیش نظر نسخہ کانپور کے مطبع مولوی علی بخش خاں کا چھپا ہوا ہے، ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کا۔ یہ نسخہ نسبتاً صحیح ہے، حال کے مطبوعہ نسخے، علاوہ بہت زائد اغلاط مطبعی کے آخر سے ناقص بھی ہیں، شادی کا ذکر ان میں غائب ہے۔ کل نظم میں آٹھ سو سے اوپر شعر ہوں گے۔ شعر خاصی تعداد میں ایسے ہیں جو بزرگوں کے سامنے کیا، بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بھی زبان سے ادا ہونے مشکل ہیں۔

کتاب کے شروع میں حسب دستور زمانہ بادشاہ کی مدح ہے اور سننے کے قابل ہے ارشاد ہوتا ہے ؎

نوبت مدح شاہ آئی ہے  آے قلم وقت جبہ سائی ہے
کر رقم اب دعائے شاہ زماں  کہ ہے وہ ملک ہند کا سلطان
آفتاب سپہر جاہ و حشم  شاہ واجد علی شہ عالم

یہ "شاہ زماں" اور "سلطان ہند" اور "شہ عالم" اور "آفتاب سپہر جاہ و حشم" کے خطابات اس وقت عطا ہو رہے ہیں، جب حکومت اور بادشاہت کے سارے اختیارات تو چند مربع میل کے رقبہ تک محدود ہو کر رہ گئے تھے اور اس محدود چار دیواری کے اندر بھی مجال نہ تھی کہ "صاحب عالیشان رزیڈنٹ بہادر" کے حکم کے خلاف کوئی انگلی ہلا سکے! آگے اور سنئے ؎

خلق پر سایۂ الہی ہے،  مالک تاج و تخت شاہی ہے
ہے بشر، پر خدا کی قدرت ہے  نیک سیرت ہے، خوبصورت ہے
سرور خسروان عالم ہے،  سچ تو یہ ہے کہ جان عالم ہے
دل تمنائے وصل او دارد!  چہ بلا شکل آرزو دارد!

ان آخری شعروں میں بادشاہ کی مدح رعایا کی زبان سے ہو رہی ہے یا

جہاں پناہ اپنے کسی محل کو باد فرما رہے ہیں ؟

قصہ کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ایک روز لب بام ایک ماہ لقا دکھائی دیتی ہے، اس کے سراپا نے حسن و جمال کا عکس اس آئینہ میں ملاحظہ ہو ؎

بام روشن ہے طور کی صورت سر سے پا تک تھی نور کی صورت
حسن یوسف بھی اس کے آگے ماند چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند
گل سے رخسار، گول گول بدن گات جس طرح قمقمے روشن
ناک میں نیم کا نقطہ تنکا، شوخی چالا کی مقتضا سن کا،
آستینوں کی وہ کھینچی کرتی ! جسم میں وہ شباب کی بھرتی
قد میں آثار سب قیامت کے گوری گردن میں طوق منت کے
عکس رخ موتیوں کے دانوں میں بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں
رگ گل سی کمر لچکتی ہوئی چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی

یہ منظر دیکھتے ہی حکیم صاحب اپنی ساری حکمت بھول بھال سو جان سے عاشق ہو جاتے ہیں اپنے گھر تک واپسی مشکل ہو جاتی ہے اور جب کسی طرح گرتے پڑتے پہنچتے ہیں تو انوائی کھٹوائی لے کر پڑ جاتے ہیں، غش پر غش آنے لگتے ہیں۔ زندگی سے یاس ہو جاتی ہے۔ ماں باپ بھائی، بہن، دوست احباب سب گھبرا جاتے ہیں، اور طرح طرح کا دوا علاج کر کے جب اسے بے اثر پاتے ہیں تو رونے دھونے لگتے ہیں۔ ان مرحلوں کے بعد ایک روز ایک رازدار دوست آکر حکیم صاحب کے دل کی نبض ٹٹول ان کے مرض کی تشخیص کرتے ہیں، اور اس مقدس مشن پر روانہ ہو جاتے ہیں کہ ان کے گھائل کرنے والی ستمگر پری پیکر کے گھر کا پتہ لگائیں گے اور کسی دم دلاسے سے اسے گھیر گھار ان سے لاملائیں گے در یار پہ پہنچکر پہلے گھر کی مہری کو گانٹھتے ہیں۔ یہ مہری صاحبہ بنی ٹھنی ہوئی خود اس انتظار میں کھڑی ہیں کہ

آپ ان کی چھب تو دیکھتے ہی چلیں، زبان سے لاحول پڑھتے ہوئے لیکن نظر کو نظر سے چار کرتے ہوئے ؎

| | |
|---|---|
| . . . . . . . . . . . . . . | سانولا رنگ چلبلی صورت |
| لال نیفہ ازار بند پڑا ! | گچھا اک کنجیوں کا اس میں پڑا |
| کھیلتی ہنستی کھلکھلاتی ہوئی | آنکھ اک ایک سے ملاتی ہوئی |
| آنکھ اک ایک پر لگاوٹ کی | بات اک ایک سے گھلاوٹ کی |
| حسن کے دن جوانی زوروں پر | رات کی باسی مہندی پوروں پر |
| یہاں ٹھہری کبھی وہاں ٹھہری | دو سخن ہنس بول لی جہاں ٹھہری |
| آگے اور پیچھے یار، فوج کی فوج | دھینگا مشتی کسی سے گالی گلوج |

یہ نہ دیکھئے کہ کیا کہا، نظر اس پر رکھئے کہ کس طرح اور کیسا کہا۔

جیسی روح ویسے ہی فرشتے۔ اگر یہ عاشق صاحب تماش بینی میں شہرۂ آفاق تھے تو ان کے دوست صاحب بھی کٹنا پے میں طاق۔ زنانی ڈیوڑھی تک رسائی پیدا کر کرا، ان نام کی بیگم صاحبہ پر کچھ ایسا افسوں پڑھا۔ اور "عاشق صادق" پر حالت نزع کے طاری ہونے کا کچھ اس طرح سماں باندھا، کہ آخر وہ ان کے بھرے میں آ گئیں، یہ بیگم صاحبہ بھی خیر سے کچھ نِھی نادان نہ تھیں، کھیلی کھائی ہوئی تھیں، لیکن پھر آخر ناقص العقل۔ ایک شریف بدمعاش کی قسما قسمی اور خدا و رسول کے واسطوں پر یقین کر بیٹھیں، اور درگاہ حضرت عباسؑ کی حاضری کا بہانہ کر، گھر سے سوار ہو گئیں کہاروں کو پہلے ہی سے پٹی پڑھا دی گئی تھی۔ سواری آ کر لب مرگ "عاشق بیمار" کے دروازہ پر رکی۔ خدمتگار خبر دیتے آتا ہے کہ ڈیوڑھی پر ایک سواری آئی ہے۔

---

ؔ لکھنؤ کے غربی حصے میں ایک مشہور شیعی زیارت گاہ۔

یہ خدمتگار صاحب بھی آخر کس دل پھینک مخدوم کے خادم تھے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرماتے جاتے ہیں "ایک ماما بھی آئی ہے ہمراہ۔ کتنی چالاک ہے خدا کی پناہ" ماما پردہ نشیں نہیں بے پردہ ہے اور "حسن رہ گذرے" آپ کے اخلاق کے دارالافتا میں "مسردود خانہ ہمسایہ" ہی کی طرح معاف ہے۔ موقع ہے کہ آپ اپنی متانت اور ثقاہت کو خطرہ میں ڈالے بغیر، چپکے سے ایک نظر، اچٹتی سی، ادھر بھی ڈال لیں

پوچھتی آئی ہے یہاں تک گھر ہاتھ رکھے کھڑی ہے کولھے پر
اپنے سایہ سے بھی بھڑکتی ہے بوٹی بوٹی پڑی پھڑکتی ہے
شرم ہے آنکھ میں نہ دل میں خطر پھبتیاں کہہ رہی ہے اک اک پر
ہنسی ٹھٹھا ضلع جگت میں طاق چل رہی ہے زبان تڑاق پڑاق
کھڑی اک اک کا منہ چڑھاتی ہے ہنسے دیتی ہے لوٹی جاتی ہے
چونی لپٹی ہے باسی ہاروں سے لڑ رہی ہے جگت کہاروں سے
راستے والے جو گذرتے ہیں! سن کے کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں

بہرحال ساری اترتی ہے۔ تخلیہ میں یکجائی ہوتی ہے شہدپن کو کھل کھیلنے کا موقع ملتا ہے، شرم و حیا کے حجابات اٹھ جاتے ہیں، اور بجائی و نفس پرستی کے پردے ہر طرف چھوڑ دیئے جاتے ہیں، ایک طرف ہوسناکی کی تمنائیں ہیں، دوسری طرف انکار کی ادائیں ہیں، منت و سماجت کی دھیمی آوازیں تو خلوت گاہ کی دیواروں کے اندر گونج کر رہ جاتی ہیں، البتہ ڈانٹ پھٹکار کی گرما گرم صدائیں پردہ کے باہر بھی صاف سنائی دے رہی ہیں ؎

بل بے فقرہ ترا معاذ اللہ میرے تو ہوش اڑ گئے واللہ
لوگ کہتے تھے ہے لبوں پر جان مکر کے صدقے جھوٹ کے قرباں
کون کہتا ہے زہر کھایا ہے یہ بھی اک شعبدہ بنایا ہے،

تو بہ کس درجہ بیحیائی ہے — واہ کیا دیدہ کی صفائی ہے
کیا کہوں اور بے حیا تجھ کو — پھٹے منہ لعنت خدا تجھ کو
میں بڑا چکمہ کھا گئی افسوس — جو ترے جل میں آگئی افسوس
جھوٹا بدذات فیلیا مکار — ان گنوں پر ترے خدا کی سنوار
مکر کا بانی جھوٹوں کا سرتاج — سنتے تھے فیلسوف دیکھا آج
ایسے فقروں کو کوئی کیا سمجھے — اور تو کیا کہوں خدا سمجھے

لیجئے اب ترا آواز اور بلند ہوگئی، اور لہجہ میں غصہ کی تھرتھراہٹ اور صاف ہوگئی سے

چربی آنکھوں پہ تیرے چھائی ہے — کچھ نگوڑے کی شامت آئی ہے
کبھی آفت نہ یہ اٹھائی تھی — چھائیں بھوئیں میں نوج آئی تھی
کیا دھما چوکڑی مچائی ہے — تیری بختاوری کچھ آئی ہے
موذی، بدذات، بے حیا بے شرم — جانتا ہے کہ ہم ہیں گرما گرم
کس قدر صاف تیرا دیدہ ہے — ایک نٹ کھٹ حرامزادہ ہے
کون سمجھے تجھے ادھورا ہے — ارے تو سب گنوں میں پورا ہے
میں اگر بولنے پہ آؤں گی! — لاکھوں دھرے ترے اڑاؤں گی
ابھی سب کہہ کے سن کے رکھ دونگی — سات پڑھی کو بین کے رکھ دونگی
اور وہ ہوتیاں ہیں البیلی — میں نہیں کچھ گڑیاں کھیلی
گالیاں کیسی، کوسنے دوں گی — میں بھی ایک اپنے نام کی ہونگی
رحم کرنا ہے تجھ پہ نادانی، — وہاں ماروں جہاں نہ ہو پانی
تیری پیسہ پہ بوٹیاں کاٹوں — چیل کوؤں کو بیٹھ کے باٹوں

یہ جو شعر آپ نے سنے پھر بہت صاف اور سنجیدہ ہیں باقی ایک بڑی تعداد نقل کے قابل کسی طرح بھی نہیں خلوت کو کوئی آئینہ خلوت آخر کس طرح بنا دے ظالم نے

مصوری کی یہ خداداد قابلیت کاش کسی شریفانہ نظم میں صرف کی ہوتی! شاعر جس ماحول میں تھا اس میں اخلاق کی پستی، جذبات کی فرومائگی درکاکت، بیحیائی وعریاں نگاری کی کمی نہ تھی، حمام میں سب ہی ننگے تھے۔ آخری دربار اودھ کے شعرائے باکمال اور سخن گویان شیریں مقال میں کون اس میدان کا مرد نہ تھا؟ بااین ہمہ ان کاملوں کی سرداری کا تاج شوق ہی کے سر پر رکھا گیا۔ اس بزم کی صدر نشینی نواب مرزا ہی کے حصہ میں آئی، لیکن اس صدارت و سرداری کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ بھی سب پر عیاں ہے آج اردو شاعری کی تاریخ میں کہیں اس غریب کے لئے کوئی جگہ[1] ہے، اُردو کے مشاہیر شعراء کی فہرست میں کسی نمبر پر ان کا نام آتا ہے؟ اکثر تذکرہ نویسوں نے ان کا یا ان کی مثنویوں کا نام تک بھی لیا ہے؟ شاعروں کا کوئی طبقہ آج تلمذ یا کسی دوسری حیثیت سے اپنا انتساب ان کی جانب پسند کرتا ہے؟ یا اس کے برعکس ان کا نام آتے ہی کچھ جھینپ سا جاتا ہے اور بے اختیار اپنی تبری کرنے لگتا ہے؟ نقادان شعر کے حلقوں میں، سخن سنجوں کی صحبتوں میں، پڑھے لکھے اور شریف گھرانوں میں نواب مرزا شوق اور ان کی مثنویوں کی کہیں بھی وقعت اور پرسش ہے؟

کلام کا کچھ نمونہ اوپر گذر چکا، اور بہت کچھ ابھی آنے کو ہے محاورات پر یہ عبور بگیمات کے روزمرہ پر یہ قدرت، زبان کی یہ صحت، بیان کی یہ سلاست جذبات نگاری کی یہ قوت، کیا ہر شاعر کے نصیب میں آتی ہے، ان تمام حیثیات سے، شوق کا کلام اردو کے کسی شاعر سے فروتر ہے؟ پھر آخر اس بے التفاتی کی وجہ؟ شوق کی کس مپرسی کا سبب؟ وجہ ظاہر اور سبب واضح ہے۔ مشرق، کم از کم اسلامی مشرق، اپنی

---

[1] یہ صورت حال ۱۹۲۰ء کی بیان ہوئی دورِ "ترقی پسندی" کے طلوع ہونے سے قبل، اس وقت خود اس مقالہ کا لکھنا اور اسے بھری مجلس میں سنانا، ذرا جرأت ہی کا کام تھا۔

جبلت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ قدر شرم وحیا کے جذبات کی کرے، عزت کی مسند پر جگہ شرافت کیلئے خالی کرے اور اپنا سر عصمت وعفت کی تصویروں کے آگے خم کردے۔ بےحیائی عریاں نگاری اور تحریری شہدپن کی عزت وقعت اس کی سرشت کے مخالف ہے۔ جس طرح ہر فرد ایک مخصوص طبیعت اور خاص مزاج رکھتا ہے، ہر قوم کا بھی ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے، ہر تمدن کی بھی ایک مخصوص سرشت ہوتی ہے تو قومی زندگی کی جو کارروائیاں اس عام مزاج و سرشت سے الگ ہوتی ہیں، وہ کبھی قوم کے قوام میں نہیں داخل ہونے پاتیں۔ قومی تمدن کا مستقل نظام انہیں اپنے میں جذب کرنے قبول کرنے اور اپنا جزو بنانے سے انکار کر دیتا ہے اور نظام تمدن کا ایک بڑا مظہر ہر قوم کا شعر وادب ہوتا ہے شوق کی کھلی ہوئی عریاں نگاری، مشرق کے ذوق سلیم کے مخالف تھی، بگڑی اور اجڑی ہوئی تہذیب اسلامی کے بھی منافی تھی، اس لئے اسلامی مشرق نے شوق کی ساری شاعرانہ خوبیوں کے باوجود ان کے لئے اپنی فہرست مشاہیر میں کوئی جگہ نہ رکھی۔ اور نام کو بالکل "گمنام" ہونے سے بچا کر رکھا بھی تو "بدنام" کرکے زندہ رکھا۔ مشرق کا صوفی بگڑے گا، بہکے گا بھی، تو بندگی میں خدائی کے دعوے کرنے لگے گا۔ یہ نہ ہوگا کہ مغرب کے ترقی یافتہ حکیم کی طرح اپنی انسانیت کو بھلا کر فخر اپنے بندر ہونے پر کرتے لگے! بیہوش ہو جائے گا۔ بدحواس نہ ہوگا۔ بگڑنے پر بھی بات اس کی بنا کہ جان عالم کا ہندوستان، بھانڈوں اور سازندوں کا ہندوستان، لاکھ بگڑنے پر بھی اپنے سے اتنا بیگانہ نہیں ہوا تھا، اپنے کو اتنا نہیں بھولا تھا، کہ کوئلہ کا نام ہیرا رکھدے اور پیتل کو سونا سمجھنے لگے!

غرض تو اب مرزا کو اپنی پست مذاقی اور مبتذل نگاری کی سزا، مشرق کی عدالت گاہ سے ملی اور بجا طور پر ملی، لیکن وہ خود بھی آخر مشرقی ہی تھا، باوجود انتہائی بےحیائی کے یہ ناممکن ہوا کہ چوری کے جرم پر سینہ زوری کا بھی اضافہ کرے۔ لارڈ بائرن اور

اور آسکر وائلڈ[1] کی سی یہ جرأت و جسارت کہاں سے لاسکتا تھا، کہ گندہ نظم اور گندہ تر نثر کو شعر و ادب کا بہترین نمونہ کہہ کر پیش کرتا! یہ بیباکی اور ڈھٹائی نیویارک کے ایوننگ گرافک لندن کے نیوز آف دی ورلڈ اور لندن لائف اور اسی مرتبہ کے اور اعلیٰ تیجے اونچے فرنگی اخباروں رسالوں ہی کے حصہ میں آئی ہے، لفظ و عبارت ہی نہیں، فوٹو اور تصویریں تک زیادہ سے زیادہ عریاں چھاپتے رہیں اور نام "آرٹ" کی ترقی کا یا صحت کے رکھ رکھاؤ کا لے دیا کریں[2]! غریب مشرقی کا تخیل بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا عمل میں کیسی ہی شرمناک کمزوریاں اور کوتاہیاں ہوں لیکن عقیدے میں فحش و بیحیائی کا جواز داخل نہ تھا۔ اپنے شہدپن کی کہانی سنانے کو تو سنا ڈالی لیکن معاً یہ خیال بھی سامنے آگیا کہ خود تو خیر رسوا ہو چکے ایسا نہ ہو کہ داستان فسق دوسروں کے لئے سامان تباہ کاری بن جائے۔ آخر مشرقی تھے مسلمان تھے، بات کو انجام تک پہنچاتے پہنچاتے خود اپنے انجام کا بھی خیال آگیا۔ اٹھے تھے شیطان پورہ کی وقائع نگاری کرنے، رخ خود بخود خانقاہ کی جانب پھر گیا۔ اور ابتدا میں جس کی حمد میں زبان کھلی تھی ؎

کس زباں سے کروں صفات خدا　　کیا بشر سمجھے کنہہ ذات خدا

جب نبی یوں کہے کہ اے مالک　　ما عرفناک حق معرفتک

انتہا میں بھی اسی کا خوف غالب آگیا، اور اسی کی خشیت نے قلب کو لرزا دیا زبان اب چل رہی ہے اور مضمون عشق ہی ہے، لیکن اب وہ مرادف فسق نہیں۔ ذرا کان لگا کر تو سنئے یہ ایوان حسن و عشق میں داستان فسق بیان ہو رہی ہے یا کسی حلقۂ ذکر میں تسبیح و

---

[1] اور اب تو وہ دو قوں غریب یعنی جیمس جوائس اور اس جیسے بیسیوں فحش نگار مردوں اور عورتوں کے آگے گرد ہو کر رہ گئے ہیں۔

[2] ملاحظہ ہوں انگلستان کے رسالہ (HEALTH & EFFICIENCY) کے چند نمبر۔

تحلیل ہورہی ہے ؎

اب سنیں صاحبان عقل و شعور — ہے یہ دنیا تمام مکر اور زور،
شہد ظاہر میں زہر اندر ہے — جس قدر اس سے بھاگے بہتر ہے
صاحب عقل کو نہیں ہے زیب — کہ اٹھائے جہاں میں رہ کے فریب
سب یہ دنیا سرائے فانی ہے — عشق معبود حبا و دانی ہے

ہائیں! یہ کیا سے کیا ہوگیا! ابھی تو شرافت اور متانت کانوں میں انگلیاں دیئے ہوئے تھی، اور اب ہے کہ آنکھیں بچھا دینے کو تیار! کہاں ابھی گلفام و سبز پری کا سوانگ جما ہوا تھا، اور کہاں رومی و غزالی کا دفتر عظمت کھل گیا ؎

کہتے ہیں صوفیان صافی دل — کہ ہے عشق خدا بہت مشکل
عشق اللہ کا جو مائل ہو، — ترک دنیا کرے تو حاصل ہو
اب یہ لازم ہے جو کہ ہے انسان — ترک دنیا کرے بہر عنوان
کوئی الفت نہ بے وفا سے کرے — عشق کرنا ہے تو خدا سے کرے
چارون کی یہ زندگانی ہے — جو ہے اس کے سوا وہ فانی ہے
ہے وہ مستجمع جمیع صفات — لائق محمدہ ہے اسی کی ذات
وہی اول میں ہے وہی آخر — وہی باطن میں ہے وہی ظاہر
کون سی جا ہے جس جگہ وہ نہیں — چاہیئے ہے نگاہ وحدت بیں

تلقین زہد و موعظۂ معرفت سے طبیعت اکتا چلی ہو تو بس تھوڑے سے صبر کی اور ضرورت ہے چند ہی شعر باقی رہ گئے ہیں ؎

لکھتے ہیں صوفیان با توقیر — عشق اللہ ہے عجب اکسیر
جس کو اس در تلک رسائی ہے — دین و دنیا کی بادشاہی ہے
شل سیماب دل کی ہے تاثیر — خاک ہوجائے تب بنے اکسیر

دنیا کہتے ہیں جس کو پردہ ہے  باقی اللہ کے سرا کیا ہے
منکشف اس کی کیا حقیقت ہو  وہی جانے جسے بصیرت ہو
پردے اٹھ جائیں جب جدائی کے  حال اس دم کھلیں خدائی کے

یہ کس کا کلام ہے ؟ کسی صوفی خرقہ پوش کا ؟ یا اسی حیا دشمن کا جو ابھی اپنی سیہ کاری کی داستان مزے لے لے کے سنا رہا تھا !

اس بدنام مشرق کے مقابلہ میں مغرب کے نیک ناموں کے پاس کیا ہے ! یہ رنگ مشرق تھا، جو فخر مغرب ہیں سوال ان کی بابت ہے ۔ یہ مشرقی تخیل کا اسفل سافلین تھا۔ لیکن جو مغربی تخیل کا اعلیٰ علیین ہے اس کے صحن چمن میں گلگشت کے بعد، پندو موعظت، سلوک و معرفت عبرت و اخلاق کے کتنے گلدستے تیار ہو سکتے ہیں !
ــــ ذکر مستثنیات کا نہیں، عمومی اور اکثری حالات کا ہے۔

(۲)

نواب مرزا کا شاہکار بہار عشق نہیں، زہر عشق ہے ان کے نام کو بُری یا بھلی جو کچھ بھی شہرت حاصل ہے اسی زہر عشق کے طفیل میں ہے ۔ یہ مثنوی بہار عشق سے چھوٹی ہے ۔ کوئی پانچ سو شعر ہوں گے ، بحر وہی ، زبان وہی ، طرز بیاں وہی، لیکن درد و اثر کے اعتبار سے اس سے بڑھ چڑھ کر، بہار عشق کا خاتمہ وصل کی شادمانی پر ہوا تھا ۔ زہر عشق کا انجام ہیروئن کی خودکشی اور عاشق کے اقدام خودکشی پر ہوتا ہے بہ حیثیت مجموعی یہ نظم بہار عشق کے مقابلہ میں بہت مہذب اور سنجیدہ ہے ۔ عریانی اگر اس میں ہے بھی تو بس اتنی جتنی ہر عاشقانہ افسانہ میں ہوتی ہے ۔ ہیروئن اس کی بھی کوئی عصمت مآب نہیں، لیکن دوسری طرف کوئی "لکھا بسیوا" بھی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شریف گھرانے کی ایک الھڑ لڑکی، نو عمری کی نادانیوں میں مبتلا ہو گئی ہے ۔ تاہم غیرت و عزت سے بالکل ہاتھ نہیں دھو بیٹھی ہے ۔

لکھنؤ میں شروع شروع تھیٹر کا رواج ہوا تو کسی کمپنی نے اس تماشہ کو اسٹیج پر بھی دکھایا تھا۔ پرانے لوگوں سے یہ روایت سننے میں آئی ہے کہ تماشہ میں گنہگار کنواری کے جنازہ کا اٹھنا اور اس کے پیچھے پیچھے غم زدہ والدین کا ماتم کرتے ہوئے چلنا اور پچھاڑیں کھا کر گرنا، جب دکھایا گیا تو تماشا گاہ ایک بزم عزا بن گئی۔ لکھنؤ کی نزاکت قیامت خیز واقعیت کی نقل کا تحمل نہ کر سکی۔ ہچکیوں اور سسکیوں کا تار بندھ گیا۔ بعضوں کو غش آ گئے اور ایک آدھ نے شاید خودکشی کی بھی ٹھان لی۔ اس پر تماشہ کا دکھانا قانوناً ممنوع ہو گیا اور کتاب کی اشاعت بھی عرصہ تک بند رہی، اب چند سال ہوئے لکھنؤ کے مطبع مجتبائی نے پھر شائع کیا ہے۔ میرے پیش نظر اس مطبوعہ نسخہ کے علاوہ ایک بدخط قلمی نسخہ بھی ہے، اندازے سے کوئی پچاس ساٹھ سال ادھر کا لکھا ہوا۔

کتاب کے سرنامہ پر حمد باری و نعت رسول کی جو سطریں ثبت ہیں ؎

لکھ قلم پہلے حمد رب ودود — کہ ہر ایک جا پہ ہے وہی موجود

ذات معبود جاودانی ہے — باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے

ہمسر اس کا نہیں، ندیم نہیں — سب ہیں حادث، کوئی قدیم نہیں

مدح احمد زباں پر کیونکر آئے — بحر کوزہ میں کس طرح سے سمائے

ذات احمد کو کوئی کیا جانے — یا علیؑ جانے یا خدا جانے

آگے چل کر بجائے جہاں پناہ کی مدح کے ۱۰، ۱۲ اشعار عشق کی تعریف و تعارف میں ہیں۔ ان میں سے بعض شعر اپنی صفائی و روانی کی بنا پر عام زبانوں پر چڑھ گئے ہیں ؎

عشق سے کون ہے بشر خالی — کر دیئے اس نے گھر کے گھر خالی

پڑتے ہیں اس میں جان کے لالے — ڈالتا ہے جگر میں یہ چھالے

اس سے امید رکھنا ہے بجا — بھائی مجنوں سے کیا سلوک کیا
آتش ہجر سے جلاتا ہے — آگ پانی میں یہ لگاتا ہے
مار ڈالا تماشں بینوں کو — زہر کھلوا دیا حسینوں کو

قصہ کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ :۔

جس محلہ میں تھا ہمارا گھر — وہیں رہتا تھا ایک سوداگر

اس کے ایک نوعمر حسین لڑکی تھی ۔ ماں باپ کی آنکھ کا تارا ، لکھی پڑھی نستعلیق ایک روز کو ٹھے پر آئی ، نواب مرزا سے آنکھیں چار ہوگئیں ۔ یہ حضرت تو اپنا دل نذر کرنے کے لئے ہر وقت ہتھیلی پر لئے پھرتے ہی تھے ۔ کھٹ سے عاشق ہوگئے اور اپنے ماں باپ کے سامنے خوب خوب فیل لائے اب کی عشق ایک طرفہ نہ تھا ۔ ادھر بھی اثر ہو چکا تھا ۔ ایک روز ایک ماما نامۂ شوق چپکے سے لاکر شوق کے ہاتھ میں دے گئی ۔ خوشی سے کانپتے ہوئے ہاتھوں اور خوشی سے پرنم آنکھوں کے ساتھ کھول کر پڑھا ؎

ہو یہ معلوم تم کو بعد سلام — غم فرقت سے دل ہے بے آرام
شکل دکھلا دے کبریا کے لئے — بام پر آ ذرا خدا کے لئے

دل کی چوٹ بُری ہوتی ہے لڑکی قسمت کی ماری عقل و ہوش سے اندھی ہو چکی ہے پھر بھی شریف زادی ہے ۔ اس لئے قلم اس سے زیادہ بے حیائی پر نہیں اٹھ سکتا فوراً اپنی خودداری کو یوں سنبھالتی ہے ؎

سارے الفت نے کھو دئے اوسان — ورنہ یہ لکھتی میں خدا کی شان
اب کوئی اس میں کیا ذلیل کرے — جس کو چاہے خدا ذلیل کرے
اس محبت پہ ہو خدا کی مار — جس نے یوں کر دیا مجھے ناچار

عاشق صاحب یہ پڑھ کر بھلا جامہ میں کہاں سما سکتے تھے ۔ ایک جواب بحر طویل میں دھر گھسیٹا ۔ جا و بیجا ۔ مناسب و نامناسب ، سب ہی کچھ زبان قلم نے اگل ڈالا ۔ ادھر

سوداگرزادی بھی بڑی برق دم نکلیں۔ انہیں کے جوڑ کی، کھوٹے کھرے مال کی خوب پرکھ رکھتی تھیں۔ پیامِ شوق "پڑھ کر خوب لطف لیا اور ہنس کے بولی کہ واہ واکیا خوب جواب لکھنے بیٹھی تو بسم اللہ یوں کی "کچھ تھا تو نہیں ہے دامنگیر" اور پھر خوب خبر لی ؎

ذکران باتوں کا یہاں کیا تھا چھیڑنے کو یہ تیرے لکھا تھا!
یہ تو لکھے تھے سب ہنسی کے کلام ورنہ ان باتوں سے یہاں کیا کام
مجھ کو ایسی تھی تیری کیا پروا بام پر تو بلاتے آ، کہ نہ آ
تم یہ مرتی، میں کیا قیامت تھی کیا مرے دشمنوں کی شامت تھی
میری جانب سے یہ گماں کیا خوب جھوٹ جم جم سے ہے بہت مرغوب
کالا دانہ ذرا اتروالو! رائی نون اس سمجھ پہ کر ڈالو
دیکھ تحریر فیل لائے آپ خوب جلدی مزے میں آئے آپ

چند روز اسی طرح مزہ مزہ کی نوک جھونک جاری رہی اس کے بعد ایک جمعرات کو دہی درگاہ کی زیارت کا چلتا ہوا، فقرہ کام آیا۔ شامت کی ماری والدین کے گھر سے چلی آئی اور نواب مرزا کی ڈیوڑھی پر آکر رکی، آگے جو کچھ ہونا تھا ہوا، شرافت لٹی، عزت ڈوبی۔ آمد و رفت کا سلسلہ اس کے بعد قائم ہو گیا، لیکن یہ چوری چھپے کی ملاقات کب تک راز رہ سکتی تھی۔ گھر والوں کو ٹوہ لگ گئی اور والدین نے اپنی رسوائی دفع کرنے کو یہ تجویز کی کہ لڑکی کو لکھنؤ سے دور شہر بنارس میں کسی عزیز کے پاس پہنچا دیا جائے۔ ادھر لڑکی کو بھی سن گن مل گئی۔ دل نے کہا کہ "ہائے کٹ جانے کی بات ہے ماں باپ کو بھی آخر اس روسیاہی کی خبر ہو گئی۔ اب ان کا سامنا کیسے کیا جائے گا۔ اس زندگی سے تو موت بھلی" نوعمری کا زمانہ، دل دنیا کی تلخیوں سے ناآشنا، حوصلے زندہ اور ولولے تازہ سامنے دنیا اور اس کی بہاریں، ابھی لڑکی ہی ہے کوئی پیرزال نہیں، کچھ بیمار دکھی بھی نہیں۔ بس بات اتنی ہے کہ رگوں میں مشرقی شرافت کا خون

گردش کررہا ہے۔ دماغ پر خاندانی روایات کی یاد محفوظ ہے، دل میں غیرت و حمیت کی آن باقی ہے۔ جان جیسی عزیز چیز سے ہاتھ دھونا گوارا، لیکن اسکی برداشت نہیں کہ سب عزیزوں قریبوں کی نظروں میں ذلیل ورسوا ہوکر زندگی بسر کی جائے۔ بس یہ دل میں ٹھان آخری ملاقات کے لئے عاشق کے پاس آتی ہے۔ جان دینا تو عاشقوں کا کام سمجھا جاتا ہے یہاں جان دینے پر وہ آمادہ ہے جو خود اس قابل ہے کہ دوسرے اس کے اوپر اپنی جانیں فدا کرتے ا سہ

تھی نہ فرصت جو اشکباری سے اتری روتی ہوئی سواری سے

شکیسپیر نے اپنے ڈراموں میں عاشق و معشوق کی جدائیوں اور دوامی ملاقاتوں کے منظر بارہا دکھائے ہیں۔ خودکشی، اقدام خودکشی اور مصنوعی خودکشی کے منظروں سے بھی اس کے صفحات خالی نہیں اور رومیو جولیٹ کے بعض سماں تو بہت ہی مؤثر اور دردانگیز سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ہے اس فرنگستان کے مشہور و ممتاز ڈرامہ نگار کے یہاں کوئی منظر جو اثر و عبرت انگیزی میں مشرق کے اس بے نام شاعر کے کھینچے ہوئے نقشہ کا مقابلہ کرسکے ؟

حسرت نصیب آتی ہے اور کہتی ہے سہ

اقربا ہو گئے مرے آگاہ تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ
وہ چھٹے ہم سے جس کو پیار کریں جبر کیوں کر یہ اختیار کریں
گو ٹھکانے نہیں ہیں ہوش و حواس پر یہ کہنے کو آئی ہوں ترے پاس

سمجھے کہاں ابھی غفلت کے قہقہے بلند ہو رہے تھے اور کہاں عبرت کا درس شروع ہوگیا دنیا اور اس کی ساری دلفریبیاں ایک ایک کرکے رخصت ہو رہی ہیں۔ اب سابقہ پڑنے کو ہے بندی کا اپنے مالک سے، کمزور کا زوروالے سے، بےبس کا قدرت والے سے۔ غفلتیں دور ہوگئیں، مدہوشیاں کافور ہوچلیں۔ شمع جھلملانے لگی، چہرہ پر زردی

چھانے لگی۔ اب نہ جوانی میں وہ لذت وسرور، نہ حسن ورعنائی میں وہ پندار وغرور، اب ندامتیں ہیں اور اشکباریاں، عبرتیں ہیں اور آہ وزاریاں — موت کی آمد شاید ہر غافل کو اسی طرح جھنجھوڑ کر ہوشیار کر دیتی ہے ؎

جائے عبرت سرائے فانی ہے ۔۔۔ مورد مرگ ناگہانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے ۔۔۔ آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پہ شگوفہ و گل تھے! ۔۔۔ آج دیکھا تو خار بالکل تھے
بات کل کی ہے نوجوان تھے جو ۔۔۔ صاحب نوبت ونشان تھے جو
آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی ۔۔۔ نام کو بھی نہیں نشاں باقی
غیرت حور مہ جبیں نہ رہے ۔۔۔ ہے مکان گر تو وہ مکیں نہ رہے
کوئی لیتا نہیں اب اس کا نام ۔۔۔ کون سی گور میں گیا بہرام
کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج ۔۔۔ آج وہ فاتحہ کو ہیں محتاج
تھے جو خود سر جہان میں مشہور ۔۔۔ خاک میں مل گیا سب ان کا غرور
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے ۔۔۔ نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے ۔۔۔ استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے
تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر ۔۔۔ ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
رشک یوسف جو تھے جہاں میں حسین ۔۔۔ کھا گئے ان کو آسمان و زمین
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے ۔۔۔ یہی دنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتہ ۔۔۔ نہ کسی جا ہے نل ودمن کا پتہ
بوئے الفت تمام پھیلی ہے ۔۔۔ باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے
صبح کو طائران خوش الحان ۔۔۔ پڑھتے ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان
موت سے کس کو رستگاری ہے ۔۔۔ آج وہ، کل ہماری باری ہے

موت کے تصور سے اچھے اچھے دلیر اور رستم وقت لرز اٹھتے ہیں۔ یہ تو بیچاری ایک پردہ نشین لڑکی ہی تھی، کمسن و نادان ۔۔ یہ وصیتیں کرتے وقت اس کے جسم نازک کے اندر قلب نازک کی کیا حالت ہوگی؟ ۔۔ آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ دل کا ہول بڑھتا جاتا ہے۔ چہرہ پر ایک رنگ آتا ہے ایک جاتا ہے۔ کلیجہ میں ٹکیے لگے ہوئے ہیں زبان لڑکھڑا رہی ہے آواز تھرتھرا رہی ہے الفاظ پورے پورے ادا نہیں ہو پاتے پھر بھی تقدیر پر صبر کرکے طبیعت کو سنبھالتی ہے آنسو پونچھتی جاتی ہے اور کہتی ہے ؎

| | |
|---|---|
| ہم اگر جان دیدیں کھا کے سم | تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم |
| دل کو بجولیوں میں بہلانا | یا مری قبر پر چلے آنا |
| جا کے رہنا نہ اس مکان سے دور | ہم جو مر جائیں تیری جان سے دور |
| روح بھٹکے گی گر نہ پائے گی | ڈھونڈنے کس طرف کو جائے گی |
| روکے رہنا بہت طبیعت کو | یاد رکھنا مری وصیت کو |
| میرے مرنے کی جب خبر پانا | یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا |
| جمع ہولیں سب اقربا جس دم | رکھنا اس وقت تم وہاں پہ قدم |
| کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم | ساتھ تابوت کے نہ رونا تم |
| ہو گئے تم اگر جو سودائی | دور پہونچے گی میری رسوائی |
| لاکھ تم کچھ کہو نہ مانیں گے | لوگ عاشق ہمارا جانیں گے |
| طعنہ زن ہوں گے سب غریب و امیر | قبر پہ بیٹھنا نہ ہو کے فقیر |

گنہگار سوداگر زادی، اپنے گناہ کا احساس رکھتی تھی خلق میں اپنی رسوائی سے سرناتی تھی، کوئی ماڈرن آرٹسٹ، کوئی فرنگی "فلم اسٹار" نہ تھی کہ فخر اپنی بے حیائی پر اور ناز اپنی سیاہ کاری پر کرتی، گنہگار رہنا قسمت میں لکھا کر آئی تھی سو بن چکی لیکن گناہ کی اشاعت کی

روا دار کسی حال میں نہ تھی، دامن عصمت داغدار ہونا تھا ہوچکا، پھر بھی عزت کے وزن سے واقف تھی، شرافت کی قدر و قیمت پہچانتی تھی۔

پردہ پوشی کے لئے کیسی کیسی منت و سماجت کرتی ہے ؎

| | |
|---|---|
| پاس رکھنا ہماری عزت کا | سامنا ہو ہزار آفت کا |
| آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں | جب جنازہ مرا عزیز اٹھائیں |
| بند اپنی زبان رکھئے گا ! | میری منت پہ دھیان رکھئے گا |
| نام منھ سے نہ لیجئے گا مرا | تذکرہ کچھ نہ کیجئے گا مرا |
| ساتھ غیروں کی طرح جائیے گا | اشک آنکھوں سے مت بہائیے گا |
| سب میں رسوا نہ کیجئے گا مجھے | آپ کاندھا نہ دیجئے گا مجھے |
| تا کسی شخص پر نہ حال کھلے | ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے |
| یوں نہ عزت مری ڈبو دینا | ذکر سن کر نہ میرا رو دینا ! |

کہتے ہیں مرد کی خاطر عورت اپنے کو مٹا دیتی ہے فنا کر ڈالتی ہے کم سے کم ہندوستان کی عورت کا تو بیشک یہی حال ہے۔ خود تو جان دے رہی ہے مگر یہ اب بھی گوارا نہیں کہ مرد کا رو یاں میلا ہو۔ تسلی و تشفی کا دھیان آخری سانس تک قائم ہے ؎

| | |
|---|---|
| سن لو گر اپنی جان ہے تو جہاں | رنج کرنا نہ میرا میں قربان |
| ہوتا نازک کمال ہے دل مرد | دے نہ اس کو خدا کبھی کوئی درد |
| جان دینا نہ گھونٹ گھونٹ کے تم | دل میں کڑھنا نہ مجھ سے چھوٹ کے تم |
| تا نہ ہو جائے دشمنوں کو جنون | رو کے کرنا نہ اپنا حال زبوں |
| جاننا ہم پہ ہو گئی قربان | کبھی آ جائے گر ہمارا دھیان |
| خواب دیکھا تھا کیجئو یہ خیال | دل میں کچھ آنے دیجیو نہ ملال |
| آج دل کھول کر گلے مل لو | پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو |

خوب سا آج دیکھ بھال لو تم  دل کی سب حسرتیں نکال لو تم
دل میں باقی رہے نہ کچھ ارمان  خوب مل لو گلے سے میں قربان
حشر تک ہو گی پھر یہ بات کہاں  ہم کہاں، تم کہاں، یہ رات کہاں
دل کو اپنے کرو ملول نہیں  رونے دھونے سے کچھ حصول نہیں

اپنی آنکھوں سے ندی نالے جاری کر رکھے ہیں۔ لیکن مرد کے چہرہ کی اداسی دیکھنا بھی گوارا نہیں ؎

رونا اس طرح سے تو زار و قطار  دشمنوں کو کہیں چڑھے نہ بخار
کر نہ رو رو کے اپنا حال زبوں  ارے ظالم ابھی تو جیتی ہوں
اشک ہوتے ہیں ناگوار ترے  تو نہ رو ہو گئی نثار ترے
ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں  یوں کہیں مرد دوے بھی روتے ہیں
تو سلامت جہاں میں رہ میری جان  نکلیں ماں باپ کے ترے ارمان
واسطے میرے اپنا دل نہ کڑھا  چاند سی بہو گھر میں بیاہ کے لا
ہے یہی لطف زندگانی کا  دیکھ سکھ اپنی تو جوانی کا

حسن بے ثبات کی نیرنگیاں ختم ہو رہی ہیں، عشق فانی کی ساری لذتیں ایک ایک کرکے یاد آرہی ہیں۔ اور چل چلاؤ کے وقت نفس پر ہجوم کر رہی ہیں ؎

کل گلے سے کسے لگاؤ گے  یوں کسے گود میں بٹھاؤ گے
ہم تو اٹھتے ہیں اس مکان سے کل  اب تو جاتے ہیں اس جہان سے کل
یاد آتی تمہیں دلاتے جائیں  ہاں گلے کے لئے لگاتے جائیں
دیکھ لو آج ہم کو جی بھر کے  کوئی آتا نہیں ہے پھر مر کے
ختم ہوتی ہے زندگانی آج  خاک میں ملتی ہے جوانی آج
سمجھو اس کو شب برات کی رات  ہم ہیں مہماں تمہارے رات کی رات
پھل اٹھایا نہ زندگانی کا  نہ ملا کچھ مزہ جوانی کا!

باغ عالم سے نامراد چلے — دل میں لے کر تمھاری یاد چلے
پھر کہاں ہم کہاں یہ صحبت یار — کرلو پھر ہم کو بھینچ بھینچ کے پیار
لہر پھر چڑھ رہی ہے کانوں کی — بوسنگھا دو تم اپنے بالوں کی
پھر ہم اٹھنے لگیں بٹھا لو تم — پھر بگڑ جائیں ہم منا لو تم
پھر لبوں کو ہلا کے بات کرو — پھر ذرا مسکرا کے بات کرو

یہ آخری راز و نیاز کتنی دیر؛ یہ زندگی کی آخری اختلاط کی گھڑی، جھلملاتی ہوئی چراغ کی آخری بھڑک کب تک؛ مادی لذتیں ختم اور جسم کی مزیداریاں ایک ایک کرکے تمام ہورہی ہیں، ناسوتی صحبتوں کا تار تار بکھرنے کو ہے، نفس کی ماری ہوئی لیکن غیرت دار، گنہگار مگر گناہ کی اقراری، عزت لٹائے ہوئے لیکن بہرحال پاس عزت رکھنے والی، پردہ نشین کی آنکھوں سے پردے ہٹ رہے ہیں، "آج ختم ہورہا ہے" "کل" شروع ہورہا ہے، حسن وجوانی نزاکت و رعنائی چہرہ کا رنگ در وغن سب کی منوڈمٹی ہی سے تھی اور سب مٹی ہی میں مل جارہی ہے رفاقت پر کوئی آمادہ نہیں حاضری اس دربار میں در پیش ہے جہاں ایک ایک بدنظری کا پورا پورا حساب درج ہے۔ سامنا اس مالک کا کرنا ہے جس نے خلاف قانون آنکھ اٹھانے پر بھی باز پرس رکھی ہے روبکاری حاکم کی جس عدالت میں ہے۔ اس سے بڑے بڑے شقی اور صالحین لرزتے رہتے ہیں۔ یہ نازک جسم اور نازک ترقلب رکھنے والی، گناہ کے بوجھ سے لدی ہوئی، اپنی جان اپنے ہاتھ سے لینے والی لڑکی اس نازک گھڑی میں کس کا سہارا پکڑے اور کس کی نگاہ کرم کی آس لگائے، اے ہر مشکل کو آسان کرنے والے اس دکھیاری کی مشکل کو تو ہی آسان کر، تیری ہی ستاری کا دامن اس عیب چادر کی پردہ پوشی کرسکتا ہے تیرے ہی بحر مغفرت کا ایک قطرہ اس بدنصیب کے نامۂ عمل کی سیاہیاں و صو ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ تیری یاد سے غفلت بے شبہ تھی۔ پر تیری حکومت سے سرکشی نہ تھی۔

نفس کی لغزشیں یقیناً تھیں، پر تیرے احکام سے جان کر بغاوت نہ تھی۔ ایمان کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی ڈھارس بندھاتی ہے، فاتحہ، قرآن خوانی اور دعائے خیر کی قدر "آج" مانگ چوٹی کے چھیلوں نے نہ کرتے دی۔ "کل" کے لئے سب سے قیمتی چیزیں یہی نظر آ رہی ہیں ؎

اب تم اتنی دعا کرو مری جان ۔۔۔ کل کی مشکل خدا کرے آسان
اگر آ جائے کچھ طبیعت پر ۔۔۔ پڑھنا قرآن میری تربت پر
غنچۂ دل مرا کھلایا جانا ۔۔۔ پھول تربت پہ دو چڑھا جانا
دیکھئے کس طرح پڑے گی کل ۔۔۔ سخت ہوتی ہے منزل اول
میرے مرقد پہ روز آنا تم ۔۔۔ فاتحہ سے نہ ہاتھ اٹھانا تم
گو میں دنیا سے روسیاہ چلی ۔۔۔ لیکن اپنی سی میں نباہ چلی
جی کو تم پر فدا کیا میں نے ۔۔۔ حق وفا کا ادا کیا میں نے

کانپتے ہوئے جسم، زار و قطار آنکھوں، لرزتی ہوئی زبان کے ساتھ دل کی بپتا بیان ہو رہی تھی کہ رات تمام ہو جاتی ہے۔ اور کمسن کے ڈوبتے ہوئے دل کی طرح آسمان کے تارے بھی ایک ایک کر کے ڈوبنے لگتے ہیں، صبح کا گھڑیال بجتا ہے اور اس کے ساتھ ناسوتی کرتوں کے جنجال میں پھنسے ہوئے جوڑے کی آخری ملاقات بھی اس عالم آب و گل میں ختم ہو جاتی ہے کلمہ کی آواز جو سنائی کان میں پڑی ہوئی تھی، وہی اس آڑے وقت پر کام آتی ہے ؎

ہو گیا فرطِ غم سے چہرہ زرد ۔۔۔ دست و پا تھرتھرا کے ہو گئے سرد
بید کی طرح جسم تھرایا ۔۔۔ سر سے پاؤں تک عرق آیا
باتیں جو کرتی تھی سو بھول گئی ۔۔۔ دم لگا چڑھنے سانس پھول گئی
بولی گھبرا کے رہیو اس کے گواہ ۔۔۔ اور کہا لا الٰہ الا اللہ

اب فقط ہے یہ خون بہا تیرا  بخش دیجیو کہا سنا میرا
سر سے لے کر بلائیں تا بقدم  بولی تم پر نثار ہوتے ہیں ہم
آگ لگ جائے وہ گھڑی کمبخت  بام پر آ گئی تھی میں کون سے وقت

یہ کہا اور سوار ہوگئی۔ چند گھنٹوں کے بعد محلہ میں شور و شین برپا ہوا، جا کر دیکھا تو سوداگر کے گھر کہرام مچا ہوا ہے گنہگار شریف زادی نے جو کہا تھا کر دکھایا۔ جوانی کی نیند مشہور ہے لیکن یہ زہر کھا کر وہ نیند سوئی تھی، جس میں قیامت سے قبل کوئی بیداری نہیں، یہ ہے "آغاز کی بدمستیوں کا "انجام" پھولوں کی سیج پر رات بسر کرنے والی کو آخری چادر، وہی کفن کی نصیب ہوئی۔ اتنی جلد! اس کمسنی میں! ایسی آنا فاناً!

جوان جہان اولاد، نازوں کی پالی اکلوتی اولاد، کون انسانی سینہ ہے جو اس داغ کو برداشت کرسکے؟ لڑکی ماں کی آنکھ کا تارا، باپ کے کلیجہ کا ٹکڑا، اندھیرے گھر کا چراغ، سات بیٹوں سے بڑھ کر پیاری تھی۔ گھر بھر میں کیا معنی محلہ بھر میں حشر برپا ہوگیا۔ بوڑھے والدین کی یہ حالت کہ کھڑے پچھاڑیں کھا کر گرتے تھے۔ اور بین کچھ اس درد کے ساتھ کر رہے تھے کہ اپنے تو خیر اپنے تھے، راہ چلتے بیگانوں کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں جنھوں نے گودوں میں کھلا کر پالا تھا، نہالچوں پر تھپک کر سلایا تھا، ساتھ کی کھیلی ہوئی سہیلیاں اور ہمجولیاں کوئی پردہ کے اندر، کوئی پردہ کے باہر دوپٹہ کا ہوش نہ چادر کی خبر، منھ پیٹنے بال نوچنے میں مصروف غسل وکفن کے بعد جب جنازہ مرتب ہوکر چلا ہے تو اس سج دھج کے ساتھ کہ بن بیاہی نامراد کے تابوت پر دھوکا بیاہی ہوئی دلہن کے ڈولے کا! بے شک دلہن ہی تھی، آج رخصتی اس دیس کو ہو رہی تھی جہاں سے پھر کوئی میکہ واپس نہیں آتا ؎

شامیانہ نیا زری کا ہے  نیچے تابوت اس پری کا ہے

سہرا اس پر بندھا ہے اک زرتار جیسے گلشن کی آخری ہو بہار
عود سوز اس کے آگے روشن تھے مرگئی پھر بھی لاکھ جوبن تھے
بھیڑ تابوت کے تھی ایسی سات جیسے آئے کسی دلہن کی برات

خیر، اور تو جس پر جو بیت رہی تھی، بیتی ہی اس ماتا کی ماری کا کیا حال تھا، جس کی ہری بھری گود ابھی خالی کرائی گئی تھی، عمر بھر کی کمائی دم کے دم میں واپس لے لی گئی تھی، کلیجہ ابھی ابھی تیروں سے چھد چکا تھا، کس انسانی قلم میں قدرت ہے کہ اس کے داغ دل کا نقشہ صفحۂ کاغذ پر کھینچ سکے، آہ! کہ جس کے دل میں بیٹی کی مانگ بھرنے کا ارمان ڈالا گیا تھا، اسی کے ہاتھوں اس لاڈلی کو کفن پہنایا جا رہا ہے، آہ! کہ جو آنکھیں بیٹی کا سہاگ دیکھنے کے انتظار میں نور حاصل کر رہی تھیں، انھیں کو اسے مٹی کے ڈھیر کے نیچے دفن ہوتے دکھا کر بے نور کیا جا رہا ہے۔

نواب مرزا تجھ پر رحمت، تیری روح پر رحمت کہ تو نے کوکھ اجڑنے والی ماں کے جذبات کی تصویر بھی کاغذ پر اتار کر رکھ دی ہے۔ ماں کے منہ سے یہ بول نکل رہے ہیں۔ یا دل و جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر آنکھ اور زبان کی راہ سے خارج ہو رہے ہیں:

تیری میت پہ ہو گئی میں نثار کم سخن ہائے میری غیرت دار
دل پہ جو گذری کچھ بیان نہ کی کچھ وصیت بھی میری جان نہ کی
کچھ نہیں ماں کی اب خبر تم کو کس کی یہ کھا گئی نظر تم کو
دل ضعیفی میں میرا توڑ گئیں بٹیا اماں کو کس پہ چھوڑ گئیں
تازہ پیدا جگر پہ داغ ہوا گھر مرا آج بے چراغ ہوا
دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے جی سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے
زہر دیدے کوئی تو کھا جاؤں یا زمیں شق ہو میں سما جاؤں
داغ تیرا جگر جلاتا ہے چاند سا مکھڑا یاد آتا ہے

بیاہ تیرا رچانے پائی نہ میں کوئی منت بڑھانے پائی نہ میں
تیری صورت کے ہوگئی قربان چلیں دنیا سے کیسی پر ارمان
ہوگئیں کس بات پر خفا بولو اماں واری ذرا جواب تو دو
بولتی تم نہیں پکارے سے اب جیوں گی میں کس سہارے سے
کیا قضا نے جگر پہ داغ دیا آج گھر میرا بے چراغ کیا
نکلا ماں باپ کا نہ کچھ ارمان ہائے بیٹی نہ تم چڑھیں پروان
ایسی اماں سے ہوگئیں بیزار لی نہ خدمت بھی پڑکے کچھ بیمار
عمر کٹنی تھی ایسے صدمہ میں ٹھوکریں تھیں بدی بڑھاپے میں

مشرق کے بدنام سخن گو، اُردو کے بدنام شاعر رخصت! تو دردِ دل رکھتا تھا تیری یاد بھی درد والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی، تو نے موت کو یاد رکھا تیرے نام پر بھی موت نہ آنے پائے گی تو نے غفلتوں اور سرمستیوں کی داستان کو خوب پھیلایا شاید کسی کی رحمت بے حساب پر تکیہ کرکے لیکن اپنی غافلوں اور سرمستوں کو موت و انجام کی یاد دلاکر بھی خوب رلایا، کسی کی عظمت بے پایاں کا خوف کرکے عجب کیا کہ خدائے آمرزگار، اس عالم کا ستار اور اس عالم کا غفار تیری خطاؤں اور لغزشوں کو اپنے دامن عفو و مغفرت کے سایہ میں لے لے اور تیرے کلام کے درد و عبرت، تیرے بیان کے سوز و گداز کا اجر بھی تجھے عطا کرے، اپنی ہی رحمت بے نہایت کی مناسبت سے، اپنے ہی کرم بے حساب کے حساب سے!

# الفاظ کا جادو[1]

اگر آپ کا تعلق اونچے طبقہ سے ہے تو کسی "سرا" میں ٹھہرنا آپ کے لئے باعث توہین، لیکن کسی "ہوٹل" میں قیام کرنا ذرا بھی باعث شرم نہیں، حالانکہ دونوں میں کیا فرق بجز اس کے ہے کہ "سرا" مشرقی ہے، ہندوستانی ہے، دیسی ہے اور "ہوٹل" مغربی ہے، انگریزی ہے، ولائتی ہے۔ کوئی اگر یہ کہہ دے کہ "سرا" کے فلاں "بھٹیارے" سے آپ کا یارانہ ہے تو آپ اس کا منہ نوچ لینے کو تیار ہو جائیں لیکن فلاں ہوٹل کے منیجر سے آپ کا بڑا ربط وضبط ہے اسے آپ فخریہ تسلیم کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ سرا کے "بھٹیارے" اور ہوٹل کے "منیجر" کے درمیان بجز ایک کے دیسی اور دوسرے کے ولائتی ہونے کے اور کوئی فرق ہے؟ کسی مدرسہ میں اگر آپ "مدرس" ہیں تو بات کچھ معمولی ہی ہے، لیکن کسی "کالج" میں آپ "لکچرر" یا "پروفیسر" ہیں تو معزز ہیں صاحب وجاہت ہیں حالانکہ اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے "مدرس" اور "پروفیسر" ایک ہی چیز ہیں۔

ندوہ کے "دارالاقامہ" میں اگر آپ قیام پذیر ہیں تو آپ کا دل کچھ خوش نہیں ہوتا لیکن اسی "دارالاقامہ" کا نام جب آپ "شبلی ہوسٹل" سنتے ہیں تو آپ کا چہرہ فخر و خوشی سے دمکنے لگتا ہے۔ "مدرسہ" میں اگر آپ پڑھتے یا پڑھاتے ہیں تو خود اپنی نظروں میں آپ بے وقعت ہیں! لیکن اگر آپ کا تعلق کسی "کالج" سے ہے تو پھر آپ سے زیادہ معزز کون ہے؟ اب ہر مدرسہ طبیہ "طبیہ اسکول" اور مدرسہ تکمیل الطب اور "مدرسہ" منبع الطب، اب "تکمیل الطب کالج" اور "منبع الطب" "کالج" ہیں۔ مدرسہ وہاجیہ طبیہ کا

---

[1] سچ جلد، نمبر ۲، مورخہ ۲۶ر جون ۱۹۳۱ء

زمانہ گیا۔ اب اس کا صحیح نام طبیہ دیا جیہ "کالج" ہے۔ طبی درسگاہوں کو چھوڑیئے، خود دینی درسگاہوں کا کیا حال ہے ؟ وہ دن گئے جب زبانوں پر "مدرسۂ چشمۂ رحمت" کا تذکرہ تھا۔ اب وہ چشمۂ رحمت کالج ہے اور وہاں کے صدر مدرس "پرنسپل" صاحب ہیں فرنگی محل کے مدرسۂ نظامیہ فرنگی محل کے سب سے بڑے اُستاد کو "صدر مدرس" ذرا کہہ کے تو دیکھئے آپ کی غلطی کی تصحیح کی جائے گی کہ ان کا عہدہ اب صدر مدرسی کا نہیں "پرنسپلی" کا ہے۔

کوئی آپ سے کہے کہ یہ کیا آپ گلی میں کھڑے ہو کر "گلی ڈنڈا" کا تماشہ دیکھ رہے ہیں تو آپ شرما سے جائیں گے، لیکن جب آپ "کرکٹ" یا "فٹ بال" یا ہاکی کا میچ کھلے میدان میں دیکھ رہے ہوں گے تو اس وقت نہ آپ اپنے بڑوں سے شرمائیں گے نہ چھوٹوں سے بلکہ عجب نہیں کہ گراں قیمت ٹکٹ خریدنے کے بعد دوسروں کی طرف اکڑ کر دیکھیں۔ مینڈھے لڑاتے ہوئے یا بٹیر بازی یا مرغ بازی کرتے ہوئے اگر آپ کہیں پکڑ لئے گئے تو اپنے کو کسی کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہ سمجھیں گے۔ لیکن جب شہر میں باکسنگ کا مقابلہ ہوگا یا کوئی HEAVY WEIGHT CHAMPION آجائیں گے تو ان کا تماشہ دیکھنا تہذیب و روشن خیالی میں داخل۔ کہیں چوری چھپے "رہس" یا "نوٹنکی" دیکھنے کھڑے ہو جایئے تو خود آپ کی ثقافت اور وضعداری آپ پر لاحول پڑھنے لگے۔ لیکن تھیٹر میں آدھی آدھی رات بے تکلف بسر کیجئے کہ "ڈراما" جیسے فن شریف کی شرافت وعظمت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے ! اپنے دیس کے کسی بھانڈ، کسی سازندہ کسی ڈھاڑی سے، اگر آپ سے شناسائی ہو گئی ہے تو اس کا ذکر آپ اپنے دوستوں اور بے تکلف ہم عمروں کے سامنے بھی کچھ جھینپ ہی کر کرتے ہیں۔ لیکن "چارلی چیلپن اور "میری پکفرڈ" کے کمالات اور "آرٹ" کی جتنی داد، جی چاہے دیجئے، بھری محفلوں میں، بزرگوں اور استادوں کے مجمع میں اور اخبارات کے صفحات میں آپ کی نقادی

ہی کی را دلی جائے گی! "مونٹوں" کا پیشہ بھی بھلا کوئی عزت کا پیشہ ہے اور خدا نخواستہ آپ سے کسی نٹ یا نٹنی سے ملاقات کیوں ہونے لگی، لیکن وہی قلابازیاں کھانے والے جب سرکس والے اور سرکس والیاں بن کر آپ کے سامنے آتے ہیں، تو نہ آپ اُنسے ملنے میں شرماتے ہیں۔ نہ تعلقات بڑھانے میں۔

جوئے یا جواریوں سے ظاہر ہے ہماری شرافت کو کیا تعلق ہو سکتا ہے کوئی ہمیں جواری کہہ دیکھے۔ اپنی جان اور اس کی جان ایک کردیں، لیکن گھوڑ دوڑ کے دنوں میں اور کارنیوال کی راتوں میں، دن دہاڑے اور بجلی کی روشنی میں یہی ذلت ہمارے لئے عین عزت بن جاتی ہے اور بڑے بڑے رئیس اور معزز نہ جوئے کی بازی لگاتے ہوئے شرماتے ہیں اور نہ اپنے کو ریس باز کہلاتے۔ نخاس یں کسی کباڑیئے کی دوکان پر بول تول کرنا ہماری عزت و شرافت کے لئے باعث ننگ، لیکن مال روڈ پر "پیک ایلن" کی کوٹھی پر گشت لگانے میں نہ کوئی عار ہے نہ شرم، اس لئے کہ "پیک ایلن" صاحب کوئی کباڑیے تھوڑا ہی ہیں "آکشنر" اور "نیلامیے" ہیں۔ چوک اور امین آباد میں کسی حلوائی کی دوکان سے پوری مٹھائی اپنے ہاتھ سے خرید لیجئے تو نظروں بچا بچا کر، لیکن حضرت گنج میں "ونیلو" کی دوکان کے سامنے اپنا موٹر کھڑا کرکے کیک و پیسٹری کی خریداری بہ نفس نفیس، بلا جھجک فرمائیے، اس لئے کہ "ونیلو" حلوائی نہیں، "کنفکشنر" ہے، نظیر آباد کے کسی چوراہے پر کسی شربت والے کی دوکان سے فالودہ کا گلاس خریدنا آپ کی خودداری کے منافی، لیکن حضرت گنج میں صاحب کی جگمگاتی دوکان پر آئس کریم نوش فرمانا آپ کی عزت اور شان کے عین مطابق، کسی نانبائی کی دوکان کا نام اگر "ریسٹوران" پڑجائے تو وہی عار فخر میں تبدیل ہوجائے "بنانائی" بیچارہ جب تک محض نائی ہے یا حجام، اس کے استرے اور کسوت کے آگے سر جھکانا آپ کیونکر گوارا فرما سکتے ہیں۔ لیکن وہی جب اپنے کو ہیئر ڈریسر Hair Dresser کہلانے لگے اور اپنی چوراہے کی

دوکان پر "ہیئر کٹنگ سیلون" کا سائن بورڈ لگا دے تو وہی ناگوار آپ کے لئے خوشگوار دلپسندیدہ بن جائے۔ عدالت کا پیادہ چپراسی "چپراسی" یا "مذکوری" بے حقیر و ذلیل ہے لیکن وہی پیادہ اگر "بیلف" کہہ کر پکارا جائے تو معزز ہے اور آپ کی زبان پر محض بیلف نہیں بلکہ "بیلف صاحب" آنے لگے کوئی چمار یا موچی اس قابل کب ہوتا ہے کہ آپ اسے منہ لگائیں، لیکن وہی رذیل اگر کسی ٹینری کا مالک کہلانے لگے تو معاً اسکی رذالت آپ کی نگاہ میں عزت و شرافت سے بدل جاتی ہے، اور دنیا کے سب سے بڑے موچی باٹا کی قوم سے تعلق رکھنا توہین و ذلیل اعزاز بنی کا باعث کار یا مہاجن بڑے سے بڑا ہوا آپ کی نظر میں محض "بنیا" ہے، لیکن وہی بنیا اگر وہیں کسی بنک کا منیجر ہو جائے یا اپنے کو بنکر کہلانے لگے تو دیکھئے اس کا مرتبہ دم بھر میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے کسی رئیس کا "مصاحب" آپ کی نظر میں، اخلاقی حیثیت سے بے عملی، خوشامد پسندی اور خود فروشی کا مجسمہ ہے۔ لیکن صاحب کے "پرائیوٹ سکریٹری" اور "اے، ڈی، سی" کا نام ادھر آیا اور ادھر معاً آپ کی نظروں میں کارکردگی ومستعدی، رعب و دبدبہ کی تصویر پھر گئی! پنچایت کا نام آیا اور آپ کے ذہن نے نیچ قوموں کا تصور شروع کر دیا، لیکن ادھر پنچایت کے بجائے پارلیمنٹ اور اسمبلی، کونسل اور کارپوریشن کے الفاظ بولے گئے اور آپ کا ذہن ان فرنگی پنچایتوں کی بلندیوں پر رشک کرنے لگا۔ کوئی مولوی غریب اگر عالمگیری اور شامی کے جزئیات فقہی کا حافظہ ہے تو غبی ہے۔ کودن ہے۔ کندہ ناتراش ہے۔ محض ملاّ نا ہے۔ لیکن اگر کسی ایڈوکیٹ یا بیرسٹر صاحب کو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے نظائر ازبر ہیں۔ تو ان کی قابلیت خوش دماغی اور ذہانت کے اعتراف میں سب سے آگے آپ ہی ہیں۔

فسانۂ عجائب اور طلسم ہوشربا کے نام آج مجال ہے کہ کوئی زبان پر لا سکے لیکن لندن اور برلن، پیرس اور نیویارک سے کتنے ہی نئے نئے عجائب افسانے اور کتنے ہی

ہوشربا طلسمات رومانی "ناولوں کے نام سے جاسوسی افسانوں کے نام سے "سنسنی خیز" خبروں کے نام سے صاعقہ اثر ڈراموں کے نام سے اور خدا معلوم کن کن ناموں سے ہر سال اور ہر ہفتہ، اور ہر روز اور ہر صبح اور ہر شام شائع ہوا کریں۔ ان سے باخبر رہنا اور پوری دلچسپی و انہماک کے ساتھ ان کے نشر و اشاعت میں، ان کے پڑھنے پڑھانے میں لگے رہنا علم و روشن خیالی کی دلیل اور مہذب و تعلیم یافتہ ہونے کی سند! کوئی آپ کو صلاح دے کہ "لوہاری" کا پیشہ اختیار کیجئے، تو آپ اسے گالی سے کچھ ہی کم سمجھیں لیکن "ٹیکنیکل انجنیری" کے عہدہ کی طرف آپ خود لپک لپک کر بڑھ رہے ہیں۔ "جراح" کے لفظ سے جو تخیل آپ کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ کس درجہ پست ہے، لیکن "سرجن" کا نام لینے سے اس پستی میں کتنی بلندی آجاتی ہے محلہ اور پڑوس کے "جلاہے" آپ کے خیال میں پست وادنیٰ۔ لیکن کپڑا بننے والے اگر لنکا شائر کے ہیں، تو کیا ان کی بابت بھی آپ کا یہی خیال ہے؟ "بزاز" گز ہاتھ میں لئے اور مزدور کے سر پر گٹھری اٹھائے شہر میں پھیری کرتے پھرتے ہیں۔ ان کی کوئی عزت و وقعت نگاہ میں نہیں، لیکن عمدہ کپڑا بیچنے والے اگر مانچسٹر کے باشندے ہیں۔ تو بس معزز ہیں، بلند ہیں۔ "بزرگوں" کے سالانہ فاتحے منانا دلیل حمق و علامت وہم پرستی، لیکن فلاں کالج کے احاطے میں "فاؤنڈرس ڈے" یا "یوم تاسیس" دھوم دھام سے منانا، دلیل دانش و برہان روشن خیالی۔ لکھنؤ کے چوک یا دہلی کی چاوڑی کی کسی پیشہ ور کا نام آپ بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ ہرگز اپنے کسی بزرگ کے سامنے نہ لیں گے۔ نہ کسی کا ناچ مجرا دیکھنے کھلم کھلا تشریف لے جائینگے لیکن ڈرائنگ روم میں گھر کے سب مردوں اور عورتوں لڑکوں لڑکیوں کے سامنے ریڈیو سے بے تکلف آپ فلاں "بائی جی" اور فلاں "جان" کے نغموں ٹھمریوں سے لطف اٹھائینگے اور فلم ایکٹریس، جو بھی آپ کے دل میں جگہ کر لے گی، پوری بیباکی سے آپ اس کے

چرچے ہر چھوٹے بڑے کے سامنے کریں گے۔

کوئی کہاں تک گنائے اور ناموں اور لفظوں کی کتنی لمبی فہرست تیار کرے، نمونہ کے لئے یہ کافی بلکہ کافی سے کچھ زائد ہی ہیں۔ اپنی واقفیت کی دنیا میں خود نظر دوڑائیے اور دیکھ لیجئے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں، معاشرت و معاملت کے ہر گوشہ میں فرنگیت کا کتنا رعب ہم پر، اور آپ پر چھایا ہے۔ حقیقت ایک معنی و مفہوم متحد، لیکن جو لفظ اور جو نام، فرنگیت کے راستہ سے "صاحب" کے رشتہ سے، آپ کے کانوں تک پہنچے ہیں ان میں ان کے دیسی مترادفات سے، کتنی زیادہ عظمت، کتنی زیادہ اہمیت، کتنی زیادہ بلندی ہمارے دلوں اور دماغوں نے غیر محسوس طور پر قبول کرلی ہے! اگلوں نے بہت کیا تو یہی کیا تھا کہ ملک فتح کر لئے، قلعے سر کر لئے، فوجوں کو میدان جنگ میں شکست دے دی۔ اس سے زیادہ نہ چنگیز سے کچھ بن پڑا نہ ہلاکو سے، نہ دارا سے نہ سکندر سے، یہ شرف مخصوص اسی دور یا جوجی کے لئے اٹھا رہا تھا کہ جسم کے ساتھ ساتھ دل و دماغ بھی فتح کر لئے جاتے ہیں اور ہاتھوں پیروں کے علاوہ عقلوں، دماغوں اور بصیرتوں سے بھی خط غلامی لکھا لیا جاتا ہے یہاں تک کہ غریب محکوموں کے پاس، خیر و شر، حسن و قبح، ہنر و عیب کا معیار لے دے کے بس یہی ایک رہ جاتا ہے کہ "صاحب" کی چشم التفات کدھر ہے؟ عزت بھی "صاحب" کی دی ہوئی، اور دولت بھی سرکار کی رحمت کی ہوئی۔ دین بھی وہیں کا عطیہ، اور دنیا بھی وہیں کی بخشش، اب نہ ہندو ہندو ہے، نہ مسلمان مسلمان، سب رعایائے سرکار" اب نہ کوئی اللہ دین ہے نہ رام دین بلکہ سب کے سب چھپٹ چھاکر "صاحب دین"

الفاظ عمومی کو چھوڑئیے۔ ستم یہ ہے کہ اعلام اور اسما معرفہ تک یورپ زدگی کی وبا سے محفوظ نہیں۔ میاں "کلو" کو آپ نے اپنے ہاں جب دیکھا اکڑ بانی ہی کرتے پایا۔ لیکن میجر بلیک (BLACK) آپ کے شہر کے سول سرجن ہیں! "کلوا ہتر" آپکے

محلہ ہی میں رہتا ہے، لیکن پروفیسر "بلیکی" (BLACKEE) یونیورسٹی کے ایک ممتاز پروفیسر ہیں! "لالہ گھاسی رام" بیچارے "کانجی ہاؤس" کی محرری سے عمر بھر آگے نہ بڑھ سکے، لیکن بریگیڈیر جنرل "ہے" (HAY) برطانوی فوج کے ایک مشہور و معروف افسر ہیں! "میاں رمضانی" اور میاں شبراتی کی ساری عمر خدمت گاری میں گذری لیکن مسٹر "مے" (MAY) اور ڈاکٹر فرائڈے (FRIDAY) پارلیمنٹ کے نامور ممبر ہیں! "مٹھوا" کہار اور "طوطا" کلوار آپ کی بستی ہی میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں لیکن سر "جان پارٹرج" (PARTRIDGE) آپ کے صوبہ کے گورنر تھے۔ مسٹر "کاک" (COCK) اس وقت تک آپ کے ضلع کے کلکٹر ہیں اور "سوان" (SWAN) صاحب ابھی تبدیل ہو کر کمشنری پر گئے ہیں! آپ کی ماما کا لڑکا "شیرا" بیچارہ اب تک چپراسی کی جگہ امیدواری کر رہا ہے لیکن "بل" صاحب (BULL) ترقی پا کر کمشنر ہو گئے اور مسٹر لیمب (LAMB) اور مسٹر "کڈ" (KID) آپ ہی کے ضلع میں حاکم بندوبست اور جائنٹ مجسٹریٹ ہیں۔ "دریاؤ سنگھ" غریب کو لائن جمعداری سے آگے بڑھنا نصیب نہ ہوا۔ سر جان لیک (LAKE) دیکھتے دیکھتے ای، آئی، آر کے ایجنٹ ہو گئے! "لالہ لوہاری مل" کے چلائے عرائض نویسی کا کام بھی نہ چلا، جسٹس اسمتھ (SMITH) ہائی کورٹ کی ججی پر پہنچ گئے! "شیخ جھاؤ" کی زندگی نوربافی کرتے کرتے ختم ہو گئی۔ سر چارلس "وڈ" (WOOD) حکومت ہند کے ہوم ممبر ہیں! جنگی گھسیارہ بیچارہ عمر بھر گھاس ہی چھیلا کیا، سر جان فارسٹر (FORESTER) سنا ہے کہ امریکہ میں برطانیہ کے کونسل جنرل ہو گئے۔

---

# جھوٹ میں سچ[1]

قصہ گل بکاؤلی، بھی کوئی کتابوں میں کتاب ہے؟ عجب نہیں کہ ایک سنجیدہ مقالہ میں اسکا نام دیکھتے ہی بہت سے ہونٹوں پر حقارت کا تبسم آجائے۔ لیکن کیا ہرج ہے، اگر کبھی کبھار، خلاف وضع صحبتوں کا بھی تحمل کرلیا جائے اور پھر دنیا میں یوں بھی تو ہوا ہے، کہ پھٹی پرانی گدڑیوں کے اندر سے لعل و جواہر نکل آئے ہیں۔

کوئی بادشاہ کہیں کے زین الملوک نام ہیں۔ ان کے چار لڑکے پہلے سے موجود ہیں پانچواں تاج الملوک پیدا ہوتا ہے۔ ایک مدت کے بعد اس پر نظر پڑتے ہی بادشاہ اندھا ہو جاتا ہے طبیبوں نے کہا کہ شفا صرف اس پھول کے لگانے سے ممکن ہے جو بکاؤلی پری کے چمن میں ہے۔ چاروں نوجوان شہزادے اس کی تلاش میں روانہ ہوتے ہیں، اور سفر کرتے کرتے ایک شہر بیسوا کے دروازہ پر پہنچتے ہیں۔ مکان کے اندر داخلہ کی فیس ایک لاکھ زر نقد ہے۔ دولت کے نشہ میں اندھے شہزادے اس کے مکان پر پہنچ، اطلاع کے نقارے پر چوب لگاتے ہیں۔ کتاب کوئی اخلاق کا پند نامہ نہیں عشق و عاشقی کا افسانہ ہے، چاہئے تھا کہ مصنف بیسوا کے ذکر میں کھل کھیلتا، اور اس "پری جمال" کے حسن و عشق کی مصوری اس انداز سے کرتا کہ پڑھنے والے نوجوانوں کے دل میں شوق و اشتیاق کی آگ بھڑک اٹھتی، لیکن برعکس اس نے دیکھئے تو سہی کہ اس موقع پر نظر عبارت ذیل سے دو چار ہوتی ہے:۔

"سنتے ہی اس مکارہ دوراں نے دل میں کہا کہ الحمد للہ مدت مدید کے بعد

---

[1] سچ جلد ۸ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء

ایسے موٹے تازے شکار نے میرے جال میں آنے کا ارادہ کیا اغلب ہے کہ دام میں پھنسے۔ پھڑک پھڑک کر مرے۔ نقل مشہور ہے کہ یہ طائفہ اسی تردد میں رہتا ہے کہ کوئی عقل کا اندھا گانٹھ کا پورا ملے، سو خدا نے ویسے ہی شخص بھیج دئے "

ان الفاظ کو خصوصاً جو عبارتیں زیر خط کردی گئی ہیں، انہیں پڑھنے کے بعد فرمائیے کہ شوق و اشتیاق کی آگ کچھ بھڑکی، یا جو تھی وہ بھی ٹھنڈی ہوکر خاکستر بن گئی؟ کتاب "ترقیوں" کے دور سے بہت قبل کی تصنیف ہے، مصنف، تاریکی کو روشنی عیب کو ہنر، زہر کو تریاق کہہ کر پیش کرنے کے "آرٹ" سے ناواقف ہے۔ وہ بدی کے چہرہ پر حسن و زینت کا نقاب ڈال کر اسے پیش نہیں کرتا، وہ بدی کی جب مصوری کرتا ہے، تو بانگ پکار کر کہہ بھی دیتا ہے کہ یہ بدی ہے للٰلہ اس کے قریب میں نہ آجانا بسوا ایک مخصوص چالاکی کے ساتھ شطرنج کا کھیل کھیل کر اپنے ہاں آنے والے امیرزادوں کو ہرا دیتی تھی، اور پھر ان کی جائیداد لے لیا، انہیں قید میں ڈال دیتی تھی۔ یہی ماجرا ان چاروں شہزادوں کو بھی پیش آیا۔ بالآخر پانچویں شہزادے تاج الملوک نے انہی چالبازیوں کے کرتب سے بسوا کو بھی مات کر دیا۔ اس کی قید سے اپنے بھائیوں کو چھڑایا۔ اور یہ ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ یہ چاروں شہزادے اپنے نابینا والد کی آنکھ کے علاج کیلئے تلاش گل بکاؤلی میں گھر سے نکلے تھے۔ شرق کی بازاری کتاب کے مصنف کا قلم ان واقعات سے نتیجہ یہ نکالتا ہے :-

"اے عزیز، تو نے معلوم کیا کہ یہ میں نے کیا کہا۔ اس بات کا حاصل یہ ہے کہ دل عرش منزل تیرا جو رونق بخش تخت شاہی کا اور دیکھنے والا مادہ اور مجرد کا تھا، جب اس کی آنکھ اس خلقت ناپاک پر پڑی اسکی بصارت کو زنگ لگا، اور دیدۂ روشن تاریک ہوگیا، اب اٹھ اور سرمۂ بینائی ڈھونڈھ، یعنی گل مراد کی تلاش میں کوشش کر، لیکن راہ میں دنیائے

عیارہ کی بازی میں کہ تختہ فریب کا دھرا ہوا ہے، مشغول نہ ہونا مبادا وہ فاحشہ تجھ کو پہلے زیفتہ کرکے بتا دے اور بعد اس کے مکر کی بلّی اور فریب کے چوہے کی مدد سے اچھا پانسہ اپنے حسب مرضی پھینکے اور اچانک تیرے توکل کا سرمایہ آخر ہو جائے، تب تجھ کو دائم الحبس کر رکھے۔ اگر تو صبر کرنے والے کی اعانت سے اس سکارہ کی بازی، طلسم کو درہم کردے تو وہ فاحشہ جو بادشاہوں اور گردن کشوں کی ہم نشیں ہے تیری فرمانبردار لونڈی ہو کر چاہے کہ تجھ کو اپنے حسن و جمال پر لبھائے، پھر اگر تو اس کے منھ پر الفت سے نگاہ نہ کرے تو یقین ہے کہ گل مراد کے دامن تک تیرا دست رس ہو۔"

ضمناً ایک حکایت ایک سادہ لوح برہمن کی آگئی ہے جس نے ایک بندھے اور جکڑے ہوئے شیر کی زنجیریں کھول دی تھیں، اور شیر نے خود اسی پر حملہ کر دیا تھا تاج الملوک حکایت اس بیسوا کو سناتا ہے۔ اور معاً بعد ایک ناصح مشفق بن جاتا ہے

"اے عزیز سچ ہے، جو کوئی بے صبری اور فریاد اپنے نفس کی، جو مثل شیر جسم کے پنجرہ میں ہے سنے اور اس کے حال پر رحم کرکے صبر و توکل کی رسی، اس کے ہاتھ پاؤں سے بے محابا کھول دے، تو بہرصورت آپ کو اس کا لقمہ بنائے۔ مگر خضر راہنما کی دستگیری سے بچے تو بچے لے بیسوا، یہ ذکر میں نے اس واسطے کیا جو تو جانے کہ طاقت جسمانی، طاقت روحانی پر زیادتی نہیں رکھتی، اب تجھے یہ لازم ہے کہ پورب پچھم کے شہزادوں کو، جو تو نے اپنے مکر و فریب سے قید کیا ہے، چھوڑ دے، حق تعالیٰ تجھ کو بھی دوزخ کی قید سے نجات دے گا۔"

یہ آپ کوئی مبتذل و عامیانہ افسانہ پڑھ رہے ہیں، یا کسی عارف کے حلقۂ

معرفت میں بیٹھے ہوئے ہیں؟ یہ مشرق کی گری ہوئی تصنیف ہے، آپ اس کے مقابلہ میں مغرب کے کسی بلند پایہ قصہ کو تولا لیجئے۔

تاج الملوک جب آگے بڑھنا چاہتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گل بکاؤلی" قلعۂ بکاؤلی کے اندر ہے اور قلعہ کے پہرہ پر اٹھارہ ہزار دیو مقرر ہیں۔ شہزادہ اس سے ہراساں اور بے آس نہیں ہوتا۔ رفتہ رفتہ دیووں کو رام کرتا ہے، اور دیووں کی ایک بوڑھی سردارنی حمالہ کا دل اس حد تک اپنی مٹھی میں لیتا ہے کہ وہ اپنی پروردہ شہزادی محمودہ کا نکاح اس کے ساتھ کر دیتی ہے افسانہ نگار کا ذہن اس مجاز سے حقیقت کی جانب منتقل ہوتا ہے :۔

"اے عزیز روشنی چشم ظاہریں کی سات پردوں میں ہے اور تجلی باری تعالیٰ کی نور دیدۂ اولیا ہے۔ ستر ہزار پردے میں ہے۔ اگر یہ ارادہ ہو کہ وہ پردے درمیان سے اٹھیں تو پہلے اس بڑے نگہبان دیونفس کا حجاب بیچ سے اٹھا کر اس کو بس میں کر، کہ وہ لعین اپنی کج روی کو چھوڑ کر محمودہ[1] کے مقام میں پہونچا دے، لیکن یہ بات یاد رکھ اگر دیو سے الٹا کھچئے تو سیدھا پڑے "

بکاؤلی بیدار ہوتی ہے، اور اس عزیز دعزیز الوجود دھول کو اپنے باغ سے غائب پاکر، سخت پریشان اور ملول ہوتی ہے، پری خانہ کی کنیزیں اور خواص صدہا کی تعداد میں ہیں، سب کی تلاش وسعی بیکار ثابت ہوتی ہے، بالآخر بکاؤلی خود اس "چور" کی جستجو میں نکلتی ہے۔ اپنے کو نوجوان مرد کی ہیئت میں تبدیل کرتی ہے، اور تلاش وجستجو میں طرح طرح کی تکلیفیں اور ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کرتی ہے افسانہ نگار

---

[1] تلمیح ہے قرآن پاک کے "مقاماً محموداً" کی جانب

اس موقع کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور آئین افسانہ نگاری کو بھول بھال یوں درس معرفت شروع کر دیتا ہے:-

"سبحان اللہ کیا الٹی بات ہے کہ معشوق طالب عاشق کا ہوا، اور عاشق اسکا مطلوب، لیکن نظر تحقیق سے جو غور کرے تو سیدھی لگے، کیونکہ جبتک معشوق کو خواہش عاشق کی نہ ہو، اُس کی چاہت اکارت ہے اور کوشش بے فائدہ۔ آتش طلب کی جو عاشق کے گریبان سے مشتعل ہے فی الحقیقت لگائی ہوئی معشوق کی ہے ؎

عشق اول در دل معشوق پیدا می شود
گر نہ سوزد شمع، کے پروانہ شیدا می شود

بات بڑھ گئی، قلم کہتا ہے اے شخص بس کر، میں نے لکھنے میں بہت سی کوشش کی، اور ہاتھ اپنی سعی کا دعویٰ کرتے ہیں کہ قلم سے کیا کیا ہم نے لکھا۔ بازو اپنے تردد کا دم مارتا ہے کہ دست و قلم سے کیا ہوا، جو کچھ کیا سو میں نے کیا۔ غرض اس طرح اسباب تحریر کے بڑھے، اور ایک کو ایک پر فوقیت ہوتی گئی، دفعتہً ایک ایسا سبب پایا گیا کہ وہ محتاج کسی کا نہ تھا، پس اے عزیز اگر تو بتا دے کہ فی الحقیقت لکھنے میں کس کی سعی ہے، اور ظاہر میں کس کی، تو میں بھی عاشق و معشوق کی سعی کا جواب دوں "

کیا اب بھی آپ کی یہ رائے قائم ہے کہ اس عامیانہ قصہ کا ذکر ایک سنجیدہ پرچہ میں لانا، نازیبا اور بے محل تھا؟

بادشاہ، شہزادہ تاج الملوک کی صورت سے بیزار ہو چکا تھا، اسے ملک بدر کر چکا تھا لیکن شہزادہ نے اپنی خدمت گزاری اور سعادت مندی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا مہینوں بلکہ برسوں کی سختیاں اٹھا کر گل بکاؤلی لے کر آیا۔ راہ میں چاروں بڑے بھائیوں

نے اس سے چھین کر اس کارنامہ کو اپنی جانب منسوب کرلیا۔ بادشاہ اس وقت تو چاروں سے بہت خوش ہوگیا۔ کچھ مدت کے بعد تاج الملوک بھی پایۂ تخت کے قریب پہونچا اور دیوں کی مدد سے اس کے مقابل ایک دوسرا شہر نہایت ہی پررونق آباد کیا، اور پورے شاہانہ کروفر کے ساتھ وہاں حکومت شروع کی۔ بادشاہ کو خبر پہنچی۔ قاصد اور وزیر سلطنت کو دریافت حال کے لئے بھیجا۔ انھوں نے واپس ہوکر بہتر سے بہتر اطلاعیں پہنچائیں۔ آخر بادشاہ خود ملنے آیا، اور یہ پہچان کر کہ اپنا ہی لخت جگر ہے، بے حد مسرور ہوا، گلے سے لگالیا، ہر طرح کے اعزاز واکرام سے سرفراز کیا اور وہ چاروں بھائی مقہور ومردود قرار پائے۔ قصہ کے اس جھوٹ میں اب سچ کا پیوند ملاحظہ ہو:۔

"اے عزیز تیری عزت بادشاہ کے دربار میں تیری خدمت کے موافق ہوگی، چاہئے کہ شہزادے کے مانند کارشائستہ کرے تو تیری محبت شاہ کے دل میں موثر ہو، اور پیغام اپنی ملاقات کا تجھے بھیجے، بلکہ بے باکانہ آپ ہی تیرے پاس چلا آئے اور بے اختیار تیرا سر اپنی چھاتی سے لگائے اگرچہ پہلے دیدار کے لائق نہ ہو۔ لیکن آخر کار اسی مقام میں آپکو پہنچائے کہ وہاں کوئی تیرا شریک نہ ہو سکے۔ پھر ایسا کام نہ کیجیو کہ شہزادوں کے مانند داغ لعنت اٹھائے اور کس وناکس کے روبرو رسوا ہو"

رینالڈ اور میری کارلی، اڈگر ویلیس اور آسکر وائلڈ کو چھوڑیئے۔ اسکاٹ اور جارج ایلیٹ، ڈکنس اور تھیکرے، برنارڈشا اور ایچ جی ویلز کے ہاں بھی اسی انداز کے مواعظ اور معارف ملیں گے۔؟

تاج الملوک ایک بار پھر مصائب وآفات کا شکار بنا۔ طلسمی عصا اور ٹوپی کو الگ رکھ کر سوگیا۔ سوکر اٹھا اور ایک حوض شفاف میں نہانے کو اترا، تو مرد سے

عورت بن گیا طرح طرح کے مصائب جھیلے، مدت کے بعد پھر ایک حوض میں غوطہ لگایا۔ اب کی جو سر نکالا تو از سر نو اپنی اصلی ہیئت پر آگیا۔ یہ "طلسماتی" کارخانہ داستان نویس کی زبان سے ایک گنجینۂ حقائق و معارف بن جاتا ہے:—

"اے یاران دہر، حق تعالیٰ نے بنی آدم کے سر پر کرامت کی ٹوپی پہنا کر اور عصمت کا عصا ہاتھ میں دے کر طلسم گاہ دنیا میں کہ مزرعۂ آخرت ہے عافیت کی تکمیل کے لئے بھیجا ہے پس انسان کو چاہئے کہ گل وخار اور آب و سراب خوب پہچانے، ہر ایک باغ کے پھول کو نہ سونگھے ہر ایک نہر سے گھڑا نہ بھرے، کہ یہاں کانٹے گل سے رنگین اکثر، اور شراب بصورت آب ادھر ادھر ہے۔ اے عزیز اگر گوہر دنیا کے لینے کو چشمۂ جہاں میں غوطہ مارے گا مقرر اپنا کلاہ اور عصا کھو دے گا یہ حکم اس بات پر ہے کہ طالب دنیا مؤنث ہیں اور طالب مولیٰ مرد ہیں۔ تیرا پیکر معانی جو مانند مرد کامل ہے، بصورت زنان ناقص العقل ہو جائے گا۔ پس اس وقت شکیبائی کے سوا کچھ چارہ نہیں۔ چاہئے کہ دم بخود ہو کر پھر دریائے ذکر الٰہی میں غوطہ مارے۔ اس کے بعد جو سر اٹھائے گا وہی عصا ہاتھ میں، اور وہی ٹوپی سر پر رکھے گا۔"

تاج الملوک اور بکاؤلی دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ، اور باہم عقد کے خواہاں ہیں لیکن کہاں پری اور کہاں آدم زاد۔ بکاؤلی کی ماں بگڑی ہوئی ہے کہ خاکی کے ساتھ اپنی نور نظر کا پیوند کر کے پرستان بھر کی عزت کیسے ڈبوئی جائے۔ بکاؤلی کی ایک خالہ تاج الملوک پر مہربان ہو جاتی ہے۔ اس کی سفارش بن کر اپنی بہن کے پاس جاتی ہے۔ گفتگو یہی چھڑتی ہے اور اس وقت یہ پری رومی و غزالی کی بولی میں حقیقت انسانی پر، پورا ایک مقالہ سنا جاتی ہے۔

"سچ کہتی ہے، لطیف کو ہم صحبت کثیف کرنا البتہ دانائی سے بعید ہے لیکن تو حضرت انسان کے کمالوں سے اگر واقف ہوتی تو ایسے ایسے خیال فاسد دل میں ہرگز نہ لاتی۔ سن۔ اے نادان، بشر خلیفۂ یزداں ہے اور اس کی صفت بے پایاں، مخلوقات میں اشرف اور افضل ہے۔ اسکے رتبوں سے اور درجوں کی انتہا نہیں۔ وہ ایک نہنگ ہے دریا کا بیچ والا اور ایک قطرہ ہے حقیقت میں دریا۔ جامع کمالات علم کونی والہی کا، یعنی مادیات اور مجردات کا اور مجمع ہے مراتب بندگی اور بادشاہت کا ؎

انسان کی ذات برزخ جامع ہے بے گماں
ظل خدا و صورت خلق اس میں ہے عیاں

جان، کہ صوفیا ہر ایک کو عالم ارواح کے نوعوں میں سے باری تعالیٰ کے ایک ایک اسم اور صفت کا مظہر خاص جانتے ہیں اور اس عالم صورت کو کہ حواس ظاہری اور باطنی سے نسبت رکھتا ہے اس عالم کا سایہ۔ پس ہر ایک ذرہ کائنات روشن ایک تجلی ابدی سے اور سیراب ایک قطرہ سرمدی سے ہے ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اس عالم میں انسان کہ سارے افراد کون و فساد اس کے لازمی ہیں خدا کے سارے اسموں اور صفتوں کا مصدر ہے اور اس کی تجلیات خاص کا مقام کلام فضیلت انسان میں دریائے بے پایاں ہے، اس قدر پر اکتفا کیا مغربی افسانوں، اور ناولوں، ڈراموں اور ناٹکوں، تھیٹروں اور سینما گھروں پر اس طرز تعلیم کا کوئی سایہ بھی پڑنے پایا ہے؟

تاج الملوک ایک بار پھر آوارۂ وطن ہو کر فقیرانہ لباس میں گھوم رہا ہے۔ گردش سوار ہے، اس ملک کا وزیر ایک سازش کر کے اس بیگناہ کو گرفتار کراتا ہے فسانہ نگار اس بات سے بھی ایک بات پیدا کر لیتا ہے :۔

"سچ ہے کہ جو کوئی حکمت حکیم مطلق کی گوناگوں تامل کی نظر سے دیکھے تو کسی چیز کو خالی شر سے نہ پاوے، اور ہر ایک شر کے بعد خیر ملاحظہ کرے۔ اے عزیز حق تعالیٰ نے عالم ارواح کو بدن سے رخصت دی ہے۔ پس جو حرکت کہ بظاہر بدن سے ہو، حقیقت میں روح سے ہے غرض کہ جو فساد اس عالم کون و فساد میں ہو، تو اس کی طرف سے جان لیکن شر نہ سمجھ کہ در پردہ وہ خیر ہے، کیونکہ وہاں شر کی گنجائش نہیں۔"

تاج الملوک پر ایک اور شہزادی فریفتہ ہوتی ہے، اور وہ اور اس کی سہیلیاں خوب بن ٹھن کر اپنے کو اس کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ تاج الملوک کی نظر میں بکاؤلی سمائی ہوئی تھی، وہ کسی کے بھی حسن و جمال، زیب و زینت سے متاثر نہ ہوا۔ شہزادی غش کھا کر گر پڑی اور تڑپنے لگی، تاج الملوک پر یہ آتش باطن اثر کر گئی۔ مشرق کا افسانہ نگار اس سے نتیجہ یہ نکالتا ہے کہ اپنے کو بالکل مٹا کر رکھ دینا چاہیئے، کہتا ہے :۔

"سن اے عزیز، رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عبادت کو بادشاہ حقیقی کی نذر کے لائق نہ دیکھا، عجز سے کہا کہ عبادت تیری میں نے جیسی چاہیئے نہیں کی، پھر کس کا منہ ہے کہ اپنی عبادت پر نازاں ہو، بہتر یہی ہے کہ آپ کو اس کی محبت کی گھریا میں یہاں تک گھلائے کہ اکسیر کے مانند خاک ہو جائے، تا شاہان اکسیر پسند کی آنکھوں میں سونے سے زیادہ نظر آئے۔"

تاج الملوک کی شادی اس شہزادی کے ساتھ ہوگئی لیکن دل اسکی جانب مطلق ملتفت نہ ہوا۔ دماغ میں ہر وقت وہی بکاؤلی بسی رہتی تھی۔ قلم حقیقت رقم بات کا رخ مثالیوں پھیر دیتا ہے :-

"اے عزیز، جب تک تیرے دل کی آنکھیں، اغیار کے حسن کو دیکھنے والی ہیں، تجھے یار کی صورت نظر نہیں آتی، ہر چند بے پردہ ہو پہلے خار رغبت اغیار کو دل کی سرزمین سے اکھاڑ کر پھینک دے، پھر گل رخسار یار کو آئینۂ دل میں دیکھ لے۔ اگر تو اپنے گلشن وجود کو بہ نظر تامل دیکھے تو اس میں رنگ وبو کے سوا کچھ نہ پاوے۔"

کتاب کوئی ضخیم نہیں، دیباچہ اور تصویریں ملا کر بھی حجم ۹۲،۹ صفحے کا ہے اتنی مختصر ضخامت کے اندر حکمت ومعرفت، پند وموعظت کے کتنے جواہر پارے آپ کی نظر سے گذر چکے۔ اب کتاب ختم ہونے کو آگئی، دو ایک نمونے اور ملاحظہ فرمالیے جائیں۔ تاج الملوک کا وزیر زادہ بہرام بکاؤلی کی ایک عزیزہ روح افزا پر فریفتہ ہوجاتا ہے۔ باریابی تک کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ عورت کا بھیس بدل کر کسی تدبیر وحکمت سے خلوت تک جا پہنچتا ہے۔ اس عشق فانی میں عشق ربانی کا رنگ ملاحظہ ہو :-

"اے عزیز، اگر بہرام زنانہ لباس نہ پہنتا تو ہرگز اپنی معشوقہ سے اتنا جلد نہ ملتا، اور اپنے مطلب کو نہ پہنچتا۔ فی الواقع جو عاشق کہ معشوق کا رنگ پکڑتا ہے، معشوق خود عاشق اس کا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ پیغمبر خدا صلعم نے بھی اس وضع کا کلام فرمایا ہے، حاصل اسکا یہ ہے کہ خصائل خدا کی پیروی کرو تاکہ قربت اس سے حاصل ہو۔"

بہرام اپنی محبوبہ کی خلوت گاہ تک دوبارہ رسائی حاصل کرتا ہے مگر اس کے

ظاہری غصہ اور ناگواری کو دیکھ کر سہم جاتا ہے، ڈر سے غش کھا کر گر پڑتا ہے۔ یہ دیکھ جو دل پتھر تھا، موم ہو جاتا ہے خود اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع ہو جاتی ہیں نگاہ عبرت اس میں بھی ایک منظر معرفت دیکھتی ہے:۔

"اے عزیز اگر اپنے نور عقل کو حکمتوں سے زیادہ نہ چمکائے تو تجلی یار سے فائدہ نہ پائے گا۔ اگر تو یہ ہستی موہوم نہ چھوڑے تو حیات ابدی کب تیرے پاس آئے۔ جو راہ عشق میں آپ سے نہ گذرا، وہ منزل مقصود میں کب پہنچا۔

روح افزا نے گھر والوں کے ڈر سے بہرام کو سحر کے اثر سے پرندہ بنا کر، ایک پنجرے میں بند کر کے لٹکا لیا ہے کہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہے۔ ماں کو کچھ سن گن ملتی ہے۔ چور کے ڈھونڈنے کو آتی ہے اور گھر کا کونہ کونہ ڈھونڈ مارتی ہے، چڑیا کے پنجرے کی طرف خیال بھی نہیں جاتا، حالانکہ وہ بالکل نظر کے سامنے ہے فسانہ نگار یہاں بھی پتے کی بات سے نہیں چوکتا:۔

"اے عزیز تو عرش پر کسی کے ڈھونڈنے کا ارادہ رکھتا ہے، جو تیرے خانہ دل میں ہے، اس کی تو تجھے خبر نہیں، واہ واہ۔ دور کا دھیان اور نزدیک آپ سے انجان ؎

دو سطریں آگے بڑھ کر اسی پرندہ اور قفس کی کہانی کو ایک پورا مقالۂ حکمت بنا دیتا ہے اور اسی پر کہنا چاہیئے کہ افسانہ کی معرفت آموزیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے

اس کی کنہہ سمجھے اے نادان، یہ سب علاقہ، روح سبزہ زار دنیا کی سیر کو آتی ہے، جب تک یہ مربع طلسم عناصر اس کے گلے میں پڑا ہے اور قفس وجود میں طوق بندگی اس کا گلوگیر ہے چشم ظاہر بیں، مشت خاک کے سوا کچھ نہیں دیکھتی۔ جس دن یہ طلسم ٹوٹ گیا، کیفیت اس کی کھل جائیگی کہ وہ کون ہے اور یہ نیرنگ کیا ہے، چنانچہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

نے بھی فرمایا ہے، جب لوگ آویں گے اس حال سے ہوں گے۔ وجود مطلق ایک دریا ہے، اور ہر موجود مثل حباب ہے۔ جب حباب ہے ہوا کچھ دریا کے سوا کچھ نہیں پس تامل سے دیکھ کہ اصل ہستی دریا کی ہے، لیکن فرق مرتبہ کا البتہ ہے، حباب کو کوئی دریا نہ کہے گا اور دریا کو حباب اور کعبہ کو قبلہ کہتے ہیں، اور بت خانہ کو کنشت، جہنم کو دوزخ، اور جنت کو بہشت ؎

ہر مرتبہ میں اور ہی حکم وجود ہے
زندیق ہے جو فرق مراتب کرے نہ تو

واقعی مسئلہ وحدت وجود کا مشکل ترین مسئلہ ہے اور بہتیرے اس بحر عمیق میں گر کے مذہب جبری کے بھنور میں جا پھنسے، اور اکثر مسلک دہری کے گرداب میں ڈوبے، ہادی یہاں فضل الٰہی اور کرم رسالت پناہی کے سوا کوئی نہیں ؟

جو کہانی ننگ مشرق تھی، اس کا جائزہ آپ لے چکے۔ جو افسانے "فخر مغرب" ہیں وہ بھی ان کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں گے ؟ ہمارے ہاں کی جو سچی کتابیں، سچوں پر اتری ہوئی یا سچوں کی لکھی ہوئی ہیں انہیں چھوڑیئے ان کی سچی شرحوں کو بھی جانے دیجئے۔ جو کتابیں کھلم کھلا جھوٹی لکھی گئی ہیں، جھوں نے اپنے جھوٹ کو چھپایا نہیں صاف اسکا اظہار کر دیا ہے، ان کے اندر بھی اتنی سچائیاں اور گہری سچائیاں آپ نے دیکھ لیں! جس قوم کے جھوٹ میں اتنی سچائیاں ہوں جس قوم کے جھوٹے بھی اتنے سچے ہوں۔ خدا کی شان ہے کہ اسے درس اخلاق وصداقت دینے وہ قوم آئی ہے۔ جس کی تہذیب وتمدن کا ہر پیچ اندر سے جھوٹ ہی ہے۔

---

# بہار کی بہار[1]

مارچ ۱۹۱۰ء کا ذکر ہے کہ دارالعلوم ندوہ کی شہرت جلسہ دستاربندی[2] کے موقع پر انگریزی ہائی اسکول کے ایک نویں درجہ کے طالب علم کو اس کے والد ماجد کے ہمراہ کھینچ کر لکھنؤ لائی، کانوں کو اشتیاق تھا دو تقریروں کے سننے کا اور آنکھوں کو تمنا تھی دو چیزوں کی زیارت کی۔ الحمد للہ نے دونوں شوق پورے کرائے پہلی بار تقریر سننی نصیب ہو گئی مولانا شبلی کی، اور زیارت ہوئی ان کے چہرے کی دوسرے نمبر پر آرزو تھی ایک ندوی طالب علم کے دیکھنے اور سننے کی، جس کے مضامین استاد کے رنگ میں ڈوبے ہوئے، انہیں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، الندوہ میں نکل رہے تھے۔ جلسہ گاہ (رفاہ عام متصل سٹی۔ اسٹیشن) میں پہنچ کر دیکھنے میں آیا کہ ایک جوان عمر، خوش لباس طالب علم ہے، چہرہ پر خوشنما چھوٹی مُنّی داڑھی عینک، سر پر مدنی وضع کی سندیلی۔ بشرہ سے ذہانت ٹپکتی ہوئی۔ سب کی نظروں کا مرکز و مرجع رہا ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔ دستاربندی ہوئی یا صاحب کی لائی ہوئی اور پھیلائی ہوئی اصطلاحوں میں یوں کہئے کہ کانووکیشن ایڈریس پڑھا گیا اور

---

[1] رسالہ ندیم (گیا) بہار نمبر ۱۹۴۰ء

[2] جلسہ دستاربندی کی اصطلاح اب غیر مفہوم ہو چلی ہے۔ پرانی درسگاہوں میں دستور یہ تھا کہ طلباء کو تحصیل علم سے فارغ ہونے پر ایک جلسہ عام میں سند دی جاتی تھی اور سر پر فضیلت کی پگڑی باندھی جاتی تھی۔

ڈگریاں تقسیم ہوئیں، اور اس ندوی نوجوان کی مفصل تقریر اردو میں ہوئی اور پھر ایک فرمائشی عنوان پر برجستہ تقریر عربی میں بھی۔ آنے والے اسکولی طالب علم کی دونوں تمنائیں — ہائے لڑکپن کی نیم معصومانہ مسرتوں کا نشہ اب کوئی کہاں سے لائے۔ جی بھر کر پوری ہوئیں۔ ۱۹۰۸ء کا اسکولی طالب علم وہی تھا، جو آج ان سطور کا راقم ہے، اور فاضل ندوی نوجوان وہ تھا، جو بحمد اللہ اردو میں سیرت نبوی کے ضخیم دفتر تیار کر چکا ہے، اور جسے دنیا اب "مولانا" اور "علامہ" کے القاب کے اضافہ کے ساتھ سید سلیمان ندوی کہہ کر پکارتی ہے۔

اودھ کی سرزمین پر بہار کی محبت وعظمت کا تخم پڑا، اور وہ دن ہے اور آج، کہ تخم نے جڑ پکڑی، پودا بنا، برگ و بار پیدا کیے، اور آج ایک درخت ہی نہیں، پورا باغ تیار۔ ۲۲ برس کی مدت کچھ تھوڑی ہوئی! قرن کا قرن گذر گیا خدا جانے کتنی آندھیاں، کتنے طوفان اتنی مدت میں آئے اور کیسے کیسے چمن لٹ کر رہے، لیکن بہار کی خوشگوار یاد کی بہار آج بھی قائم۔ بلکہ اس میں دم بدم اضافہ و ترقی میں بے حد شرمیلا اور بدہیت۔ الندوہ کے مقالہ نگار کی علمی عظمت کا رعب دل پر طاری۔ ملنے کی جرأت اسوقت نہ ہوئی۔ کئی سال بعد جب لکھنؤ کے کیننگ کالج میں بی۔ اے کے پہلے سال کا طالب علم تھا۔ غالباً آخر ۱۹۱۱ء تھا، اور مولانا شبلی مرحوم کی الکلام پر باغیانہ تنقید کے سلسلہ میں "نام" حاصل کر چکا تھا۔ جب جا کر تعارف کی نوبت آئی۔ اور دنیا زمینی کے تعلقات رفتہ رفتہ اتنے بڑھے کہ دوستی کے ڈانڈے عزیزداری سے جا ملے اور اب سید صاحب میں اور اپنے قریب کے عزیزوں میں گویا کوئی فرق ہی معلوم نہیں ہوتا۔

مقامی خصوصیات، تمدن، معاشرت، ہر صوبہ کے الگ الگ ہوتے ہیں پنجاب۔ بمبئی، سی پی، سب کہیں کا رنگ اودھ سے جداگانہ ہے۔ یہاں تک کہ خود

یوپی کے شمالی مغربی اور جنوبی علاقے طرز معاشرت میں اودھ سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ خصوصیت بہاریں دیکھنے میں آئی کہ وہاں کا رنگ ڈھنگ بالکل اودھ کا اجنبیت کم سے کم مجھے تو کسی موقع پر محسوس نہیں ہوئی۔ پٹنہ کا تمدن لکھنؤ کے تمدن کا مثنیٰ۔ جس بہاری سے ملا معلوم ہوا اپنے ہی جوار کے کسی شخص سے ملاقات ہو رہی ہے۔

سید صاحب کے سلسلہ میں ان کے متعدد عزیزوں، ہم وطنوں سے ملاقاتیں ہوتی گئیں۔ سید نجیب اشرف ندوی اب ماشا، اللہ ایم۔ اے ہیں اور بمبئی کی طرف کسی کالج کے پروفیسر ہیں۔ میری نظر میں ان کی وہی لڑکپن کی بھولی صورت پھر رہی ہے، جب وہ ندوہ میں پڑھ رہے تھے اور ہنستے مسکراتے ہوئے یتیم معصومانہ چہرہ کے ساتھ نوشتن بچوں میں ایک ہونہار مقرر تھے مولوی ابوظفر صاحب ندوی، مولوی سید ہاشم ندوی (دائرۃ المعارف والے) مولوی سید محمد ندوی (شاگرد مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم) اور مولوی سید عبدالحکیم صاحب دسنوی، وغیرہم ان میں سے بعض کی ملاقاتیں خود مستقل داستانیں ہیں۔

---

بہار و اودھ کے تعلقات کی تاریخ اس سے بھی قدیم تر ہے۔ یہ ذکر تو میری اور سید صاحب کی ملاقات کا تھا۔ لیکن سید صاحب ہی کے ایک بزرگ ہم نام، ابھی کل تک زندہ وسلامت مولانا قاری سید شاہ سلیمان صاحب پھلواروی تھے۔ ۳۰۔۲۵ سال اُدھر علیگڈھ کانفرنس کا ہر اجلاس ان کے دم سے آباد، تو ندوہ کا ہر جلسہ ان کے وجود سے شاد اور میلادی بیان تو گویا ان کا حصہ تھا۔ ان کا ذکر خیر اپنے بالکل بچپن میں اپنے بزرگوں سے بارہا سننے میں آیا تھا، اور اپنے والد ماجد کے ان سے مخلصانہ تعلقات سنہ ۱۹۱۱ تا ۱۹۱۲ء اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ شاہ صاحب کی طالب علمی کا ایک زمانہ

لکھنؤ فرنگی محل میں گزرا تھا اور ہمارا خاندان بھی اپنے قرب تعلقات کی بنا پر گویا فرنگی محل کا ایک جزو تھا، شاہ صاحب نے بعض کتابیں ہمارے بزرگوں سے پڑھی تھیں، اور اسی تعلق سے کبھی کبھی دریاباد میں تشریف لاتے تھے، مگر میری یاد سے پہلے۔ اس کا تذکرہ خود موصوف نے اپنی زبان سے فرمایا، جب بہت مدت کے بعد غالباً ۱۹۱۳ء میں مجھے ذاتی طور پر شرف نیاز حاصل ہوا۔ ان کی بزرگانہ شفقت اور کرم فرمائی بھولنے کی چیز نہیں۔ ۱۹۲۰ء میں جب پھلواری تھوڑی دیر کے لئے حاضری کا اتفاق ہوا تو خود شاہ صاحب اور ان کے ایک بھائی صاحب (غالباً مولوی علی حافظ نام تھا) اور صاحبزادے شاہ حسین میاں صاحب نے میرے لئے پردیس کو وطن بنا دیا۔ دوسرے صاحبزادے شاہ جعفر میاں اور نواسہ مولوی شاہ عزالدین سلمہ کی کرم فرمائیاں بھی اپنی انکی روایات خاندان کے مطابق ہیں۔

---

لکھنؤ میں دارالعلوم ندوہ ایک بڑا مرکز بہاری نوجوانوں کا ہے۔ اپنی کالجی طالبعلمی کے زمانے میں بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ بہار کا آدھا صوبہ کھنچ کر لکھنؤ آگیا ہے اور ندوہ کا دارالاقامہ پٹنہ ہی کا کوئی محلہ ہے۔ خدا جانے کتنوں سے ملاقات اس سلسلہ میں ہوگئی۔ مولوی حاجی معین الدین (صاحب خلفاء راشدین) اور مولوی مسعود عالم (ایڈیٹر والضیاء، عربی) کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ مولوی ابوالحسنات بے چارہ کی یادگار شاید چند مضامین سے زائد نہ ہوں، بڑے ہونہار تھے۔ عین شباب میں وفات پاگئے۔ جلسوں میں نظم بالکل مولانا شبلی کے لہجہ میں پڑھتے تھے۔ مولوی احمداللہ ندوی مولوی عبدالقدوس ہاشمی ندوی (اب یہ سب حیدرآباد میں ہیں) سے بھی تعارف اسی زمانہ میں ہوا۔ مولوی سید ریاست علی ندوی آج ماشاءاللہ دوسروں کے "ندیم" در رہبر ہیں۔ ان کا وہ زمانہ یاد ہے، غالباً ۱۹۲۰ء میں جب وہ بالکل سبزہ آغاز

تھے اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم کے عزیز و مخصوص شاگردوں میں تھے مولوی عبدالغفور صاحب شرر کا نام لیجئے بھول ہی چلا تھا۔ دفتر ندوہ کے بڑے پرانے سرگرم کارکن تھے، اور اب تو شاید نائب ناظم وہی ہیں۔ ایک زمانہ میں واقعی شرر ہی تھے۔

دارالعلوم کے بورڈنگ کے مقابل کیننگ کالج ہوسٹل تھا (جو اب یونیورسٹی ہوسٹل ہے) اس میں ۱۹۱۱ء میں ایک سال قیام رہا۔ یہاں پٹنہ کے ایک نوجوان سید باقر حسن پہلے سے بورڈر تھے۔ بہار کے مشہور بیرسٹر سلطان احمد کے چھوٹے بھائی۔ وجیہ و خوشرو، ہونہار و خوش خو علیگڈھ رہ کر آئے تھے۔ انگریزی تحریر و تقریر دونوں میں برق، مسلمانوں کے کام میں آگے آگے مجھ سے ایک سال آگے تھے۔ میں بی اے کے پہلے سال میں تھا، وہ آخری سال میں۔ بچارہ کالج چھوڑتے ہی بیمار پڑے، اور کچھ ہی روز بعد دق میں انتقال کر گئے۔ سنی طلبہ سے ایسے شیر و شکر رہے کہ ان کے شیعہ ہونے کا پتہ بھی نہ چلا۔

سر علی امام کے بھائی حسن امام، اور والد باجد نواب امداد امام صاحب اثر۔ نواب نصیر حسین خاں خیال اور اسوقت کے مشہور بیرسٹر مظہر الحق کو راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں اور قومی جلسوں میں قریب سے دیکھنے کا اتفاق بار ہا ہوا لیکن بجز نواب خیال کے اور کسی سے ذاتی تعارف کی نوبت نہ آئی، پٹنہ ہی کے رہنے والے ایک ڈاکٹر محمد وارث ایڈنبرا یونیورسٹی کے ایم۔ ڈی، لکھنؤ میں پریکٹس کرتے تھے حکیم مہدی کے مقبرہ کے مقابل حکمت زائن رود پر۔ ۱۹۰۶ء تھا کہ اپنی مریض آنکھوں کا معائنہ کرانے گیا، بڑی توجہ و شفقت سے دیکھا۔ میں طالب علم، بھلا فیس کیا پیش کرسکتا تھا، ان کی توجہ ہی بہت غنیمت معلوم ہوئی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ اکثر ان کے ہاں جاتا آتا رہتا۔ کام تو بچارہ کا یوں ہی سا چلتا۔ البتہ اپنے فن سے

متعلق پڑھے لکھے بہت تھے پہلی جنگ یورپ کے زمانے میں کہیں سول سرجن ہوکر چلے گئے۔ اس کے بعد صرف ایک بار سرسری ملاقات ہوئی تھی، جہاں کہیں ہوں اللہ خوش رکھے۔

---

خلافت و ترک موالات کی تحریک نے دور دور کے مسلمانوں کو یکجا کر دیا تھا بہار و اودھ کا تو پڑوس ہی تھا۔ میں تحریک میں شریک اس وقت ہوا، جب خود تحریک ختم ہو رہی تھی، محمد علی کی ذات اس وقت بھی بجائے خود ایک مرکز و مرجع تھی، میں تو خیر عاشقوں میں تھا، باقی اور بھی خدا معلوم کتنے اس شمع کے پروانے تھے۔ دہلی بار بار سیری آمد و رفت رہتی۔ یہ ذکر ۱۹۲۴ء اور اس کے بعد کا ہے اور دفتر ہمدرد کا مرڈیہ میں سب کہیں کے مسلمان اکٹھے ہوتے رہتے تھے۔ مولوی محمد شفیع داؤدی، مولوی عبد الغنی، پروفیسر عبد الباری (جواب شاید "باری جی" کہلاتے ہیں) مولوی سید حسن آرزو وغیرہم سے اس سلسلہ میں بار بار ملاقاتیں ہوتی رہیں حضرات بہار کی سادگی اور اخلاص مندی سے دل خاص طور پر متاثر رہا مولوی شفیع داؤدی اور مولوی عبد الغنی کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ اسمبلی اور کونسل کے ممبر ہو کر نماز کے پورے پابند ہیں۔ لباس سادہ رکھتے ہیں بازار میں پیدل چلتے پھرتے اور اپنے ہاتھ سے سودا سلف لے آتے ہیں، بھلا ہمارے ہاں کے ارکان کونسل مسجد کی حاضری، اور موٹر چھوڑ کر پیدل چلنا کیا جانیں؟ مولانا سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار کو پہلی بار مولانا عبد الباری فرنگی محلی مرحوم کے مکان پر دیکھا پھر خلافت وغیرہ کے جلسوں میں متعدد بار لکھنؤ میں ملاقات رہی۔ دل ان کے علم و تدین دونوں کا قائل رہا۔ اور آگے چل کر جب ان سے اور مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی سے جو شدید جنگ برپا ہو گئی تھی تو دل اس سے برابر دکھتا ہی رہا—— دنیا میں بارہا ایسا

ہوا ہے کہ مخاصمہ کے دونوں فریق اپنی اپنی جگہ بے قصور ہی نکلے۔
ایک مرکز اہل بہار کا علی گڑھ بھی ہے۔ یونیورسٹی کورٹ کی ممبری کے سلسلہ میں وہاں کئی سال سے آمد و رفت قائم ہے۔ مولانا سلیمان اشرف مرحوم اب بہاری ہوگئے تھے، لیکن ان کا خاندان تھا ہمارے اودھ ہی کے قصبہ کچھوچھے کا۔ ان کی زبردست شخصیت بعض عجیب خصوصیات کی مالک تھی۔ اور پروفیسر ابوبکر محمد حلیم صاحب ایم اے جو عرصہ سے پرو وائس چانسلر ہیں۔ اسم بامسمیٰ پیکر حلم و خوش خلقی ہیں۔ مرزا اختر حسین صاحب رجسٹرار پٹنہ یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر ہیں۔ ان سے بارہا نیاز حاصل ہوتا رہا۔
سچ بھی ایک ذریعہ اہل بہار کی توجہ منعطف کرنے کا تھا۔ بلکہ دکن کے بعد سچ کی سب سے زیادہ قدر افزائی علاقہ بہار ہی نے کی۔ چھپرا کے وکیل، محمد اسمٰعیل صاحب نزہت ضلع گیا کے قاضی احمد حسین صاحب، رانچی کے ہیڈ ماسٹر الطاف کریم صاحب اور پٹنہ کے مولوی منظر علی ندوی مرحوم (المبشر والے) اسی سلسلہ سے مہربان ہوئے مولوی منظر مرحوم تو خدا کے گھر سدھارے باقی حضرات کی خیریت ادھر ایک عرصہ سے دریافت نہیں ہوئی۔ الطاف کریم صاحب دریاباد کو بھی سرفراز کر چکے ہیں۔

---

سال اب خوب تو خیال میں نہیں سنہ ۲۰ء یا سنہ ۲۱ء ہوگا ایک بار حیدرآباد جانا ہوا۔ مولانا شروانی صدر الصدور امور مذہبی کے دولت کدہ پر کوئی علمی کمیٹی تھی نظر ایک نئے چہرہ پر پڑی، اور جی چاہا کہ اب پڑی ہے تو برابر پڑی ہی رہے ہٹنے نہ پائے۔ نرم اور روشن چہرہ پر ریشم کی طرح نرم اور ملائم داڑھی پر پڑی، تو دل نے کہا کہ اس چہرہ کو دیکھتے ہی چلے جائیے۔ بتانے والے نے یہ بتایا کہ یہ مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں۔ انشاء اللہ کیسا دھوکہ ہوا۔ نام سے عرصہ سے واقف تھا۔ ایک خیالی صورت

بھی ذہن میں تھی۔ لیکن یہ صورت، سیرت ہر چیز سے متعلق خیال اور اندازہ کتنا غلط نکلا۔ خیال تھا کہ من ہوں گے، یہ نوجوان نکلے۔ قیاس تھا کہ بڑے بحاث بڑے مناظر ہوں گے اور خشکی وکرختگی کے پتلے۔ مشاہدہ نے بتایا کہ ایک لطیف جسم لطیف تر روح کو چھپائے ہوئے ہے! خندہ رو، نرم خو، نہ کرختگی نہ ثقالت برعکس اس کے ایک پیکر لینیت ولطافت قال کے موقع پر قال، اور حال کے محل پر حال بصورت پر نورانیت برستی ہوئی گفتگو سے محبوبیت ٹپکتی ہوئی علم کی جگہ علم، عشق کی جگہ عشق تعارف ہوا اور ملاقات کے پینگ بڑھے۔ اس اٹھارہ انیس سال کی مدت میں کیا کچھ دیکھا کیا کچھ سیکھا، ان سوالات کو بس سوال ہی بنا رہنے دیجئے۔ حیدرآباد کی ہمراہیاں لکھنؤ کی یکجائیاں، دریاباد کی سرفرازیاں، اور بحر عرشہ جہاز پر ساتھ، مدینہ کے "روضۂ جنت" میں ساتھ، بیت اللہ کے طواف وزیارت میں ساتھ، منیٰ کی نمازوں میں ساتھ۔ یہ ساری داستان کہیں پھیلنی شروع ہوگئی تو سمٹنی مشکل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ دماغ اگر ایک بہاری سیدزادہ کے علم وفضل کے آگے جھک گیا تھا، تو دل دوسرے بہاری سید کی محبوبیت کی نذر ہو گیا۔ دماغ اگر ایک کی عظمت کا قائل تو دل دوسرے کی محبت کا گھائل "بہار کی بہار" اب بھی روح پرور نہ ہو تو کیا ہو؟

۲۹ء میں سفر حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ جہاز پر مولوی نصیر الدین صاحب پنشنر منصف اور ان کے صاحبزادے ضمیر الدین صاحب کا خوب ساتھ رہا ضمیر صاحب جو اس وقت ایک پر جوش خلافتی تھے، ان کے لطف وکرم کی تجدید ۸-۹ سال بعد خاص شہر پٹنہ میں ۳۸ء میں ہوئی۔ مولوی شاہ لطف اللہ صاحب مونگیری، اور ان کے برادران عزیز مولوی نور اللہ و مولوی منت اللہ (اب ایم ایل اے ہیں) سے خصوصیت پیدا ہو جانے کے لئے اتنا ہی بس تھا کہ یہ حضرات مولانا گیلانی کے

عزیز قریب ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ان حضرات کا لطف و اخلاص بجائے خود بھی یاد رہ جانے والی چیز ہے۔ اور مدینہ منورہ میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب کا وجود تو ہر مسافر و زائر کے لئے ایک آیۂ رحمت ہے، ہم لوگوں پر کرم خاص رہا۔ مسجد نبوی میں باب جبرئیل کے درمیان بھی ایک بہاری تھے اور خوب شخص تھے ہم لوگ عموماً اسی دروازہ سے جاتے تھے روز ملاقات رہتی تھی۔ نام اس وقت ذہن میں نہیں۔

---

جامعہ عثمانیہ کے سررشتۂ تالیف و ترجمہ کے سلسلہ میں ستمبر ۳۰ء سے ستمبر ۳۱ء تک ایک سال مسلسل حیدرآباد میں قیام رہا۔ سرکار عالی کے نائب صدر محاسب (اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل) مولوی عبدالغنی بہاری مرحوم تھے۔ ان کے کرم بے حساب رہے۔ ان کے صاحبزادے محی الدین صاحب بی اے بیرسٹر ایٹ لا محکمۂ تعلیمات میں تھے۔ اب شاید اورنگ آباد کالج کے پرنسل ہیں۔ جوانی ہی میں مذہب کے دلدادہ، لطف و کرم میں باپ کے قدم بہ قدم۔ انہیں کے ہاں شمس العلما مولوی محب الحق کی زیارت کئی بار ہوئی۔ اس وقت تو بہت بزرگ صورت معلوم ہوئے۔ بعد کو سننے میں آیا کہ عقائد کچھ "اہل قرآن" کے سے ہیں۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ ایسا شخص اور منکر حدیث ہو! بہار ہی سے ایک صاحب مولوی ابو الصلح ایڈیٹر حسن و عشق، مراسلت عرصہ سے فرما رہے تھے حیدرآباد کی آمد و رفت کے سلسلہ میں ملاقات ہوئی۔ تحریک قرآن کی دھن میں لگے ہوئے دکن ہی کے سلسلہ میں ایک اور بہاری عبدالرحمٰن خاں صاحب بھی یاد آ گئے۔ انسپکٹر پولیس تھے۔ مدتوں مہربان رہے۔

ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی ایم اے، پی ایچ ڈی کا نام رہا ہی جاتا تھا۔ نظر ثانی کے وقت یاد پڑا۔ یہیں ٹانکے دیتا ہوں۔ اب مدت سے کلکتہ یونیورسٹی میں عربی کے استاد

ہیں، ایک زمانہ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں تھے۔ اس وقت تو میں ہی ذرا الگ رہا۔ بعد کو معلوم ہوا بڑے سلمان تھے۔ مراسلت اور ان کے مقالات حدیث نبوی سے اس کی تصدیق ہوگئی۔

---

پٹنہ کی حاضری کا اتفاق کل دو بار ہوا۔ بوئے انس شہر کی گلی گلی سے آئی۔ نئی کوٹھیوں سے کم تر، عظیم آباد کے کھنڈروں سے بیشتر پہلی بار ۲۷ء میں جانا ہوا مولانا مناظر صاحب شاید بکیل ہوکر پٹنہ کے بڑے اسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ تار پاکر عیادت کو دوڑا ہوا گیا۔ مہمانداری مولوی منظر علی مرحوم ایڈیٹر المبشر نے کی۔ مولانا کے والد ماجد حیات تھے، ان کی زیارت ہوئی اور مولانا کے برادر عزیز سید مکارم احسن سے خوب ملنا ملانا رہا۔ مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی قاضی احمد حسین صاحب ایم، ایل، سی، مولوی نور محمد صاحب ایڈیٹر "اتحاد" وغیرہم لطف فرماتے رہے اور مولوی سید محمود ندوی تو ہر وقت خدمت کے لئے وقف رہے۔ میزبان صاحب موٹر پر پھلواری لے گئے۔ مزارات کے علاوہ زندہ بزرگ امیر شریعت مولانا محی الدین صاحب کی زیارت نصیب ہوئی۔ مولانا قاری شاہ سلیمان مرحوم ومغفور اور ان کے اہل خاندان کی عزیزانہ سافرنوازی محبت کا مزہ دل اب تک لے رہا ہے۔ جناب تمنا کو بھی وہیں دیکھا اور کلام سنا اور جناب تمنا کی لطف فرمائیاں رہیں۔ غرض "پھلواری" کی سیر سے دل باغ باغ رہا اور اسکی سدا بہار سرسبزی کے لئے دعائیں نکلتی رہیں۔

دوسرا سفر ۳۷ء میں ایک اردو کمیٹی کے سلسلہ میں ہوا۔ ضابطہ سے میزبان قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر تھے۔ لیکن قیام مولانا سید سلیمان کی رفاقت میں، ریاض حسن خانصاحب رئیس مظفر پور کی کوٹھی پر رہا۔ موصوف مولانا شبلی مرحوم کے

ملنے والے اور اس رشتہ سے سرے بھی بزرگ ہوئے۔ بزرگانہ شفقتیں عین روایات بہار کے مطابق رہیں۔ تمنا صاحب اب کی بھی کرم فرماتے رہے، اور انکے علاوہ ضمیرالدین صاحب اور متعدد حضرات کی عنایتوں کا مینھ دن بھر برستا رہا۔ افسوس ہے کہ انکے اسمائے گرامی ذہن میں نہیں۔ شام کو ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم کے اعزاز میں علیگڈھ اولڈ بوائز کی طرف سے ایٹ ہوم تھا۔ متعدد نوجوانوں سے ملاقات رہی۔ سب خلوص و محبت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے، ایک ڈپٹی مجسٹریٹ اور دو یونیورسٹی کے طلبہ کی صورت کا نقش ذہن میں ہے۔ لیجئے ایک ہدیۂ حقیر بزرگان بہار کی خدمت میں پیش کرنے کیلئے، گو ان کے مرتبہ کے قابل ہرگز نہیں تیار ہوگیا۔ موضوع یہ "احباب بہار" خود ایڈیٹر صاحب ندیم کا عنایت کیا ہوا تھا۔ محفل خاص میں اغیار کے بار پانے کے کوئی معنی نہیں۔ بہار نمبر میں ایک غیر بہاری کے لئے جگہ نکالنا محض اس کا دل بڑھانا ہے لیکن یہ بہار نمبر ہے، ایسا کہ اس پر کسی خصوصی نمبر کا اطلاق ذرا مشکل ہی ہے ایک تو ادوھ اور بہار کے تمدن و معاشرت کی یہ یکسانی کہ ایک کو دیکھ بے اختیار دوسرے کی زبان سے نکلے۔ ع کمال جذب تو دیکھو بہم تمیز مشکل ہے

اور پھر اس عموم میں خصوص ان سطور کے راقم کا اہل بہار کے ساتھ نیازمندانہ خلوص ــــ قند و شکر کو جب تولتے ہیں تو خس و خاشاک کے ذرّے بھی قند و شکر ہی کے حکم میں داخل ہوجاتے ہیں۔ عجب کیا جو اس غیر بہاری کو بھی ایک اعزازی (آنریری) بہاری سمجھ لیا جائے۔

اضافہ ۱۹۶۱ء۔ اس تحریر کے بعد دوبارہ پھر سفر بہار کا اتفاق ہوا۔ ایک بار ۵۲ء میں جو اصلاً سفر گیلانی تھا مولانا کی حیات میں ضمناً سفر پٹنہ بھی رہا۔ دوبارہ ۵۸ء میں جو اصلاً سفر پٹنہ تھا اور ضمناً سفر گیلانی (تربت مولانا پر فاتحہ پڑھنے) سفر ڈیسنہ۔ سفر راجگیر۔ سفر نالندہ اور سفر پھلواری اس سفر میں قیام گورنمنٹ ہاؤس میں گورنر ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب کے یہاں رہا۔ اور نیاز خصوصی حاصل رہا پروفیسر عبدالمنان بیدل۔ حکیم عبدالاحد (پرنسپل طبیہ کالج) اور انوار احمد ایڈوکیٹ سے

# ایک مختصر سا پیام[1]

## "یوم اکبر" منانے والوں کے نام

۱۹۱۲ء ہے اور مہینہ غالباً اپریل کا۔ لکھنؤ میں ابھی یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی ہے صرف کیننگ کالج وغیرہ ڈگری کالج ہیں۔ ایک طالب علم بی۔ اے کا امتحان دینے لکھنؤ سے الہ آباد پہنچا ہے اور اپنی پہلی فرصت میں یہی نوجوان شرمیلا اور بڑوں کی صحبت میں جھینپنے والا، شوق کے پیروں سے دوڑ کر، اور اشتیاق کے پیروں سے اڑ کر "عشرت منزل" جا حاضر ہوتا ہے — پیر طریقت کا سن کوئی ۶۶ سال کا۔ جسم لاغر و نحیف، چہرہ دبلا، اور اس دبلے چہرہ پر جھریاں، لباس، سادہ، وضع و معاشرت سادہ۔ ایک وسیع برآمدہ اس میں ایک آرام کرسی پر نشست، آنکھوں پر عینک، آنکھیں عینک کے اندر سے بھی جھکتی ہوئیں، ڈاکٹر کے ہاتھ کی قدح کی ہوئی، اس پر بھی پرنور گفتگو لطیفوں سے پر، ظرافت سے معمور، بشرہ سے ذہانت کا ظہور بہت کم ہیں، ہنساتے زیادہ ہیں، فقرے گویا ڈھلے ہوئے، پہلے سے سوچے ہوئے، جنچے ہوئے، منہ سے نکل رہے ہیں۔ جو ملنے آیا ہے، وہ سن میں ان کی بڑی اولاد سے بھی کہیں چھوٹا ہے، لیکن باتیں اس سے یوں گھل مل کر کر رہے ہیں، جیسے وہ ان کا کوئی پرانا دوست ہے، ہم سن و بے تکلف — ان پیر ظریف کو آپ نے پہچانا؟ یہ تھے مشہور و نامور شاعر اور میرے

---

[1] ۱۹۴۳ء میں یہ یوم اکبر، عالم پور (دکن)، میں رگھوبند راؤ صاحب جذب کے زیر صدارت منایا گیا تھا

عقیدہ میں حکیم و عارف، حضرت اکبر۔اور ۱۹۱۲ء کے اس شرمیلے نوجوان کو آپ نے جانا؟ وہ نامہ سیاہ ہے آپ کے ارشاد کی تعمیل میں یوم اکبر کے لئے پیام نویس!

---

سنہ اب یاد نہیں، اور مقام کا اظہار کچھ ضروری نہیں، بہرحال اودھ کا ایک چھوٹا سا ضلع ہے حضرت اکبر کے صاحبزادہ سید عشرت حسین صاحب (عشرت منزل کا نام آپ ابھی سن چکے ہیں، یہ انہیں کے نام پر ہے) وہاں ڈپٹی مجسٹریٹ ہیں۔ اکبر صاحب بھی وہیں آئے ہوئے ہیں شہر کے کچھ لوگ رئیس یا وکیل، ڈپٹی صاحب سے ملنے آتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب اتفاق سے گھر پر موجود نہیں وہ حضرات ان کے بجائے حضرت اکبر کو جلوہ افروز پاتے ہیں اور نام سن کر بھی ان کی جانب چنداں التفات نہیں کرتے، اتنے میں ڈپٹی صاحب باہر سے آجاتے ہیں اور حاضرین سے کہتے ہیں کہ آپ لوگوں نے پہچانا؟ "یہ میرے والد ماجد ہیں" اب کیا تھا وہی حضرات تعظیم کے لئے سروقد کھڑے ہوجاتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ "معاف کیجئے گا ہمیں اس رشتہ کی خبر نہ تھی" اکبر نے فرمایا نہیں اس میں مضائقہ کیا۔ ایک بار یورپ میں کیا ہوا، کہ اللہ میاں مجسم ہو کر آئے، گرجوں میں جاکر ایک ایک سے کہا میں تمہارا خدا ہوں، پروردگار ہوں، کوئی مخاطب نہ ہوا، پھر فرمایا، ارے مجھے اب بھی نہ پہچانا، میں ہوں تمہارے عیسیٰ مسیح کا باپ! بس اس تعارف کی دیر تھی۔ سب دوڑ پڑے، سب کے سر تعظیم کے لئے جھک گئے!" یہ تھا اکبر کی برجستہ لطیفہ گوئی کا ایک نمونہ!

---

سنہ غالباً ۱۹۱۸ یا ۱۹۱۹ ہے۔ اکبر لکھنؤ میں امین آباد پارک کے ایک بالاخانہ پر مقیم ہیں۔ ایک صاحب "صاحبانہ" مسلک و خیال کے ملنے تشریف لاتے ہیں گفتگو کچھ عورتوں کی تعلیم و آزادی پر چلتی ہے اکبر نے کہا کہ "ہم تو اس زمانہ میں آزاد

خیالی کا امام سید احمد خاں کو سمجھتے تھے، لیکن عورتوں کی آزادی انھیں بھی سخت ناپسند تھی" وہ صاحب جیسے بھرے بیٹھے تھے۔ بات کاٹ کر بولے کہ "سرسید کی رائے اس معاملہ میں سخت قابل ترمیم تھی" اکبر نے برجستہ جواب دیا کہ "جی، کیوں نہیں۔ ایک اسی معاملہ میں کیا، خدا معلوم کتنے معاملوں میں سخت قابل ترمیم تھی" وہ خود ہی قابل ترمیم تھے دیکھئے، زمانہ نے انھیں کی ترمیم کردی، انھیں اٹھالیا، اور ان کے بجائے آپ کو پیدا کردیا، یہ ایک ہلکی سی جھلک تھی اکبر کی حکیمانہ وظریفانہ اصلاحی طرزِ گفتگو کی۔ اصلاح و تبلیغ کے کام میں تو وہ ہمہ وقت لگے رہتے لیکن مجادلہ ومکابرہ کیا معنی، مناظرہ و مباحثہ کی بھی نوبت نہ آنے دیتے۔ اور خشونت تو جانتے ہی نہ تھے بس یوں ہی ہنستے بولتے کوئی چبھتا ہوا فقرہ کہہ جاتے۔ شعر میں کہہ بھی تو گئے ہیں ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

---

انکار مذہبی "بحث" سے کیا ہے، بحث و جدال کا رنگ کبھی آنے نہ دیا۔ باقی دھیمے سروں میں، میٹھے بولوں میں مذہب کی تبلیغ تو چپکے چپکے، جیسے ہر وقت کرتے رہتے۔ مجھ سے ایک روز میرے عین الحاد کے زمانے میں کہنے لگے کہ "کیوں صاحب، آپ نے کالج میں عربی لی تھی نہ؟" عرض کیا "جی ہاں" فرمایا تو پھر اب قرآن آپ کبھی پڑھتے ہیں؟ مذہبی کتاب مجھ کر نہ سہی، اس کی اعلیٰ لٹریری حیثیت سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہوگا، کیا ہرج ہے اگر عربی ادب سے اپنا تعلق قائم رکھنے کے لئے اسے کبھی کبھی پڑھتے رہئے۔ آخر انگریزی بھی تو پڑھتے رہتے ہیں۔ آپ کے لئے کوئی قید باوضو ہونے، قبلہ رخ بیٹھنے کی نہیں، وضو بے وضو جب جی چاہے کچھ پڑھ لیا کیجئے اور جو آیت پسند آجائے، اسے ذرا دو

ایک بار دہرا لیا کیجئے جیسے اچھے شعر کو دو چار بار پڑھ لیا جاتا ہے۔ اور جو نہ بن آئے اسے سمجھ لیجئے کہ وہ آپ کے لئے نہیں ہے بس یہ حکیمانہ طریق تھا ان کی تبلیغ کا۔

ایک روز اور میرے اسی دور الحاد میں مجھ سے فرمانے لگے کہ کیوں صاحب آپ کو کبھی اپنے بندہ ہونے میں بھی شک ہوا ہے؟ اللہ میاں کے مسئلہ کو الگ رکھئے، صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ آپ کو اپنے بندہ ہونے میں تو شک نہیں؟ عرض کیا کہ "نہیں، اس میں تو نہیں" بولے، بس بیڑا پار ہے۔ اپنی بندگی کا احساس کرتے رہئے۔ آپ کے لئے اسی قدر کافی ہے۔ اللہ کی معرفت کا دعویٰ کون کرسکتا ہے۔ سب کی یافت بس اپنے اپنے مقام تک رہی ہے میرا ایک شعر سن لیجئے ؎

درد تو موجود ہے دل میں شفا ہو یا نہ ہو
بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو

---

اپریل ۱۹۱۲ء کی وہ گھڑی، اور ستمبر ۱۹۲۱ء میں یوم وفات پورے دس برس میرے تعلقات نیازمندی برابر قائم رہے، روز بروز بڑھتے گئے۔ اس مدت میں میں نے بہت کچھ سیکھا، بہت کچھ لیا، اکبر کے کلام سے بھی اور اکبر کی ذات سے بھی خوش نصیب تھا میں کہ اتنی مدت تک موقع استفادہ کا ملا۔ بدنصیب تھا میں کہ موقع سے پورا فائدہ نہ اٹھایا۔ اپنے عقائد و خیالات کی اصلاح میں میں نے حضرت اکبر کا اثر چپکے چپکے غیر شعوری طور پر اور غیر محسوس طور پر کام کرتے ہوئے پایا۔ وہ ابھی زندہ ہی تھے کہ میں بحمدللہ مسلمان از سر نو بن چکا تھا۔ جب پہلی نماز حضرت اکبر کے ساتھ انھیں کے مکان عشرت منزل میں ادا کی۔ ظہر کا وقت تھا۔ اس وقت ان کی خوشی کا کیا کہنا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کتنی بڑی دولت خود انھیں کو مل گئی ہے! توحید کے عاشق تھے اور غیرت، عشق کا ایک لازمہ ہے۔ توحید کی غیرت اتنی تھی، کہ کوئی

دوسرا تذکرہ، یہاں تک کہ اللہ کے پیاروں کا بھی زیادہ دیر تک سن ہی نہ سکتے جھٹ موضوع بدل، توحید پر آجاتے اور آخر آخر تو فنا اور توحید، یہی دو محبوب موضوع رہ گئے تھے، ۲۰ء و ۱۹۲۱ء میں عارف رومؔ کی مشہور و معروف مثنوی کی دھن میرے اوپر سوار تھی۔ اکبرؔ کی خدمت میں اس کا تذکرہ کیا ایک بار کیا دو بار کیا جب تیسری بار کیا تو تڑ سے بول اٹھے کہ اچھا یہ تو فرمائیے اللہ میاں بڑے ہیں یا مولانا رومؔ؟" میں نے کھسیانے ہو کر کہا کہ "اللہ میاں" بولے میں تو آپ کی گفتگو سے یہی سمجھا تھا کہ شاید مولوی روم بڑے ہیں۔ جب سے آپ آئے ہیں، بار بار انھیں کا ذکر کر رہے ہیں۔ اللہ میاں کا نام میں نے ایک بار بھی نہ سنا میں تو سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اللہ میاں نے آپ کی رہنمائی مثنوی تک کی۔ یا مولوی رومؔ آپ کو اللہ تک لے آئے"؟ انتہا یہ ہے کہ ایک بار جب ذکر رسولؐ شروع ہوا تو اسے بھی دو ہی چار منٹ بعد حضرت اکبرؔ نے اپنے اس فقرہ پر ختم کر دیا کہ "جی ہاں، ہمارے اللہ کی قدرت کا کیا کہنا۔ کیا بے نظیر اور بے مثال انسان پیدا کر دیا!"— یہ حد تھی غلبہ توحید کی!

---

اکبرؔ بڑے پرگو تھے اور بڑے زودگو۔ جو دیوان چھپ چکے ہیں، وہی تعداد میں ایک نہیں تین ہیں۔ اور جو کلام اب تک نہیں چھپا ہے وہ سب چھاپ دیا جائے، تو اگر پوری دو جلدیں نہیں، تو ڈیڑھ جلد تو ضرور ہی اور تیار ہو جائے۔ اکبرؔ کا پیام تقریباً وہی تھا جو اقبالؔ کا تھا یعنی خودی اور خودداری کا سبق۔ مشرقی کو مشرقی۔ اور مسلمان کو مسلمان رہنے کی تلقین، راہیں الگ تھیں، لیکن منزل دونوں کی ایک، ایک چہروں کو ہنساتا ہوا چلا، دوسرا دلوں کو گرماتا ہوا بڑھا — اکبرؔ کی زندگی درحقیقت ایک سبق ہے کہ انسان، ظرافت، زندہ دلی،

دل لگی، خوش طبعی کی راہ سے بھی کیسی کیسی خدمتیں دین وملت کی انجام دے سکتا ہے!

---

(۲)

# چند مقدمے

## کلام جوہر[1]

### مقدمہ

"آپ میری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رامپور میں اس زمانہ میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ۔ امیر۔ تسلیم۔ جلال۔ عروج۔ دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رامپور کے آسمان سے نورافشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچازاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں صاحب اور ان کے بھائی حافظ احمد علی خاں صاحب شوق شامل تھے۔ گھر پر بار بار مشاعرہ ہوا۔ پھر داغ کو نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی۔ از راہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا تاکہ وظیفہ محض کار بے کاران کی نذر نہ ہو۔ یہ میرے مکان کے عقب میں تھا۔ اس لئے روز ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی، اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں۔ جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا (ممکن ہے کہ تاریخ بھی نکلتی ہو)

---

[1] تحریر ۱۹۳۵ء

آیا دہلی سے ایک مشکی خر
آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کی غزل یاد کیجئے ؎

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا
خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے۔ جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا مجھے بھی لے جاتے تھے۔ داغ نے پہلے دن پوچھا "کچھ کچھ شعر بھی یاد ہیں"؟ میری عمر بہت کم تھی مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دئیے تھے جنھیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے انھیں کے چند شعر انھیں سنا دئیے۔ سن کر پھڑک گئے اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچے کو ضرور لایا کرو جناب والا اگر اس کے بعد میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ مگر میرا دعویٰ تو اس سے بڑھ چڑھ کر ہے سنئے۔ میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی تو ندر پر کودا ہوں اسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔ میری پیدائش ۱۸۸۱ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو و فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے۔ اور اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میری ( OFFICIAL BIOGRAPHY ) یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری "امت" کی طرف سے ) لکھنے کا وقت آتا تو میرے سیرت نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردی دان بلکہ آتشدان کے نذر کیا جائے، یا سیرۃ پیشوائے قوم و ملک میں جگہ دی جائے۔ ہمدرد کے سنسر نے رجن کا چند ماہ کے بعد انتقال یکایک ہو گیا) تو ہمدرد میں سے ایک بار چڑیا چڑے ونٹے کی کہانی کو بھی رجو محض امتحاناً درج کی گئی

بھی) خارج کر دیا تھا۔ اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ بھائی ہے تو چڑیا چرونٹے ہی کی کہانی اور مطلب صاف صاف معلوم ہوتا ہے مگر ہمدردوالوں سے ڈر ہی لگتا ہے اور روٹی کا معاملہ ہے نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہوا اور جواب دہی ہمارے سر پر آپڑے، آپ نفسیات کے ماہر ہیں۔ کیا ممکن نہیں کہ میرا یہ جنے والا اسیرت نگار با وجود نقادِ سخن ہونے کے محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں اور آنے والی نسلیں ممکن ہے اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر ہوں اور ان اسرار سے واقف ہو کر دنیا کو نئے نئے معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالا مال کر دیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ انہیں داخل ہی کر دو۔ اور اسی طرح ہمیشہ کے لئے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن استاد داغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سنئے کہ گیارہ برس کی عمر میں علی گڑھ گیا ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظے کی تعریف کی کہ المامون میز پر رکھا تھا۔ اٹھا کر پڑھنے لگا اور ایک دن میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا ایک شعر عربی کا پڑھا تو اس کا مجھے ترجمہ سنا دیا حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے۔ مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے۔ پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی، پھر اس کا حلیہ پوچھا جب اس میں پاس ہوگئے تو ایک مصرع طرح اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو۔ چند شعر از قسم لچر پوچ۔ اسی وقت تیار ہوگئی میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر جو سکہ بیٹھا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے بھی لکھی اور مولانا حکم ٹھہرے۔ انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا۔ مگر ہماری لچر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب عمر زرا زیادہ ہوئی تو امتحانوں نے فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ

آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے۔ تو ایک نظم تین شعرائے باکمال نے حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب (تربیت الدجاج و یونین جیک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی، ان میں سے ایک یہ خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب آنریبل و آزمودہ کار سکریٹری مسلم لیگ کے برادر صغیر "اصغر" خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گذر گیا اور وہ مشاعرہ جسے بعد حسرت نے رونق بخشی ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چودھویں کو ہوا کرتا تھا اور شمع پیش نہیں کی جاتی تھی۔ کرکٹ کا لان جائے مشاعرہ تھا۔ ایک بار چودھویں کو بارش ہو گئی تو تین چار دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر ڈائننگ ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرح میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا ؎

فرش زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں
لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

علی گڑھ کالج میں شاعری تو کچھ کی، مگر وہی فرضی معشوق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور "سبز خط" وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوق نظارہ، جمال" لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی" سہی تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد و ورع کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا۔ دو برس کسی اور کے خیال نے، مگر یہ آخری خیال بھی باعصمت تھا اور محض حالات گرد و پیش اس کے محرک تھے۔ جب ان سب تجربوں کے بعد کپڑے جھاڑے گھر کو آئے تو تاہل کی زندگی بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کر دیا۔ گذشتہ چند سالوں میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا تو وہ بھی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر

رہی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشق حقیقی رنگ لایا ہے اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنک آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانے میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لئے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں، مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بغایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے، چونکہ آپ کا اصرار ہے کہ پوری غزلیں لکھ بھیجو۔ اس لئے یہ لکھے بھیجتا ہوں (TOUGH STONE) کی معشوقہ سے زیادہ قابل قدر نہیں (POOR THING BUT OWN MINE) اب رخصت ہوتا اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں ..... (غزلیں درج ہیں) یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے کہ بقول آپ کے "میری امت" ان سے کچھ تسکین پائے بہرحال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق یہ صرف اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لئے ہیں"

(۲)

جوہر کی شاعری کی داستان آپ نے خود جوہر کی زبان سے سن لی۔ یہ ٹکڑا ان کی کسی تصنیف کا نہیں، کسی اخباری مضمون کا نہیں، ایک خانگی مکتوب کا ہے تاریخ اس پر ۱۹ راگست ۱۹۱۶ء کی پڑی ہے۔ چھندواڑہ (ممالک متوسط) میں نظربند تھے اس وقت کوئی جانتا ہی نہ تھا کہ حضرت شاعر بھی ہیں۔ ۱۹۱۶ء کے شروع میں اسی نظربندی کی حالت میں ان سطور کے راقم سے مراسلت شروع ہوئی۔ پہلے انگریزی میں اور پھر اردو میں کسی والا نامے میں اپنے ایک آدھ شعر بھی درج کر دیئے تھے اس پر اس نیازمند کا اشتیاق بڑھا۔ عرض کیا کہ "اور عنایت ہو" عنایتیں مسلسل ہوئیں دوبارہ عرض کیا کہ آپ کے یہ جوہر تو اب کھلے ذرا کچھ فرمائیے تو آپ نے یہ شعر گوئی کا گر کب سیکھا! کہاں سیکھا؟ کس سے سیکھا! جواب مفصل مرحمت ہوا۔ آپ اوپر پڑھ چکے۔

بالکل قلم برداشتہ اس طرح کے دوستانہ خطوط بھی بھلا دنیا۔ میں کہیں سوچ بچار کرکے ٹھہر ٹھہر کے۔ اور غور کرکر کے لکھے جاتے ہیں؟ بیچارے کو خیال تک نہ ہوگا۔ کہ کسی دن یہ خانگی بے تکلف تحریر بھی چھپ کرا ور تصنیفوں کا جزو بن کر رہے گی ـــــ اس تحریر کی اشاعت سے قبل دنیا کو خبر ہی نہ تھی، کہ محمد علی اُردو کے شاعر بھی ہیں۔

(۳)

محمد علی کو دنیا نے اوّل اوّل جانا، تو اس حیثیت سے کہ انگریزی لکھتے خوب ہیں بولتے خوب ہیں، علی گڈھ کے فدائی ہیں، قوم کے "شیدائی" ہیں مخلص ہیں، پرجوش ہیں۔ ابھی کالج ہی میں تھے کہ شہرت نے بلائیں لینی شروع کردیں۔ آکسفورڈ گئے، نام اور چمکا۔ ہندوستانی طلبہ کی مجلس نورتن، کے نام سے قائم کی۔ خود ہی صدر بنائے گئے، یا (کانگرسی اُردو میں) چنے گئے۔ لوٹ کر آئے بڑودہ سول سروس میں داخل ہوئے۔ ٹائمز آف انڈیا بمبئی میں مضمون نگاری شروع کی، شہرت اور بڑھی ۱۹۱۱ء آگیا کلکتہ سے اپنا انگریزی ہفتہ وار کامریڈ نکالا۔ حاکموں اور محکوموں، انگریزوں اور ہندوستانیوں سارے انگریزی دانوں کے حلقے میں دھوم مچ گئی۔ نثر میں شاعری، واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے ہر طرف ڈرائنگ روم میں بھی اور کلب میں بھی شیکسپیر کے فلاں ڈرامے پر تنقید کیا خوب لکھ دی اِسلم یونیورسٹی کے نظام زیرِ تجویز پر مضمون کیا زبردست لکھ ڈالا! ۱۹۱۲ء آیا کامریڈ کو دہلی لائے۔ یہیں سے ہمدرد بھی نکالا۔ اب محمد علی ایڈیٹر نہ تھے۔ ایڈیٹر سے کہیں بڑھ کر لیڈر تھے۔ اب قوم ان کی نہ تھی وہ قوم کے تھے۔ جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان چھڑی اور محمد علی مجنونانہ ادھر لپکے بلقان میں اتحادیوں کی ہر ضرب ترکوں کے جسم پر نہیں محمد علی کے قلب پر پڑ رہی تھی۔ کچھ اور نہ بن پڑی تو ایک عظیم الشان اور یادگار زمانہ طبی وفد ہی ٹرکی روانہ کردیا۔ چندہ کے لئے پکارا تو روپیہ کا ڈھیر سامنے لگ گیا۔ اتنے میں مسجد کانپور کا ہنگامۂ خونیں پیش آگیا محمد علی دیوانہ وار جھپٹ اس

آگ میں بھی کود پڑے! — اب ان کا شمار ہوشیاروں میں۔ عاقلوں میں تھا کب؛ اب وہ مستوں کے مست تھے! مست الست!

ولایت گئے اور آئے۔ گرجے، چھپے، چھائے۔ دم لینے نہ پائے تھے کہ ۱۹۱۴ء کی محشر خیز جنگ یورپ شروع ہوگئی۔ خلافت اسلامیہ کی آخری جنگ! آہ، وہ آخری جنگ جس میں خلیفۂ اسلام کا پرچم آخری بار لہرایا — محمد علی اب اپنے عالم میں کہاں تھے! قلم کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر، منہ کا ایک ایک بول سنان و خنجر! زبان کھولی تو نظربند ہوئے نظربندی بھی مہینے دو مہینے کی نہیں اکٹھے پانچ برس کی عمر ہی گنتی لے کر آئے تھے۔ اسمیں پانچ پانچ برس یوں زباں بندی، معطلی کی نذر۔ شاعری کے جوہر اسی زمانہ میں چمکے مظلوم کی زبان بن کر، نالہ و فریاد کرتے ہیں۔ ساتھ ہی تیکھی چتونوں سے ظالم کی طرف بھی گھورتے جاتے ہیں ؎

ہوں لاکھ نظربند، دعا بند نہیں ہے
اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

جس کے دیوانے تھے، اس کے ہاں چاہنے والوں کے ساتھ قہر کہاں۔ مہر ہی مہر لیکن حقیقت مہر کبھی کبھی صورت قہر میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور پھر عاشقوں کے ساتھ تو معاملہ سب سے نرالا ہی رہتا ہے۔ امتحان پر امتحان، سوز پر سوز، ابتلا پر ابتلا ؎

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیر
عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر

محمد علی اس بھید کو پا گئے تھے۔ اس دیار کے راہ و رسم سے واقف ہو چکے تھے سوچ سمجھ کر بولے ؎

یہ نظربندی تو نکلی ردّ سحر    دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

اور پھر اس سے بھی ترقی کر کے بولے کہ جو منزل مقصود پیش نظر ہے اسکے لحاظ سے

یہ قید و بند بھی کوئی امتحان ہے؟ اس کے لئے نقد مطالبہ تو نقد جان کا ہوتا تھا ؎

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا!
کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دوسروں کو سمجھاتے ہیں کہ بھائی اس میں رشک کی کیا بات ہے حصہ بقدر حبثہ، یہ اپنے اپنے ظرف کے اعتبار سے اپنی اپنی قسمت ہے ؎

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِ دار دیکھ کر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

آپ فرمائیں گے کیا خوب مصرعہ لگایا ہے خاکسار عرض کرے گا، کیا خوب اظہار حقیقت کر دیا ہے۔ اسی نظر بندی کے زمانہ میں ایک بار وطن کا سفر کر رہے تھے۔ ریل پر ملاقات ہوئی، پوچھا "رہائی کے بعد کیا ارادے ہیں" فرمایا ارادے کیسے؟ اب دھن تو صرف ایک ہے، یورپ پہنچوں اور گلی گلی، گھر گھر تبلیغ اسلام کروں۔ نظربندی اور اس کے بعد جیل! پانچ سال بعد چھوٹ کر آئے تو ملک میں تلاطم برپا۔ ترکوں پر جنگ کے بعد اب صلح کے وار، توپ کے گولوں کے بجائے اب صلح کانفرنس کے پتیرے۔ ادھر ہندوستان کے اندر حکومت پنجاب کے بے پناہ مظالم کا طوفان! شروع ۱۹۲۰ء کا تھا کہ محمد علی دو ایک رفیقوں کو ہمراہ لے، دوڑے دوڑے پھر یورپ پہنچے اور لندن اور پیرس کے خدا جانے کتنے جلسوں میں تقریریں کر ڈالیں، وقت کی ضرورت ناگزیر، کہ موضوع تقریر صرف تحفظ خلافت ہی رہے۔ لیکن موقع جہاں کہیں بھی نکل سکا۔ چپکے چپکے اور اندر ہی اندر دین کی تبلیغ بھی! ؎

اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا!

لوٹے تو پھر وہی جیل کا کھلا ہوا پھاٹک منتظر تھا۔ "عدم تشدد" پر لاکھ زور دیتے رہے لیکن حق گوئی کا جرم بہرحال جرم ہی تھا۔ جامعہ ملیہ کی بنیاد علی گڈھ میں ڈال چکے تھے۔ اور ابھی چند ہی سبق پڑھائے ہوں گے کہ ۱۹۲۱ء کے آخر میں پکڑے گئے اور جکڑے گئے ۱۹۲۳ء تک کچھ کم دو برس، پھر چوروں اور رہزنوں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ، سرکار والا کے مہمان رہے۔ اب سجدے زمین ہی پر ہوتے تھے لیکن سجدے والی زمین، رفعت میں آسمان کا دامن چھو کر رہتی تھی! ذرا آپ بیتی کی ایک دو حرفی روداد تو کان لگا کر سن ہی لیجئے۔

معراج کی سی حاصل سجدہ میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کرامتیں

نکلے تو ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ استقبال میں پیش پیش وہ جن کے ہاں وطن مذہب سے عزیز تر۔ اور دنیا، دین پر مقدم۔ کانگریس کے صدر دسمبر ۱۹۲۳ء میں منتخب ہوئے ملک نعروں سے گونج اٹھا۔ محمد علی کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا، سب نعروں سے بالا تر، وہی نعرہ تکبیر!— وہی ساڑھے تیرہ سو برس کا پرانا اللہ اکبر!

لڑکا کوئی نہ تھا۔ لڑکیاں چار تھیں۔ چاروں دل و جان سے بڑھ کر محبوب۔ جیل ہی میں تھے کہ منجھلی لڑکی جوان، بیاہی ہوئی، آمنہ، دق میں مبتلا ہوئی۔ جو دوسروں کی اولاد کے لئے تڑپ جانے والا تھا۔ خود اپنی نازوں کی پالی لخت جگر کے لئے یہ خبر سن کر کیسا کچھ پھڑپھڑایا ہوگا۔ دل پر کیا کچھ بیت گئی ہوگی! بیٹی سے عالم خیال میں کہتے تھے ؂

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں　　تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

دوا درمن کی انتہائی تدبیریں تو غریب، بے حوصلہ، والدین بھی کر ڈالتے ہیں۔ یہاں وہ باپ جس کا دل حوصلوں اور ولولوں سے بھرا ہوا تھا رنجور و پھر بیٹی کی شکل تک

دیکھنے سے مجبور تھا!

امتحان سخت سہی پر دلِ مومن ہی وہ کیا جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں
ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے، اور اپنی نورِ نظر، دونوں کے پیدا کرنے والے سے، رو کر اور گڑگڑا کر یہ عرض و معروض کرنے لگ جاتے ہیں ؎

تو تو مُردوں کو جلا سکتا ہے قرآن میں کیا
یُخرِجُ الحَیَّ مِنَ المَیِّتِ مذکور نہیں؟
تیری قدرت سے خدا یا تری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

اب اسکے بعد جو شعر ہے اس کے پڑھنے سے پہلے، اولاد رکھنے والے اپنا کلیجہ تھام لیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

اللہ اللہ! جیل سے نکلے تو جیسے گودوں میں کھلایا تھا۔ اسے قبر میں بھی اتارا ۱۹۲۴ء کا وسط تھا کہ خود ترکوں نے منصبِ خلافت کو توڑ کر رکھ دیا! نہ پوچھئے کہ محمد علی پر کیا گذر کر رہ گئی خلافت اسلامیہ کا مٹنا، قیامت کا پیش خیمہ تو تھا ہی، محمد علی کے حق میں خود قیامت بن کر رہا معلوم ہوتا تھا آسمان سے بجلی گر پڑی۔ دل و جگر بس جھلس کر رہ گئے وسط ۱۹۲۴ء سے آغاز ۱۹۳۱ء تک زندہ ضرور رہے اور بہت سے زندہ دلوں سے کہیں بڑھ کر زندگی کا ثبوت دیتے رہے۔ سلطان ابن سعود کی حمایت میں اور پھر مخالفت میں خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے عزیز دوستوں سے جھگڑے۔ اور بھڑے۔ لڑے اور روٹھے۔ ۱۹۲۵ء میں منجھلی لڑکی کی شادی کی، اور سال ہی بھر بعد ۱۹۲۹ء میں اسے بھی اپنے ہاتھوں دفنایا۔ کامریڈ دوبارہ نکالا۔ ہمدرد کو پھر سے زندہ کیا اور دونوں کو کچھ دن بعد بند کرنا پڑا، کانگریس والوں کی زیادتیوں کا مقابلہ

بے جگری سے کیا۔ یورپ اور قسطنطنیہ اور انقرہ بھی گئے آئے۔ یہ سب کچھ ہوا اور اسکے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا رہا۔ لیکن دل کی کلی جو الغائے خلافت سے مرجھا چکی تھی پھر نہ کھلنا تھا نہ کھلی۔ شاداب نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ محمد علی اب زندہ تھے کب؟ یوں کہئے کہ زندگی کے جتنے دن لکھا لائے تھے، بس وہ پورے کر رہے تھے اب وہ انسان نہ تھے، صرف ایک چشم گریاں! صرف ایک قلب بریاں! صرف ایک آہ سوزاں!

آخری سفر، دیکھنے میں لندن کا سفر گول میز کانفرنس کے لئے تھا، اور حقیقت میں سفر آخرت! بد بینوں نے کہا، کہ اب اس خاکستر کے ڈھیر میں ہے کیا! لیکن جب بولنے کھڑے ہوئے تو انگریز اور ہندو سب پکار اٹھے کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہے، یا ایک متحرک کوہ آتش فشاں! فاش و برملا کہا جیسے مستقبل کو دیکھ ہی رہے تھے کہ آزادی لینے آیا ہوں، یا تو آزادی لے کر جاؤں گا، یا اپنی جان اسی سرزمین پر دے کر! مالک نے بندے کی لاج رکھ لی۔ جنوری ۱۹۳۱ء کی پانچویں تاریخ اور شعبان ۱۳۵۰ھ کی پندرھویں شب میں عین اس وقت جب روئے زمین کے مسلمان اپنے پروردگار سے رزق کی، صحت کی، اقبال کی، زندگی کی مغفرت کی نعمتیں مانگ رہے تھے مشیت الٰہی نے یہ نعمت عظمیٰ دنیائے اسلام سے واپس لے لی! شاید اسلئے کہ اس کے ہم قوم اور ہم وطن اس نعمت کے اہل نہیں ثابت ہوئے تھے، آزادی محمد علی کے ملک کو کیا ملتی۔ محمد علی کی روح کو البتہ مل گئی! بندہ اپنا ٹوٹا ہوا دل ہزاروں داغ کھایا ہوا دل، لے کر اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہو گیا۔ عمر کل ۵۲ سال کی پائی۔

موت لندن میں آئی اور دفن کے لئے جگہ کہاں ملی؟ سرزمین قدس میں قبلۂ اول میں ہیکل سلیمانی کے قریب، جامع عمرؓ کے متصل! اقبالؔ نے کہا ذرا دیکھنا اپنے رسول کا یہ عاشق و غلام جا کس راستے سے رہا ہے ع

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

اس موت پر اس مدفن پر رشک کس کو نہ آئے گا؟ پھر ماتم جس زور شور سے تنہا لکھنؤ یا کلکتہ یا بمبئی یا دہلی میں نہیں۔ سارے ہندوستان میں ہوا، ایک ایک شہر، ایک ایک قصبہ، گاؤں گاؤں میں ہوا۔ سارے عالم اسلام میں ہوا۔ اس کی نظیر تاریخ امت میں آسانی سے تو نہ ملے گی۔ اطلاعیں یہ ہیں کہ قدس شریف میں، مقبرہ ایک زیارتگاہ خلائق بن گیا ہے۔ زائرین کا ہجوم رہا کرتا ہے۔ مجاوروں کو اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے خود کہہ بھی تو گئے تھے ؂

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر   یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

وہ مشک کیا جس کی خوشبو عطار کی تعریف و تعارف کے بعد سونگھنے میں آئے! جوہر کا کلام آگے خود ہی موجود ہے۔ اس کے لئے ضرورت نہ کسی تمہید کی۔ نہ دیباچے کی۔ نہ پیش نامہ کی۔ ورق الٹئے اور لطف اندوز ہونا شروع کر دیجئے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ کوئی طویل، عریض، ضخیم دیوان ہو کر گھنٹوں ورق گردانی میں لگ جائیں، جب جاکر کوئی چیز اپنے مذاق کی مل پائے۔ ایک ننھی منی سی کتاب جب جو حصہ چاہئے کھول لیجئے البتہ چند سرسری باتیں کسی رہبر کی زبان سے نہیں، ایک پرانے رہرو کی زبان سے سنی ہوئی کانوں میں پڑی رہیں تو راہ شاید اور زیادہ سہولت و خوشگواری سے کٹ جائے محمد علی ابھی کالج میں پڑھ رہے ہیں، شاعری کا گویا ابھی لڑکپن ہے اس سن کا کھیل کود ذرا ملاحظہ ہو ؂

ارادہ تھا یہ نالوں کا ہلا دیں ربع مسکوں کو
مگر اے ہم نفس دل کی شکن کچھ اور کہتی ہے

یقین آنے کو تو آ جائے تیرے عہد و پیمان پر
تری آنکھ اے بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

قضا کس کو نہیں آتی ہے یوں تو سب ہی مرتے ہیں   پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

کس زور کی لڑائی تھی اللہ رے کشمکش
تھی رات یاس اور دل ناصبور تھا
میں تیرا گھر سمجھ کے سر راہ گر پڑا
دیکھا جو آنکھ اٹھا کے تو دروازہ دور تھا

اب کالج چھوڑ چکے ہیں، زندگی کی کشمکش میں داخل ہو چکے ہیں۔ ۱۹۰۷ء ہے علی گڑھ میں لڑکوں نے انگریز استاد کے خلاف اسٹرائک کر رکھی ہے، کالج بند، خدایان کالج حیران و پریشان بوڑھے سید کی آنکھ بند ہوئے کل دس ہی برس ہوئے ہیں مگر اتنے عرصہ میں دنیا کی دنیا ہی بدل چکی ہے۔ محمد علی آتے ہیں۔ اتفاق سے وہی دن سرسید کی برسی کا ہے اولڈ بوائز جمع ہو کر اپنا جلسہ منا رہے ہیں۔ محمد علی اپنے نیچری پیر سے ڈرتے لرزتے نہیں ان پر ناز کرتے ہیں، ان کی خدمت میں اپنے جیسے "بڈھے لڑکوں" کو سنا سنا کر کچھ عرض کرتے ہیں۔ معروضہ میں ناز بھی ہے اور نیاز بھی، شوخی اور ستی بھی ہے اور درد و گداز بھی ؎

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو
ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو
یہاں مانا کہ تاثیر دعا میں شک رہا تم کو
وہاں ضائع نہ ہو گی پھر بھی مشغول دعا تم ہو
تمہیں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علیگڈھ میں
اور اس پر یہ تماشا، ہر طرف اور جا بجا تم ہو
سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو
تمہیں ہو زندہ جاوید باقی جانے والے ہیں نمونہ ہیں فنا کا ہم، تو تمثیل بقا تم ہو

دس برس کا زمانہ اور گذرا تھا کہ اور — اب محمد علی چھند واڑہ میں نظر بند ہیں۔ یک بیک خبر پہنچتی ہے کہ غلام حسین چل بسے۔ کون غلام حسین؟ کامریڈ کی ایڈیٹری میں محمد علی کے دست و بازو۔ انگریزی کے زبردست انشا پرداز کامریڈ کے بند ہوجانے کے بعد نیوایر کے ایڈیٹر۔ اچھے خاصے جوان تندرست سرشام لکھنؤ میں ایک پبلک جلسے سے چلے آرہے تھے کہ قضا نے ایک چھوٹے ہوئے گھوڑے کے قالب میں پشت کی طرف سے آکر ٹکر دی۔ اور یہ رونق صحافت و سیاست رخصت! محمد علی کلیجہ تھام کر رہ گئے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ناموزوں کی کچھ آوازیں سننے والوں کے کان میں بھی پڑ گئیں ؎

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین — کوئی دن اور بھی جئے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے — ہم غریبوں سے بھی لئے ہوتے
اے مرے رند، بادۂ حق کے — ابھی دو چار خم پیے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی — کام کچھ اور بھی کئے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ — ساتھ ہم کو بھی کر لئے ہوتے

تکلف اور تصنع سے محمد علی کی زندگی کا ہر شعبہ پاک تھا۔ وہی رنگ یہاں بھی ہے شعر کہتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے، بے تکلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کسی قسم کی تیاری نہ کوئی اہتمام کیسی نظر ثانی اور کہاں کا غور و فکر نہ اصلاح نہ ترمیم۔ بس جو دل میں آگیا جھٹ کہہ گزرے یہی حال نثر کا تھا، یہی حال نظم کا، زمانہ حکومت کی اصطلاح میں "نظر بندی" کا تھا لیکن احکم الحاکمین کے اجلاس میں یہ وقت نظر کشائی کا قرار پایا خوب پتے کی کہنے لگے ؎

سوز در دل سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو
ہے درد دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو

دیر و حرم میں ڈھونڈ کے سب تھک گئے اسے
اب کون کہہ سکے کہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

شعر سنئے:۔

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لئے
یہ کیا کہ مئے حلال وہاں ہو یہاں نہ ہو
سنتے ہی جس کو خلق میں کہرام مچ گیا
جو ہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

ذیل کی غزل ایک اچھے خاصے دیوان پر بھاری ہے ؎

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
جینا وہ کیا کہ دل میں تری آرزو نہ ہو
باقی ہے موت ہی دل بے مدعا کے بعد

حنا کا قافیہ اس طرح میں آسانی سے آسکتا تھا لیکن ذرا دیکھئے محمد علی نے اسے کس رنگ سے باندھا ہے ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل
ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

حالی کا ایک لاجواب شعر ہے ؎

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

حالی بہرحال ایک مسلم استاد تھے۔ جوہران کے مقابلہ میں مبتدی اور نوآموز جیسے شعر و شاعری سے فنی واقفیت کے لئے زندگی بھر چند لمحہ کے لئے بھی فرصت نہ ملی پھر بھی جوابی شعر کچھ ایسا بیٹا نہیں رہا۔

لذت ہنوز مائدہ عشق میں نہیں آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل بن گیا ہے۔

قتل حسینؑ اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اب عالم ہی اور تھا۔ جیل کے باہر ہندوستان بھر کی سڑکوں پر، گلیوں میں، گھر گھر زبانوں پر چرچا تھا۔

بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ کہنا تو محمد علی کی بی اماں کا تھا اور محمد علی خود جیل کے اندر کیا کہہ رہے تھے؟

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے
پر غیب سے سامان بقا میرے لئے ہے
پیغام ملا تھا جو حسینؑ ابن علیؑ کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے

یہ غزل کہہ رہے تھے۔ یا اپنی آٹوبیاگرفی (خود نوشت سوانحعمری) "آپ بیتی" قلم بند فرما رہے تھے؟

میں کھو کے تری راہ میں سب دولت دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے
اے شافع محشر جو کرے تو نہ شفاعت
پھر کون وہاں تیرے سوا میرے لئے ہے
کیوں ایسے نبی پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے
اچھے تو سبھی کے ہیں برا میرے لئے ہے

محمد علی کا کلیجہ آخر عمر میں جنھوں نے اپنوں ہی کے طعنوں سے چھلنی ہوتے دیکھا ہے وہی کچھ اس "شاعری" کی قدر کرسکتے ہیں۔ اسی آپ بیتی کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

کیوں جان نہ دوں غم میں ترے جبکہ ابھی سے
ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لئے ہے

بعد وفات جب ایک عالم ماتم وشیون سے گونجنے لگا تو صاحب "معارف" مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے تعزیتی مقالہ کا عنوان بھی اسی دوسرے مصرعے کو رکھا تھا۔

ماتم یہ زمانے میں بپا تیرے لئے ہے

خدا جانے الہام شاعر کو ہوا تھا یا تعزیت نگار کو، عجب نہیں کہ دونوں کو ہوا ہو ۱۹۲۲ء میں جسم قید فرنگ میں، دل ترکوں میں اٹکا ہوا، جیل کے اندر اخبار کا گزر نہیں بیجاپور کا جیل خود آبادی سے بہت دور۔ ایک دن دور دراز سے اللہ اکبر کے نعرے کان میں آتے ہیں، دل معاً گواہی دے اٹھتا ہے کہ ہو نہ ہو ترکوں نے سمرنا فتح کرلیا ہے۔ جوش سے بے خود یہ قیدیٔ گوشہ نشین کہہ اٹھتا ہے ؎

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی!
سن لی خدا نے قیدیٔ گوشہ نشین کی

مطلع سن لیا ہے تو دو چار شعر اور سنتے چلئے ؎

شیطان جلد باز کا جادو نہ چل سکا تفسیر آج ہو گئی کیدی متین کی[1]!
تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا اک عرض اور ہے ابھی اس کمترین کی
اک گھر ترا یہاں بھی تو ہے اسکے باب میں کب ہو گی لامکاں سے مشیت مکین کی
تینوں حرم اسی کے جو ہے لاشریک لہ ترکیب ہے درست یہی ایک تین کی[2]

اُسی "گھر" کے جنوں نے تو خود اپنا گھر چھڑایا۔ اور جلا وطن بنا رکھا تھا رامپور میں پیدا ہوئے تھے، پلے تھے، بڑھے تھے، کھیلے تھے، چپہ چپہ دل میں بسا ہوا تھا مگر مجال نہ تھی کہ جیل سے چھوٹ کر بھی وطن جا سکتے۔ کسی کو یہ مستقل جلا وطنی بھگتنی پڑے جب قدر معلوم ہو، ٹھنڈی سانس بھرتے جاتے ہیں اور آبدیدہ ہو کر کہتے جاتے ہیں ؎

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے ہم نہ تھے ان کے آستانے کے
ایک اک کرکے سب کے سب تنکے ہوئے برباد آشیانے کے
دیکھئے اب یہ گردش تقدیر کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے
پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

قید اور وہ بھی تنہائی۔ بیجاپور جیل کی کال کوٹھری کے اندر خدا ہی بہتر جانتا ہے کیا کیا نعمتیں نصیب میں آگئیں۔ سینہ کیسے کیسے انوار سے جگمگا اٹھا۔ کیا کچھ دیکھ لیا کیا کچھ دکھا دیا۔ راز کبھی کیوں کھلتا ؟ ایک دن قلم کی زبان درود خوانی پر آئی تو کچھ اتے پتے اس عالم کے بھی دیتی چلی گئی ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

---

[1] تلمیح ہے آیۂ کریمۂ اِنّ کَیۡدِیۡ مَتِیۡن، کی طرف۔
[2] اشارہ ہے مسیحیوں کے عقیدۂ توحید فی التثلیث کی طرف۔

ہر آن تسلی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے
ہر وقت ہے دل جوئی ہر دم ہی مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن شائد وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی ہم نے بھی تو سوغاتیں

قربان ہو جائیں ایسی قید پہ ہزاروں آزادیاں! نثار ہوں اس ویرانے پر ہزار ہا آبادیاں! مشت خاک کا شمار اب عالم پاک میں تھا۔ لوہا جب تپ کر دہک کر لال انگارہ بن جائے تو لوہا باقی ہی کب رہ جاتا ہے جو شاعر اب عالم معانی و حقائق کی سیر کر رہے تھے، ان کی شاعری الفاظ و حروف کی رہ کہاں گئی تھی!۔ ایک دیوانہ تھا جسے ایک دوسرے دیوانے[1] نے مرنے کے بعد بھی بلا ظاہری ملاقات و تعارف کے خوب پہچانا اور خوب ہی کہہ ڈالا ؎

| | |
|---|---|
| بدین مصطفےٰ دیوانہ بودی | فدائے ملت جانانہ بودی |
| سیاست را نقاب چہرہ کردی | دگرنہ عاشق مستانہ بودی |
| سیاست ہشتے بر عشق پاکت | زآئین خرد بیگانہ بودی |
| رمیدی از رہ اغیار تا یار | عجب ستے عجب دیوانہ بودی |

زبان پر آئی ہوئی واہ کا غلغلہ بس یہیں محفل کے فرش تک۔ دل سے نکلی ہوئی

---

[1] یعنی فاضل گرامی مولانا مناظر احسن گیلانی نظم کے باقی اشعار سیرت محمد علی (رئیس احمد جعفری) میں ملینگے

آہ کی رسائی مالک عرش تک رومی اور حافظ اور سعدی آج تک کیوں زندہ ہیں؟
کیا محض اس لئے کہ کلام فصیح و بلیغ ہوتا تھا؟ نہیں بلکہ اس لئے کہ خوش مزہ کلام کے اندر
کوئی زندہ روح ہوتی تھی، فارسی زبان بدل گئی، الفاظ متروک ہوگئے محاورات
تبدیل ہوگئے ترکیبیں نئی ہوگئیں لیکن حی وقیوم کا نام جپنے والے صدیوں کے بعد بھی
جوں کے توں، خود بھی زندہ اور دوسروں کو زندگی بخشنے والے بھی! جو ہر نے بھی
اپنے کو اسی نہ مٹنے والے زندہ کے نام کے پیچھے مٹا دیا تھا فنا کر دیا تھا عجب کیا ہے
کہ کچھ زندگی ان کے نصیب میں بھی آجائے۔

---

# سیرت محمد علیؒ

## دیباچہ

ماضی قریب میں اسلامی ہند کی سرزمین نے جو ممتاز ترین اکابر و مشاہیر پیدا کئے اگر یہ سوال ہو کہ بہ لحاظ جامعیت ان میں سرفہرست کس کو بنایا جائے اور کون ایک ایسا شخص انتخاب کیا جائے جس کی سوانح حیات کے اندر اجمالاً پوری تاریخ عصر حاضر کی آجائے تو جواب میں صرف ایک ہی نام لیا جاسکتا ہے اور وہ نام نبی اور ایک دلی کے ناموں کا مجموعہ ہوگا یعنی محمد علی۔

اس دور نے یقیناً بعض بڑے اور جلیل القدر علمار دین پیدا کئے۔ لیکن ان کی ناموری صرف دینداروں کے طبقہ تک محدود رہی۔ بعض نامی و گرامی مشائخ طریقت پیدا کئے لیکن ان کا نام بس مریدوں اور معتقدوں کے حلقہ کے اندر رہا۔ بعض مشہور قومی "رفارمر" پیدا کئے لیکن ان کی اور ان کے "رفارم" دونوں کی شہرت جدید تعلیم یافتہ گروہ کے حدود سے آگے نہ بڑھی۔ بعض زبردست خطیب اور مقرر پیدا کئے لیکن انہیں کانفرنسوں کے پلیٹ فارم اور کانگرسوں کے ڈائس کے باہر کسی نے نہ جانا۔ یہ حال مشاہیر خاص کا ہوا۔

دوسروں کی آوازیں اور بھی پست تر رہیں۔ اور تنگ تر دائروں سے ان کی گونج آگے نہ بڑھی۔ ملک کے طول و عرض میں بس ایک ہی ہستی ایسی تھی جس کی آواز شمال

---

[1] سیرت محمد علی از مولوی رئیس احمد جعفری ندوی مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۳۲ء

بھی سنی اور حنزب نے بھی، ہمالیہ کی بلندیوں نے بھی اور گنگا کی وادیوں نے بھی، خواص نے بھی اور عوام نے بھی، عالموں نے بھی اور جاہلوں نے بھی بوڑھوں نے بھی اور بچوں نے بھی۔ آسام نے بھی اور سندھ نے بھی بڑے بڑے مہذب شہریوں نے بھی اور دیہات کے گنواروں نے بھی۔ وائسرائگل لاج کی چکتی اور جگمگاتی ہوئی برجیوں نے بھی اور جیل خانہ کی تنگ وتاریک کوٹھڑیوں نے بھی۔ راجوں مہاراجوں کے قصرو ایوان نے بھی اور فاقہ کشوں کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں نے بھی۔

اس کا کلام سن کر ڈرائنگ روم کے کوچ اور صوفے کھلکھلا کر ہنسے۔ اس کا پیام سن کر مسجد کے درودیوار بلبلا کر رو دئے۔ خانقاہیں اور درگاہیں، ہوٹل اور بازار دفتر اور کارخانے، "آزادوں" کی کانگرس اور رجعت پسندوں کی کانفرنسیں، پریس اور پلیٹ فارم، دیوبند اور ندوہ، فرنگی محل، جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ سب کے سب اس سے مانوس اور مالوف، چپہ چپہ پر اس کے نقش قدم کے نشان ذرہ ذرہ اس کے خیر مقدم سے لطف اندوز!

معاصر اور حریف بہت سے تھے، قابل بھی اور فاضل بھی، لیکن قبول خداداد اور مرجعیت عام کی دولت سے وہی ایک ممتاز۔ یہ سعادت "زوربازو" کا نتیجہ نہیں ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

کہتے ہیں جو حق تعالٰے کا ہو جاتا ہے، حق تعالٰی اس کا ہو جاتا ہے۔ بزرگوں کا قول ہے یقیناً صحیح ہوگا۔ لیکن یہ مشاہدہ ہے کہ جو اللہ تعالٰی کے بندوں کا ہو گیا تھا اللہ کے بندے اس کے ہو گئے تھے۔ محمد علی نے اپنے کو اللہ کی خاطر، اللہ کے دین کی خاطر خدمت خلق کے لئے وقف کر دیا تھا۔ خلق نے بھی اپنے تئیں محمد علی کے لئے وقف کر دیا وعدہ ربّانی إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا (مریم ع ۵)، ترجمہ۔ یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہتے ہیں خدائے

رحمٰن ان کے لئے، خلق کے دل میں، محبت پیدا کردے گا۔ کی تفسیر لفظ وعبارت میں بہت دیکھی تھی، گوشت پوست کی مجسم تفسیر محمد علی کی زندگی میں نظر آئی۔

اس دل ودماغ کا، ان صفات وکمالات کا سردار کسی قوم کو خوش نصیبی ہی سے کہیں مدتوں میں ہاتھ آتا ہے جنہیں یہ نعمت ملی انھوں نے قدر نہ کی ۔۔ وقت پر نعمت کی قدر دنیا نے کب کی ہے ۔۔ دولت کیا ٹھہرنے والی اور نعمت کیا رکنے والی تھی ایک آنی دولت اور فانی نعمت تھی۔ آئی اور گئی ۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

اور پھر ہم مسلمان! ہم نے اپنی ساڑھے تیرہ سو سال کی تاریخ میں قدر کس کی پہچانی ہو! شیر خدا علی مرتضیٰؓ کی؟ خلیفۂ رسول عثمان غنیؓ کی؟ جوانان جنت کے سردار حسینؓ کی؟ جب اپنی شور بختیوں سے ایسے ایسے سرداروں کی قدر ہم نے نہ پہچانی تو اب اس کا کیا غم وماتم کہ ان کے ایک ادنیٰ خادم محمد علی کی ناقدری رہی؟ اور پھر اسے خواہ مخواہ شور بختی ہی کیوں قرار دیجئے؟ حکیم مطلق کی حکمتوں کے بھید کون پا سکا ہے۔ خدا جانے کتنی تکوینی مصلحتیں ان میں بھی ہوں گی!

کم تھے جنھوں نے محمد علی کے پہچاننے کی کوشش کی کم تر تھے جو اس کوشش میں کامیاب رہے۔ ادب وانشا پردازی، سیاست وقیادت، خطابت وصحافت، طرح طرح کے گہرے گہرے نقاب کچھ اس طرح تہ بر تہ پڑے ہوئے تھے کہ چہرہ کے اصلی خط وخال اور بشرہ کے حقیقی حسن وجمال کا مشاہدہ دشوار ہوگیا تھا۔ مبارک تھے وہ جنھوں نے قریب آکر دیکھ لیا۔ مبارک تر تھے وہ جنھوں نے دور ہی سے فراست ایمانی کی روشنی میں بھانپ لیا اور جیتے جی نہ سہی، مرنے کے بعد یوں فاش وبرملا کہہ دیا۔[1]

[1] الحاج مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی بہاری شیخ الحدیث عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد العقیدہ صفحہ ۲۴

بدین مصطفیٰ دیوانہ بودی — فدائے ملت جانانہ بودی
بہ بزم ماربیس عشق بازاں — بہ رزم دشمناں فرزانہ بودی
بہ دل بودی فقیرے بے نوائے — بہ قالب پیکر شاہانہ بودی
سیاست را نقاب چہرہ کردی — وگرنہ عاشق مستانہ بودی
سیاست ہمتے بر عشق پاکت — ز آئین خرد بیگانہ بودی
چہ دانستی کجا سوزم نہ سوزم — تو شمع دین را پروانہ بودی
بایمانہا ز تو زورے و شورے — بجانہا ہمت مردانہ بودی
رسیدی از رہ اغیار تا یار — عجب مستے عجب دیوانہ بودی

محمد علی کی بہت سی تصویریں کھینچی گئیں، لیکن صحیح ترین مرقع یہ ہے۔ محمد علی پہلے جو کچھ بھی رہے ہوں۔ علی گڑھ کے ایک مشہور کھلنڈرے' آکسفورڈ کے ایک بہترین طالب علم، انگریزی کے ایک اعلیٰ انشا پرداز، انگریزی صحافت کے ایک جوہر قابل شیکسپیئر کے ایک ماہر نقاد ایک سحر بیان مقرر، ایک بلند پایہ شاعر، ایک نامور رہنما، ایک ممتاز سیاسی لیڈر وغیرہ، لیکن آخر میں یہ ساری حیثیتیں گھل گھلا کر سمٹ سمٹا کر صرف ایک ہی حیثیت باقی رہ گئی تھی، اور وہ جو کبھی اپنی عقل و فرزانگی کے لئے مشہور تھا، اپنے "خبط" و دیوانگی کے لئے بد نام ہو کر رہ گیا! مرنے پر کانوں میں آوازیں آئیں کہ ملک و ملت کا سیاسی رہنما چل بسا، لیکن اپنے دل سے صدا اٹھی تو بس یہی، کہ آج محمد کا دیوانہ دنیا سے رخصت ہو گیا!

---

(بقیہ حاشیہ ۲۲۱) اہل دل اور اہل علم دونوں کی صف اول میں تھے زندگی میں کبھی محمد علی سے ملاقات نہیں ہوئی وفات پر جو جلسہ تعزیت حیدر آباد میں ہوا، بس اس میں مولانا ابل پڑے اور وہیں تعزیتی تقریر میں رو رو کر یہ اشعار کہہ سنائے

ہاں، وہ ذات محمد کا شیدائی، دین مصطفےٰ کا دیوانہ اور امت محمدی کا بن دامون غلام تھا۔ ہندوستان ہی میں نہیں عالم اسلام میں کہیں کسی کلمہ گو کے پھانس چبھتی اور چبھن محمد علی کے پہلو میں ہونے لگتی۔ مصیبت کسی مسلمان پر بھی آئے اور درد سے بیتاب محمد علی۔ اسلام پر قانون اسلام پر شعائر اسلام پر، کہیں کوئی حملہ ہوا تڑپ محمد علی کے دل وجگر میں پیدا۔ مقابلہ انگریزوں سے آپڑے، ہندوؤں سے پڑجائے، حکومت سے ہو، محمد علی کا سینہ ہر وار کے لئے سپر بنا ہوا! ۱۹۲۶ء میں حج اور شرکت مؤتمر اسلامیہ کیلئے جب جانے لگے، اور سلطان ابن سعود کی حکومت ابھی نئی نئی قائم ہوئی تھی، تو اپنے اردو روزنامہ ہمدرد میں اپنے قلم سے لکھا۔

"اب نہ بنی امیہ کا دور ہوسکتا ہے، نہ بنو عباس کا عامہ خاندان عثمان کا، اب حکومت اسلام ابن اسلام کی ہوگی۔"

دن رات اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، یہی دھن تھی اور اسی کا کلمہ۔ آخری سفر یا دروہی سفر آخرت کا پیش خیمہ تھا، جب بمبئی سے روانہ ہونے لگے تو اس وقت بھی ناموس اسلام کے تحفظ پر کچھ ایسے ہی الفاظ زبان سے کہے تھے۔ حق تھا کہ جب ایسے شخص کی موت آئے تو سارا عالم اسلام، شرق سے غرب تک اس کی عزاداری میں سیہ پوش ہوجائے۔ اور شمال سے جنوب تک ایک ماتم سرابن جائے، اور یہی ہوا پھر غریب الوطنی کی موت کے بعد جگہ بھی ملی تو کہاں؟ وہاں جہاں کے لئے، آرزو اور تمنا بڑے بڑے صدیقوں اور شہیدوں نے کی ہے سلیمان وداؤد کا قبلہ، موسیٰ وعیسیٰ کا قبلہ، قبلہ نبی القبلتین کا پہلا قبلہ اقبالؒ نے مرثیہ میں کیا خوب کہا ہے ؎

خاک قدس اورا بآغوش تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

"جسم" کو جو عروج نصیب ہوا سب نے دیکھا روح کو جو مقام حاصل ہوا ہوگا اسکا

اندازہ کون کرے ؟ جسے آدمی کاندھوں پر اٹھا کر لائے اسے سب نے دیکھا جسے نورکے فرشتے ہاتھوں ہاتھ لے گئے اس کے درجے اور مرتبہ کو کون پہچانے !

ایک ایسا شخص جو ایک طرف وزیر ہند (مسٹر مانٹیگو) اور وزیر اعظم برطانیہ (مسٹر جارج) کے سامنے لندن میں گھنٹوں مسئلہ خلافت پر آزادانہ اظہار خیال کرسکتا ہو، جو عین ہیجان مخالفت کے وقت ۱۹۲۰ء میں لندن اور پیرس کی بڑی مجلسوں میں ترکوں کی حمایت میں مدلل و مفصل، شستہ و برجستہ تقریر و تحریر پر قادر ہو۔ جو وائسرائے اور گورنروں کے سامنے، سارڈا ایکٹ اور دوسرے قوانین کے سلسلہ میں مخالفانہ بحثیں کر کر کے انہیں قائل کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو جو اپنے انگریزی ہفتہ وار کامریڈ میں سیاست حاضرہ اور مذہب پر دس دس، بیس بیس کالم کے مضامین بہترین ادب و انشا کے ساتھ سپرد قلم کرسکتا ہو انگریزوں کی کلب لائف میں شریک ہو تو ایسا گھل مل جائے کہ انہیں میں سے ایک معلوم ہونے لگے اور دوسری طرف مسجد کے ممبر پر وعظ کہنے کھڑا ہو تو روتے روتے داڑھی بھگو لے، اور سننے والوں کی ہچکیاں بندھ جائیں، محفل سماع میں بیٹھے تو اس کا وجد و حال دیکھ کر دوسروں کو وجد آجائے مسئلہ قتل مرتد پر فتوئی جمہور کے خلاف جب قلم اٹھائے تو اپنے تفقہ کی داد اچھے اچھوں سے حاصل کرلے، آزاد خیال اتنا ہر کلمہ گو کو اپنا حقیقی بھائی سمجھ لے، متقشف ایسا کہ مصطفیٰ کمال اور امان اللہ خاں کو آخر تک معاف نہ کرے، نماز کا پابند اتنا کہ برطانیہ کے ایوان پارلیمنٹ کے برآمدہ میں بھی جانماز بچھا کر کھڑا ہو جائے اور اس عمارت کی ساری تاریخ میں پہلی بار رکوع و سجدہ کی ایک نظیر قائم کرے، دلیر اتنا کہ دشمنوں کے بڑے سے بڑے مجمع میں گھس جائے، سلطان وقت کے منہ پر بھرے مجمع میں سب کچھ کہہ سن کر رکھ دے۔ ادیبوں کی محفل میں ادیب، شاعروں کی مجلس میں غزل گو، اہل سیاست کی صف میں ممتاز، عوام و خواص دونوں کے اعتماد و عقیدت

سے سرفراز ایسی "معاشۃ الوردد" ہستی کی سوانح حیات مرتب کرنا کوئی آسان بات ہے؟ مذہب، سیاست، علم، ادب، تعلیم، صحافت کے سلسلہ میں جتنے بھی اہم جلسے اس پچیس، تیس سال کے اندر، اسلامی ہند میں ہوئے، بلکہ عالم اسلامی کے طول و عرض میں جو بھی اہم تحریک کسی ادارے سے اٹھی محمد علی کی شخصیت اس کے اندر کارفرما اور محمد علی کا اثر براہ راست نہ سہی بالواسطہ اس میں موجود۔ ایسے شخص کی سیرت نگاری ایک شخص کی سیرت لکھنا نہیں، وقت کی پوری تاریخ مرتب کر ڈالنا ہے، کس پہلو کو لیا جائے کس کو چھوڑا جائے، کون کون سے رخ نمایاں کئے جائیں اور کون سے مدھم ہی رہنے دیئے جائیں، کیا کیا پھیلایا جائے اور کیا کیا سمیٹ لیا جائے، ہر موضوع ایک مفصل اور مبسوط گفتگو کا طالب، ہر عنوان ایک ضخیم دفتر کا متقاضی۔

ضرورت تھی کہ اچھے جید اہل قلم اور پختہ کار مصنفین کی ایک پوری جماعت، ترتیب سوانح کا کام ہاتھ میں لیتی۔ اور وہ بھی برجستہ اور فی البدیہہ نہیں بلکہ ایک عرصہ تک تلاش و تفحص جاری رکھنے کے بعد اپنی فکر و کاوش کے نتائج ایک نہیں کئی ضخیم مجلدات میں مرتب کرکے شائع کرتی۔ لیکن حالات ساعد نہ ہونے تھے نہ ہوئے تفصیلات کو چھوڑیئے، ان اسباب کی شرح اگر کی جائے تو خود ایک رسالۂ مستقل "شرح اسباب" تیار ہو جائے۔ جمود اور افسردگی کے اس منظر کو دیکھ کر جامعہ ملیہ کا ایک نوعمر ہونہار اہل قلم آگے بڑھا اور اپنی عمر و تجربہ کی کمی کو ہمت کی فراوانی سے پورا کرکے بلا تکلف اور بے دھڑک اس بار عظیم کیلئے اپنے سر و شانہ کو پیش کر دیا، جس کے سنبھالنے کے لئے کئی کئی قوی اور تنومند پہلوان، کشتیاں نکالے ہوئے اور اکھاڑے جیتے ہوئے درکار تھے۔ آفریں در رحمت اس کی ہمت پر، آفریں در رحمت جامعہ کی مستعدی و کارگزاری پر، جامعہ، ہاں وہی محمد علی کی یادگار جامعہ ملیہ ـــــ وہ پودا جسے محمد علی نے اپنے ہاتھ سے لگایا، بڑھایا، سینچا اور پالا۔

منازل سفر کی وادیاں، اور راہ کی دشواریاں، زادِ سفر کی بے سروسامانیاں اور یارانِ طریق کی کج ادائیاں ان سب کی شکایت کیا اور کس سے کیجئے؛ اور کیجئے تو سننے والوں سے امید کیا رکھئے؛ خود جوہرہی کے الفاظ میں،

خضر کیا جانیں بھلا راہ نمائی کے مزے

بہرکیف، بہرحال چند ماہ کی مختصر مدت میں، شوق وعقیدت کے جذبات جو کچھ اپنے نقوش کاغذ کے دامن پر پھیلا سکتے تھے، وہ حاضر خدمت ہیں، یہ لخت دل ہیں ان پر "مال تجارت" کا دھوکا نہ ہو۔

آگے بڑھنے سے قبل معروضات ذیل کو ذہن نشین فرمالیا جائے۔

صاحب سیرت کی زندگی، سپاہی کی زندگی تھی، ساری عمر دشمنوں سے بلکہ اکثر تو دوستوں سے بھی لڑتے اور مقابلہ کرتے ہی گزری، ممکن نہیں کہ محمد علی کی سیرت دیانت کے ساتھ لکھی جائے اور محض بزم آرائیوں کی داستان پر ختم ہوجائے" خالد جانباز" کے وقائع کارناموں میں کوئی "حافظ شیراز" کا رنگ آخر کیوں کر بھر دے بعض نازک دلوں کے جذبات کو جابجا صدمہ یقیناً پہنچے گا اس کے لئے شروع ہی سے تیار رہو جائیے، مؤلف نے سنبھل سنبھل کر اور بہتوں کے جذبات کی رعایت کر کر کے قلم اٹھایا ہے۔ پھر بھی واقعات میں تحریف کے مجرم تو نہیں ہوسکتے تھے، علی مرتضیٰ کے سیرت نگار کے لئے جنگ صفین، اور حسین ابن علی کے سوانح نویس کے لئے میدان کربلا کے ذکر کو نظر انداز کر دینا آخر ممکن کیونکر ہے۔

---

# عروسِ ادب[1]

## تقریب

ہوش "ذی ہوش" میرے پرانے عنایت فرما ہیں حیدرآباد میں انکے عروج و زوال دونوں کا تماشا ان آنکھوں نے دیکھا ہے ۱۹۱۲ء و ۱۹۱۳ء میں ایک وقت وہ تھا، جب ہوش کی ہوشمندی کا ہر طرف چرچا تھا ذخیرہ کی کنجی ان کے ہاتھ میں تھی اور ذخیرہ زبان و ادب کا ذخیرہ کیا، یہ کہئے کہ پورا گودام بنا ہوا تھا۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ ہوش صاحب "ہوش ربا" کے اس جنت ارضی سے رخصت کر دئے گئے[2] اور ایک ظریف کو برجستہ یہ مصرعہ یاد آگیا ؎

ہوش رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

ایسے ہی واقعات عبرت سے ہم جیسے "بیہوشوں" تک کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ مزاج عاشقانہ پایا ہے اس لئے گردش تقدیر بھی کچھ عاشقوں ہی کی لازمی تھی۔ ارض "ملک نما" پر خسرو دکن کے الطاف کریمانہ سے سرفراز تھے یمین السلطنت مہاراجہ شاد کی عنایتوں سے شادکام تھے عماد الملک بہادر سید حسین بلگرامی کے سایۂ تربیت میں پروان چڑھ رہے تھے کہ دفعۃً یہی زمین ان کے حق میں آسمان بن گئی "فلک کج رفتار"

---

[1] عروس ادب از ہوش بلگرامی مطبوعہ ۱۹۲۵ء۔

[2] اور اب اس مضمون کی نظر ثانی کے وقت (۱۹۴۲ء میں) تیسری باران کے کمال عروج کا نظارہ کر رہا ہے، "ہوشیار" ہمیشہ سے تھے۔ اب چشم بد دور، نواب ہوش یار جنگ بہادر ہیں۔

[3] ہوش بلگرامی اسی نام سے ماہوار رسالہ حیدرآباد سے نکال رہے تھے۔

کے زخمی افسانے شاعری کی دنیا میں، خدا معلوم کتنی بار سنا چکے تھے اب وہ آپ بیتی تھے۔ بالآخر سرزمین رامپور کی کشش نے انہیں اپنا لیا سنا ہے کہ یہاں افواج ریاست کے بخشی ہونے کی عزت انھیں بخشی گئی ہے لیکن انہیں تو بخشی اردو کے لشکر کا ہونا تھا انکی فوج میں تو انشا کی تلواریں چلتی تھیں زبان کے پیادے بھرتی ہونے تھے، ادب کے رسالے نکلتے تھے، فصاحت کی پلٹنیں آراستہ ہوتی تھیں، بلاغت کے قلعے تعمیر ہوتے تھے، شاعری کے معرکے سر ہوتے تھے اور شاعروں کی توپیں ڈھلتی تھیں! ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر رامپور محض شاعر ہی نہیں بلکہ شاعر نواز بھی ہیں ان کے لئے اس آرزو کو واقعہ میں اور اس مجاز کو حقیقت میں تبدیل کر دینا کیا دشوار ہے۔

اردو کے ایک ادیب نے عرصہ ہوا ایک خط میں لکھا تھا کہ "ہوش تو بڑی رقم نکلے" یہ بالکل درست تھا۔ اور کیوں نہ درست ہوتا عماد الملک سید حسین بلگرامی مرحوم کی صحبت و تربیت تو بے ہوشوں کو ذی ہوش بنا سکتی تھی چہ جائیکہ اس کو جو مجسم ہوش ہو مرحوم نے ہوش کو یہی نہیں کہ مدتوں مثل اپنے عزیز کے رکھا بلکہ ان کے بعض مضامین کو بھی اپنی اصلاح سے مشرف فرمایا اور غالباً "ہوشمندی" کے انداز کے بعد ہی یہ تخلص "ہوش" بھی عنایت فرمایا تھا خدائے ہوش سے دعا ہے کہ اس "ستارہ بلندی" کی تابش میں اضافہ کرتا رہے۔

فاضل دوست مولوی عبد الحق صاحب کا ارشاد ہے کہ ہوش کے مزاج میں غضب کی جلدی ہے، جلدی ہو یا نہ ہو لیکن تیزی تو یقیناً ہے — دل تیز، ہاتھ تیز، پیر تیز، سوجھ بوجھ تیز، قلم تیز، خیریت یہ گزری کہ زبان نہیں تیز، ورنہ اور بہتیرے ہیں تیز۔ اور محض تیز ہی نہیں، بلکہ تیز و طرار۔ ان کی تیزی و طراری، شوخی و رنگینی کے جلووں کی آئینہ داری اگر مد نظر ہو تو بسم اللہ "عروس ادب" کے چہرہ سے نقاب الٹ کر خود ملاحظہ فرمائیے۔

خوش سلیقگی اور لطافت پسندی جوش کے خاص جوہر ہیں ان کے نمونے اگلے صفحات کی سطر سطر میں ملیں گے۔ ان جواہر پاروں کی قدر و قیمت کا پرکھنا، مرحوم مہدی حسن (صاحب افادات مہدی) جیسے جوہری کا کام تھا، ہم تماشائی تو محض اس بزم رنگین کی سجاوٹ کو دور سے دیکھ کر خوش ہو جاتے والے ہیں۔ عروس ادب کی کائنات میں انھوں نے اخلاق، ادب، معاشرت، سیاسیات، ہر شعبہ موجودات کا جائزہ لے ڈالا ہے اور ہر میدان میں گامزنی فرمادی ہے، لیکن ان کے پائے نازک کی سبک خرامیوں کے لئے ادبیات ہی کا فرش مخملیں کچھ زیادہ موزوں ہے! خدائے پاک انہیں زیادہ فرصت و فراغت نصیب کرے کہ زبان و ادب کی زیادہ گراں مایہ خدمات انجام دے سکیں اور جس "عروس" کا ڈولا اپنے گھر لائے ہیں اس کا اور ان کا دونوں کا نصیبہ بلند ہو!

---

# مسدّس ۱۹۳۵ء میں[1]

## تقریب

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر — عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر — ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر

اکبر و اقبال کے دور سے قبل، اپنے شعر و تغزل کے وصف آپ نے شاعر ہی کی زبان سے سن لئے۔ اپنی دو قرن قبل والی شاعری کا عکس آپ نے خود شاعر ہی کے آئینہ میں دیکھ لیا کیا اب اس کی بھی حاجت ہے کہ اس "ناپاک دفتر" کے کچھ اوراق بہ طور نمونہ، آپ کی خدمت میں پیش کئے جائیں؟ گویا دن دوپہر کی کڑی دھوپ کے وقت اس کی بھی حاجت ہوتی ہے کہ پہلے صغریٰ و کبریٰ قائم ہولیں اور انتاج مقدمات کی باضابطہ شکل مرتب ہولے جب جاکر آفتاب کے روشن ہونے کا یقین آئے۔

بات اتنی صاف اور کھلی ہوئی حقیقت اتنی روشن و واضح لیکن آج سے کوئی ساٹھ سال ادھر جب پہلی بار حالی کی زبان سے نکلی، تو بس اک آگ سی لگ گئی، اور آگ بھی کہاں؟ مادرن کی لنکا میں! عفریتوں اور راکششوں سے بھری اور پٹی پڑی ہوئی لنکا میں، بڑے بڑے بیلیس یلغار کرکے ٹوٹ پڑے، جواب کے لئے تردید کے لئے تضحیک کیلئے کوئی صاحب حال کے مقابلہ میں، قال لے کر "قالی" بن کر آئے کسی صاحب نے "خیالی" کا روپ بھرا۔ اور پنچ اخبارات کی تو پوچھئے زبان بیچاروں کا

---

[1] مسدس حالی (صدی ایڈیشن)، ناشر۔ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی تحریر ۱۹۳۵ء

تو اَذوقہ کھل گیا۔

"حالی کا حال اور میدان پانی پت کی طرح پائمال" یہ تھا ان کی تک بندیوں کا حال، اور انکی مسخرگی کا کمال! دوسروں کو بنانے سے پیشتر خود ہی مسخرے بن کر رہے۔

آج یہ سارے جرائد کہاں ہیں؟ ان اخبارات کی پرانی فائلیں تک کہیں ملتی ہیں؟ اس ساری دھوم دھامی، کڑک گرج کا کہیں نام ونشان بھی باقی ہے؟ تھیٹر کے چونی ٹکٹ والوں کی تالیاں اور بازاری پھبتیاں مدت ہوئی ختم ہو چکیں، اور ان کے مقابلہ میں "مسدس"! کیا یہ کہنے کی، یہ بتانے کی حاجت ہے، کہ اب تک کتنے ایڈیشن پر ایڈیشن اس کے نکل چکے، کتنی محفلوں میں بند اس کے پڑھے جا چکے۔ وعظ کی کتنی مجلسیں یہ گرما چکا، کتنے ادبی امتحانوں کے نصاب میں یہ داخل ہو چکا، کتنے بوڑھوں کی، جوانوں کی، لڑکوں کی، زندگی میں انقلابی اثر پیدا کر چکا کتنوں کو رلا کر یہ رہا۔ کتنوں کے دل اس نے بڑھائے غرض مقبولیت کے، مرجعیت کے جتنے بھی معیار ہو سکتے ہیں سب کے لحاظ سے آج اسے دیکھ لیجئے، جانچ لیجئے پرکھ لیجئے! بھلا ایک صاحب حال عارف، کہیں آہ وزاری کے ساتھ گرم آنسوؤں کے ساتھ، ٹھنڈی سانسوں کے ساتھ مناجات میں معروف ہو، اور شہر کے کچھ لفنگے آکر لگیں، تالیاں بجانے، ڈھول پیٹنے تو اس سارے سوانگ سے اس اللہ والے کی مقبولیت میں کچھ فرق آئے گا؟

تقریب کا عنوان، آپ کہیں گے کہ مسدس حالی کیوں نہ رکھا گیا ادھورا یعنی صرف مسدس کیوں رکھا؟ ادھر سے عرض ہوگی کہ محض مسدس بولنے سے کیا ذہن کسی دوسرے مسدس کی طرف بھی منتقل ہوتا ہے؟ اس مطلق مسدس سے کسی اور مسدس کا التباس ہوتا ہے؟ "مثنوی" مطلق بولنے سے اگر ذہن صرف مثنوی مولانا روم ہی کی جانب جاتا ہے تو مطلق "مسدس" کے لفظ سے بجز مسدس حالی کے اور کچھ کوئی کیوں سمجھنے لگا!

کسی اور سدس کا دھوکا کسی کو کیوں ہونے لگا؟ کوئی دوسرا سدس فرطِ شہرت سے فرطِ مقبولیت سے ذہنوں کے سامنے ہے کب؟

خیر یہ تو ایک لفظی سی گفتگو چھڑ گئی، اصل سوال یہ ہے کہ اس آن کا اور اس شان کا اس جمال کا، اور اس کمال کا، اردو میں کوئی دوسرا سدس ہے بھی؟ جب اپنی آج کی پستیاں دکھانے پر آتا ہے تو دیکھئے، کیسے کیسے پردے کھول کر رکھ دیتا ہے ؎

کسی کو کبوتر اڑانے کی لت ہے — کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے
چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی — مدک اور چانڈو کا رسیا ہے کوئی
ر ذالی سے دشنام سے جی چرائیں — نہ جوتی سے بیزار ہے، بچکچائیں
جو میلوں میں جائیں تو جوبن دکھائیں — جو محفل میں بیٹھیں تو فتنے اٹھائیں
لرزتے ہیں اوباش انکی ہنسی سے — گریزاں ہیں رندان کی ہمسائگی سے

اور جب اپنے گزرے ہوئے "کل" کی بلندیوں کی تاریخ سنانے لگتا ہے تو ناصح ملامت گر اک دم شاعر رجز خواں بن جاتا ہے ؎

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحیٰ کے اٹھی — پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دور دور اسکی پہنچی — جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی — ہری ہوگئی ساری کھیتی خدا کی

---

کیا جاکے آباد ہر ملک ویراں — مہیا کئے سب کی راحت کے ساماں
خطرناک تھے جو پہاڑ اور بیاباں — انہیں کر دیا رشک صحن گلستاں
بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے — یہ سب پود انہیں کی لگائی ہوئی ہے

---

خامیوں سے کون بشری تالیف آج تک بچ سکی ہے؟ کون آئندہ بچ سکے گی؟ نکتہ چینی

پر کوئی آجائے تو عیب کہاں نہیں نکل سکتا ؟ تو اس معیار کو خیر جانے ہی دیجئے، حق و انصاف کے کوچہ سے اگر آیئے تو حذالگتی یہ ہے کہ سید اپنا کام مدت ہوئی کر چکا۔ احساس کی بیداری جو اس کا مقصد تھا اس میں مدتیں گزریں کامیاب ہو چکا۔ اکبرؔ اقبالؔ جیسے سعید جانشین پیدا کر چکا، اگر اس کے بعد مٹ گیا ہوتا دنیا اسے بھول گئی ہوتی جب بھی یہ اس کی منقصت نہ تھی۔ عین فطرت کا تقاضا ہوتا۔ ضرورت دعوت پوری ہو چکنے کے بعد داعی کو باقی رکھنا سنت الٰہیہ میں داخل ہی نہیں لیکن جب کوئی اپنی بخششوں کو بغیر حساب اور بغیر شمار لٹانے والا محض فضل اور محض انعام پر آجائے تو کیا کوئی اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے ؟ جس کو جتنی چاہے دولت حیات سے سرفراز کرے اور پھر وہ جو رسول کی زبان سے توحید کی منادی کرنے پر آجائے تکبیر و تحمید کا غلغلہ ڈال دے ؎

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق

اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق — اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
- - - - - - - - - - — نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

جہاں وار مغلوب و مقہور ہیں واں — نبی اور صدیق مجبور ہیں واں
نہ پرسش ہے رہبان و احبار کی واں — نہ پروا ہے ابرار و احرار کی واں
- - - - - - - - - - — مری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا

سب انسان ہیں واں جس طرح سر فگندہ — اسی طرح میں بھی ہوں ایک اس کا بندہ
بنانا نہ تربت کو میری صنم تم !!! — نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم — کہ بیچارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بڑائی — کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی

اور لغت گوئی کی لے جب چھیڑے تو منہ کے بول یوں زمزمے بن بن کر نکلنے لگیں ؎

ہوئی پہلوے آمنہ سے ہویدا دعائے خلیل اور نوید مسیحا
وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنیوالا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
اتر کر حرا سے سوے قوم آیا اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور جب دربار رسالت میں فریاد و استغاثہ کرے تو سننے والوں کے دل ہلاکر رکھدے ؎

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
اے چشمۂ رحمت بأبی أنتَ وامّی !!!
دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے
جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا
جب تو نے کیا نیک سلوک ان سے کیا ہے
برتاؤ ترے جب کہ یہ اعدا سے ہیں اپنے
اعدا سے غلاموں کو کچھ امید سوا ہے
کر حق سے دعا امت مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آکے گھرا ہے
امت میں تری نیک بھی ہیں، بد بھی ہیں لیکن
دلدادہ ترا ایک سے اک ان میں سوا ہے
جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرف
اب تک وہی قبلہ تری امت کا رہا ہے

جس ملک نے پائی تری ہجرت سے سعادت
کعبہ سے کشش اس کی ہراک دل میں سوا ہے
ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمھارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال برا ہے
گر بد ہیں تو حق اپنا ہے کچھ تجھ پہ زیادہ
اخبار میں الطالح لی ہم نے سنا ہے
تدبیر سنبھلنے کی نہیں کوئی ہمارے
ہاں ایک دعا تیری کہ مقبول خدا ہے
خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں
پر فکر ترے دین کی عزت کی سوا ہے
گر دین کو جوکھوں نہیں ذلت سے ہماری
امت تری ہر حال میں راضی بہ رضا ہے

زندگی اس کلام کو کبھی نصیب نہ ہوگی تو اور کس کو ہوگی! حق یہی ہے کہ اسکی عمر بڑھے، اور خوب بڑھے اور ہم جیسے حشرات الارض قسم کے فانیوں کے تخیل سے، اندازہ سے، کہیں بڑھ کر رہے۔

---

# سفر سعادت[1]

## (تعارف)

ایک نام کے "امیر" اور دل کے فقیر کا، میرا ساتھ عرفات کے میدان میں رہا منیٰ کی قربانگاہ میں رہا، مزدلفہ کی گھاٹیوں میں رہا، صفا کی بلندیوں پر رہا، مکہ کی سڑکوں پر رہا۔ مدینہ کی گلیوں میں رہا، بندرگاہ جدہ کے دفتروں میں رہا، جہاز رحمانی کے تختوں پر رہا، خشکی میں رہا، تری میں رہا، غرض سفر سعادت کی اکثر منزلوں اور بیشتر حصوں میں رہا پھر اگر اس روزنامچہ سعادت کی پیش خوانی مجھ گمنام مشت خاک کے نصیب میں آرہی ہو، تو اس سعادت پر کسی کو رشک اور کسی کو حیرت کیوں ہو؟ بلبل کے فخر و مسرت کے لئے یہ کافی ہے کہ "گل" سے اس کا قافیہ مل جاتا ہے۔

روزنامچہ کے مصنف ایک پرانے مشاق اہل قلم ہیں۔ لیکن جب سفر حج کو نکلے تو اپنا قلم یہیں چھوڑتے گئے۔ زاد سفر میں بس پہلو میں ایک دل تھا جو درد سے چھلک رہا تھا وہاں جو کچھ دیکھا، جو سنا اسے سادہ زبان میں اپنی یادداشت کے لئے فرٹ کرتے گئے۔ ذوق تشنگی نے اجازت نہ دی کہ پبلک کے لئے کوئی تصنیف تیار کریں شاعری کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ بہترین شعر وہ نہیں جو دنیا کو سنانے کے لئے کہے جاتے ہیں بلکہ وہ ہوتے ہیں جو خود اپنے لئے کہے جاتے ہیں۔ بعض اوقات نثر کی کتابیں بھی شاعری کے اس معیار سے جانچنے کے قابل ہوتی ہیں سفرنامے آپ نے بہت سے دیکھے ہوں گے

---

[1] از مولوی حاجی امیر احمد صاحب علوی کاکوروی بی اے شائع شدہ ۱۹۳۰ء

اس مجموعہ اوراق کا انداز سب سے نرالا پائیں گے یہاں مصنف دوسروں کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو مخاطب کئے ہوئے ہے زیادہ سے زیادہ اس لطف میں اپنے مخصوص احباب واعزہ کو شریک کرنا چاہتا ہے یا ان لوگوں کو جو مصنف ہی کی طرح اس سفر سعادت سے بہرہ اندوز ہو چکے ہیں، اور بس۔ مصنف صاحب اپنی روداد سفر کو زیادہ رنگین اور مرصع ادیبانہ وانشا پردازانہ بنا سکتے تھے اگر چاہتے، لیکن اس سادہ اور بے تصنع پیرایہ تحریر کی دلکشی ہی کچھ اور ہے شام کو ہوا خوری کے لئے ہزار بن سنور کر باہر نکلئے، وہ بات کہاں جو گھر کے اندر بے تکلف، کھلی، بالطبع بیٹھنے اٹھنے میں ہے۔

لیکن یہ خیال نہ گذرے کہ مصنف آنکھیں بند کر کے گئے تھے اور صرف چند گھریلو باتیں اپنی نوٹ بک میں ٹانک کر اسی طرح آنکھیں بند کئے واپس چلے آئے انھوں نے جو کچھ دیکھا، کم لوگ دیکھتے ہیں، اور ان سے بھی کمتر زبان پر لاتے ہیں۔ انہیں عید مکہ میں آتی ہے اس جشن کی خوشیاں انھوں نے "سفر سعادت" کے صفحات پر خوب منائی ہیں، لیکن اس کے بعد ذرا دل تھام کر ان کے الفاظ ذیل بھی پڑھ لیجئے۔

"میں ہندوستان کا رہنے والا۔ عقیدہ کا بودا۔ ایمان کا کمزور۔ اسباب وعلل پر نظر کرنے والا۔ اور علت العلل سے غافل، آج دارالسلام کی عید اور یہاں کی شان شوکت دیکھ کر جتنا خوش ہوا۔ اتنا ہی چند باتوں سے ملول بھی ہوا، خوشی کا بیان ہو چکا، اب غم کی داستان سنئے۔

حجاز کا بیشتر حصہ یورپ کی حکومت سے بحمداللہ ابھی نیم آزاد ہے لیکن عربستان کی اقتصادی فتح لندن کو حاصل ہو چکی ہے یہاں کے بازار انگلستان کے مصنوعات سے بھرے ہوئے ہیں آج شہر میں ہزاروں روپے کے کھلونے فروخت ہو رہے ہیں اور وہ سب یورپ کے بنے ہوئے ہیں، ربڑ کے گیند، ربڑ کے پھکنے، ربڑ کے غبارے

ٹین کے انجن، ٹین کی ریل گاڑیاں اورارگن باجے وغیرہ لاکھوں کی تعداد میں
بک رہے ہیں کوئی لڑکا مجھ کو نظر نہ آیا جس کے ہاتھ میں دو چار کھلونے اس قسم
کے نہ ہوں افسوس ہے کہ غریب حاجی کی کمائی! اہل مکہ کے کام نہ آئی، بلکہ یہاں سے
بھی اسی طرح ولایت کو پہنچتی ہے، جیسے ہمارے بدنصیب ملک سے جاتی ہے عبرت کا
مقام ہے کہ صرف موٹر کے لوازمات جو اس سال انگلستان سے آئے ہیں۔ ان کی قیمت
اکاسی ہزار پونڈ تھی! یہ لوازمات یورپ کے دوسرے مقامات سے بھی آئے تھے
گر ان کی قیمت مندرجہ بالا حساب میں شامل نہیں، ایک موٹر پر کیا موقوف ہے،
یہاں کی تقریباً ہر ایک جنس انگلستان ہی سے آتی ہے اور تمام دنیائے اسلام کی
کمائی مکہ کے راستے سے یورپ پہونچتی ہے افسوس ہے کہ یہاں کی عورتوں کو انگریزی
فیشن کی طرف بدرجہ غائت رغبت ہوگئی ہے برقعہ کسی وقت زینت چھپانے کیلئے
تھا مگر افسوس اب اس کا مقصود زینت دوبالا کرنا ہے۔ زرق برق ریشمی کپڑوں
اور اطلسی تھانوں کے برقعے بنائے جاتے ہیں، اور ان کی چمک دمک خواہ مخواہ ہر
شخص کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے۔ نابالغ لڑکیاں جو بے نقاب پھرتی ہیں وہ سراپا
انگریزی لباس میں ہیں، وہی ریشمی سائے اور وہی اونچی ایڑی کے بوٹ۔ چو کفراز
کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی اور آگے بڑھیے اور خون کے آنسو بہائیے:۔

انگریزی مٹھائیاں، انگریزی بسکٹ بازار میں بھرے پڑے ہیں۔ سگرٹ وچائے
شرط زندگی ہے گولہ بارود ولائت سے آتا ہے، ڈاک کے ٹکٹ ولائت سے چھپ کر
آتے ہیں ریال و قرش لندن سے بن کر آتے ہیں۔ کپڑا انگلستان سے آتا ہے اناج
کے لئے ہمیشہ ہی سے یہ وادی غیر مزروعہ ہے یہاں کی خالص پیداوار صرف ترلوز ہیں
یا زمزم کا مقدس پانی، اونٹ معاش کا ذریعہ تھے اور شریف حسین سابق ملک الحجاز
کے قول کے مطابق جس وقت اونٹ کا بچہ پہلی بار مکہ میں آتا تھا اس وقت سے

اس ساعت تک جبکہ وہ صرف پوست واستخواں کا ڈھانچہ رہ جاتا تھا۔ ہر ایک اونٹ ۱۰،۱۴ خاندانوں کی پرورش کرتا تھا کیونکہ اس آلۂ بار برداری کے تمام لوازمات مکہ یا اس کے ملحقات ہی میں تیار ہوتے تھے مگر اب موٹروں کی بدولت وہ رزق کا دروازہ بھی قریب قریب بند ہے ایک شرمناک بات ہے جس کو لکھتے قلق ہوتا ہے کہ جوان عورتیں بازار میں حاجیوں سے خیرات طلب کرتی ہیں اوران کو روپیہ وصول کرنے کے لئے اغیار سے بغل گیر ہو جانے میں بھی غیرت نہیں آتی، زیادہ لکھنا خلاف تہذیب ہے۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

دل کڑا کرکے ایک قدم آخری بار اور اٹھا لیجئے۔

معاشرت کا یہ حال تھا، اب سیاسیات پر غور کیجئے۔ جدہ میں خطبہ وسکہ سلطان ابن سعود کا ہے لیکن حکومت درحقیقت برٹش کانسل کرتا ہے ابن سعود کے لونڈی غلام بھاگ کر انگریزی سفارت خانے میں پناہ لیتے ہیں اور کانسل جنرل ان کو جہازات پر سوار کراکے بے تکلف ملک سے باہر نکال دیتا ہے لیکن ملک الحجاز دم نہیں مار سکتا، کانسل کی اجازت کے بغیر کوئی قافلہ جدہ سے مکہ یا مدینہ نہیں جا سکتا مگر بادشاہ کو دخل دینے کا اختیار نہیں، سفارت خانے نے افغانیوں کو دھمکی دی کہ اگر انھوں نے واپسی کے ٹکٹ واکس کانسل کے پاس جمع نہ کئے تو وہ مکہ نہ جانے پائیں گے۔ یکہ عرب کا (بزعم خود) خود مختار بادشاہ زبان ہلانے کی مجال نہیں رکھتا، مکہ معظمہ اللہ کی حفاظت میں ہے مگر انگریزی کانسل جس دن چاہے چند گھنٹوں میں یہاں قبضہ کرسکتا ہے نجدی فوج جو یہاں مقیم ہے وہ قواعد داں تو کیا ہوتی، آلات حرب سے بھی صحیح طور پر مسلح نہیں ہے جس نے جمعۃ الوداع کے دن اور آج بھی ان کا جلوس دیکھا کسی پاؤں میں جوتا ہے کوئی چپل پہنے ہے اور کوئی ننگے پاؤں کاندھے پر بندوق رکھے چل رہا ہے کارتوس کی

بیٹیاں کمریں بندھی ہیں معلوم نہیں خالی ہیں یا بھری ہوئی مگر بندوقیں ٹوٹی ہوئی اور زنگ خوردہ ہیں یہ ہر شخص دیکھ سکتا ہے ہندوستان میں حیدرآباد، گوالیار اور اندور کی فوجیں اس سلطانی لشکر سے زیادہ آراستہ دپیراستہ ہیں۔"

نجدیوں نے مزارات ومشاہد کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اور قبور صالحین کی جس طرح توہین کی ہے خوش عقیدہ وصوفی مشرب مصنف کا دل اس سے قدرتاً دکھا اور یہ دل کی دکھن آپ کو ان اوراق میں جابجا نظر آئے گی ساتھ ہی حکومت سعودیہ نے جو بے نظیر امن وامان قائم کر رکھا ہے، مصنف کی انصاف پسندی اس سے بھی اغماض روا نہیں رکھتی۔ اس کا اعتراف آپ کو ہر مناسب موقع پر ملے گا۔

مصنف صاحب کو "معلم" کے جن مظالم سے پالا پڑا تھا ان کا تذکرہ اس بسط و تفصیل کے ساتھ ممکن ہے بعض نازک طبائع کو گراں گزرے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ

؎ شب تاریک وبیم موج وگردابے چنیں حائل

کا اندازہ "سبک ساران ساحل" کسی طرح کر ہی نہیں سکتے، جس غریب کو قدم قدم پر اگر "فسوق" نہیں تو "جدال" پر مجبور ہو جانا پڑتا ہو، مستحبات وسنن سب ایک ایک کرکے ہاتھ سے جا رہے ہوں سکون قلب وانبساط کے بجائے ہر لحہ انقباض و تشویش کا شکار بننا پڑ رہا ہو بلکہ دھڑکا یہ لگا ہو کہ سارا حج ہی غارت ہوا جا رہا ہے اسکا تو ردیاں ردیاں معلم کی جان کو رو دے گا یہی غنیمت ہے کہ وہ سفرنامہ کی جگہ معلم "سکندر" کے کارناموں کے بیان میں پورا سکندرنامہ" نہیں لکھ ڈالتا دوسروں کو ایسے خطرات سے آگاہ کردینا جائز ہی نہیں واجب ہے۔

کوئی بشری کوشش بشری لغزشوں سے پاک نہیں رہ سکتی مصنف نے اپنے اس نیازمند کا ذکر ان اوراق میں متعدد مقامات پر کیا ہے لیکن کہیں کہیں تو افراط حسن ظن کا کمال ہی دکھا دیا ہے، اور اپنی ساری شہرت ثقاہت خاک میں ملاکر

رکھ دی ہے۔ محدثین کرام نے صوفیہ ومشائخ سے روایات قبول کرنے میں جو احتیاط برتی ہے اس کی حکمت کا یقین تو پہلے سے تھا ہی اب عین الیقین ہو گیا۔

مشک کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اگر آپ کا شامہ درست ہے تو آپ مشک کے سامنے آتے ہی خود اسے پہچان لیں گے اور عطار کی ہر لسّانی اور چرب زبانی سے قطعاً مستغنی رہیں گے یہاں بھی دیار حبیب سے آیا ہوا مشک آپ کے سامنے حاضر ہے اگر مشام جاں کہیں خوشبو محسوس کر لے تو مصنف اوراق کے ساتھ اس نامہ سیاہ تعارف نگار کے حق میں بھی دعائے خیر فرما دیجئے گا اللہ آپ کو جزائے خیر سے محروم نہ رکھے گا۔

---

# سیرت سید احمد شہیدؒ[1]

## (تعارف)

حضرت سید احمد رائے بریلوی پچھلی صدی ہجری کے ان اکابر و مشاہیر میں گزرے ہیں جن کی یاد مسجدوں اور خانقاہوں کی دنیا الگ رہی لندن اور آکسفورڈ اور کیمبرج کی دنیا کے بھی حافظہ سے محو نہیں ہوئی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ان کے تذکرہ سے مزین انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ذکر ان کا موجود انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں کارنامے ان کے مذکور۔ یہ الگ بات ہے کہ دوست انہیں عقیدت کی آنکھوں کے اندر جگہ دیتے ہیں اور دشمن کی نگاہ میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں لیکن نظریں اس شہید پر بہرحال پڑتی ہی ہیں ؎

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں<br>
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

جس کا نام ملائکۂ ربانی کے نورانی رجسٹروں میں درج ہو اسکے تذکروں اور چرچوں سے اگر خاکیوں کے سینے، اور آدم زاد کے سفینے معمور رہیں تو اس پر حیرت نہ کیجئے!
سید صاحب کے سوانح و حالات، کرامات و کمالات میں ضمناً و مستقلاً اسوقت تک متعدد کتابیں موجود تھیں لیکن اکثر نے سید صاحب کو ایک مخصوص و محدود ہی نقطۂ نظر سے دیکھا ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من     وز درون من نجست اسرار من

---

[1] از مولانا ابوالحسن علی ندوی طبع ۱۹۳۹ء

ضرورت اس کی تھی کہ کوئی سیرت ملک کی عام زبان میں، سلجھے ہوئے انداز سے ایسی لکھی جائے جو آپ کی ساری حیثیات کی جامع ہو اور جس میں عام پسند خوارق وعجائب سے زیادہ لحاظ واقعات کی صحت واستناد کا اور آپ کی تحریک کے اصل مقاصد کا رکھا جائے۔

شکر ہے کہ یہ سعادت سو برس سے زائد عرصہ گزر چکنے کے بعد اسی خانوادہ کے ایک ہونہار دصاحب رشد جواں ہمت اہل قلم کے نصیب میں آئی کتاب میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک مجاہد کی سوانحعمری میں ہونا چاہئے لیکن زور یہاں صرف شرق غزائی پرنہیں ختم ہوگیا ہے علوم شریعت مسائل طریقت، مباحث سیاست سب اپنی اپنی جگہ پر حسن ترتیب اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس محفل میں جمے ہوئے نظر آئیں گے زبان صاف سلیس وشیریں بیان میں نہ اتنا اختصار کہ پڑھنے والے کا شوق جھنجھلا اٹھے نہ اتنی طوالت کہ مطالعہ کرنے والے کی ہمت جواب دے نکلے پھر سید صاحب اور اسمٰعیل شہید کے ساتھ ساتھ ان کے اور سارے رفقاء نامدار کے بھی انفاس بابرکات، گویا سپہر جہاد وخدمت دین کے آفتاب و ماہتاب کے جلو میں ستارے اور سیارے بھی ہر طرف سے سمٹ کئے ہوئے۔

کم از کم ایک سبق تو کتاب کے مطالعہ سے عالم وعامی ہر بڑھے اور جوان خاص وعام سب کے لینے کا ہے اور وہ سبق نظم واطاعت کا ہے اگر اندرونی نظم درست نہیں، اگر خارجی شان انتظام وتدبر کی روح جسم میں دوڑی ہوئی نہیں ہے تو زیادہ سے زیادہ ایثار واخلاص اور بڑے سے بڑا جوش وولولہ بھی اس عالم اسباب میں بیکار وضائع ہو کر رہتا ہے اگر یہی ایک سبق پڑھنے والے حاصل کرلیں گے تو بہت کچھ حاصل کرلیں گے۔

مشک کی مدح وتوصیف عطار کی زبان سے مشک کی قدر وقیمت بڑھاتی نہیں اور گھٹا دیتی ہے عطار ہٹا جاتا ہے، مشک حاضر ہے، بے تکلف مشام جاں معطر فرمائیں۔

---

# تاریخ نظم اُردو[1]

## پیش لفظ

بدنصبی کہئے یا بدباطنی، واقعہ یہ ہے کہ کوئی تین سال ہوئے صوبہ کی ہندوستانی اکیڈمی کے اجلاس خاص میں جب ناطق صاحب اپنی نظم سنانے کھڑے ہوئے تو ان سطور کے راقم آثم نے سننا شروع کیا، نکتہ چینی وعیب جوئی کے کانوں سے لیکن ابھی پہلے بند کا پہلا ہی شعر شاعر کی زبان سے ادا ہوا تھا کہ شکاری خود شکار بن چلا اور جو اعتراض کی کمین گاہ میں بیٹھا تھا وہ اعتراف کے میدان میں آنے لگا اور دو ہی بند پورے ہوئے تھے کہ زبان پر بے اختیار واہ واہ سبحان اللہ کے نعرے آنے لگے اور جو منتقد تھا اسے معتقد بنتے بن پڑی۔ جگ بیتی تو خبر نہیں آپ بیتی یہ تھی۔ اب چاہے اسے کہہ لیجئے شاعری کی ساحری یا زبان وادب کی افسوں گری، بہرصورت یہ تھی نطق ناطق ہی کی کرامت کلام ناطق کا اعجاز!

وہی نظم اب مکمل صورت میں آپ کے سامنے ہے تعارف حیران ہوں کیونکر کرایا جائے مشک کے تعارف کے لئے خود عطار کا زبان کھولنا خوشبوئے مشک کی توہین کرنا ہے چہ جائیکہ اس کی جسارت وہ کرے جو عطار بھی نہیں! حسین وجمیل چہرہ کے حسن وجمال کے ادراک کے لئے ضرورت تو صرف آنکھ کی ہے زبان ایسے موقع کے لئے بالکل بے زبان دیدار کا کام گفتار؟ آخر کیونکر دے سکے دن کے پھیلے ہوئے اجالے میں یہ کہنا کہ دیکھو آفتاب

---

[1] از حکیم ابوالعلا سعید احمد صاحب ناطق طبع ۱۹۳۷ء

کیسا روشن ہے یہ تعارف آفتاب کا نہ ہوا یہ در پردہ اپنی تعریف ہوئی کہ ہم بھی چشم روشن و آفتاب شناس رکھتے ہیں ؎

مادح خورشید مداح خود است
کیں دو چشمم روشن و نامرمدست

ایک گوشہ نشین دیہاتی کے لئے بیش لفظ کا ایماد رحقیقت خود اسکی عزت افزائی ہے کہ تو بھی اس قابل ہے کہ بزم ادب میں درآئے اور سخن سنجوں کی محفل میں بار پائے۔

اچھا شعر تو یہ ہے جو آفتاب کی روشنی کی طرح خود اپنے کو منوائے مسدس ناطق۔ کی بسم اللہ سنئے ؎

گفتگو ناطق یہ ہے آغاز اردو کب ہوا
جستجو یہ ہے کہ ظاہر راز اردو کب ہوا

"زبان کا مسئلہ اور اس کا آغاز" گفتگو سے سبحان اللہ اور بہر معاً "ناطق" مومن خاں مرحوم کے مقطعوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ گفتگو کے معنی محاورہ میں محض بات چیت کے نہیں "سوال" یا "مسئلہ" کے بھی ہیں اور دوسرے مصرعہ میں ٹھیک اسی کے وزن و مفہوم کا لفظ "جستجو" صنعت مناسبت لفظی کو تو لکھنؤ کے چند قافیہ بندوں نے سوء استعمال اور افراط بے جا سے غارت اور بدنام کر دیا۔ ورنہ اگر اپنے حدود کے اندر قرینہ سے رہے اور کلام میں ٹھونس کر نہ لائی جائے بلکہ بے تکلف آجائے تو یہ حسن انشار کی جان ہے۔

انجمن میں نغمہ آرا ساز اردو کب ہوا
ساز بزم ہند ہم آواز اردو کب ہوا

وہی توازن جو پہلے شعر میں تھا، اس دوسرے شعر میں بھی موجود۔

ایک ہی دھن سنتے سنتے ہوگئے ہیں کان سن دعوئ ایجاد اردو کی لگی ہے سب کو دھن

دھن، پہلے مصرع میں، بہ اصطلاح موسیقی ہے دوسرے میں اپنے عام معنی میں، اور بات

کتنی سچی ہے تاریخ کی تاریخ اور شاعری کی شاعری،

اب آگے کہنا یہ ہے کہ جسے دیکھئے ایجاد اُردو کا سہرا اپنے ہی سر باندھنا چاہتا ہے دہلی والے کہتے ہیں کہ اردو کی زچہ گیریاں ہم نے گائی ہیں۔ دکن والے بولے کہ پودے کا تخم تو ہماری سرزمین پر پڑا ہے۔ پنجاب سے آواز آئی کہ یہ دریا ہمارے ہاں سے رواں ہوا ہے۔ بہار نے دعوے کیا کہ اس بہار نے تو سب سے پہلے ہمارے چمن کو کھلایا ہے۔ اب دیکھئے جناب ناطق اس چوکھے چراغ کو کس حسن ادا سے روشن کرتے ہیں اور شاعری کے دھاگے میں کس لطافت سے تاریخ کے موتی پروتے جاتے ہیں:

دہلوی، بازار اردو میں خریدار زباں

دکھنی دربار اردو میں گہربار زباں

عہد محمودی سے ہے پنجاب سرکار زباں

بودھ تک پہنچے بہاری لے کے زنّار زباں

یہ الفاظ لائے ہیں یا ایک ایک مصرع کی انگوٹھی میں نگینہ پر نگینہ جڑتے چلے گئے ہیں آگے فیصلہ ناطق ملاحظہ ہو ؎

اک مورخ کیا کہے کب اور کہاں پیدا ہوئی

ملک میں تاریخ سے پہلے زبان پیدا ہوئی

پوچھنا تاریخ سے پیدائش اردو کا حال

کمسنوں سے ہے بزرگوں کی ولادت کا سوال

خوب اور بہت خوب ابد توں کی جنگ وجدل کا فیصلہ کس طرح آناً فاناً ہو جاتا ہے یک بیک آنکھیں کھل جاتی ہیں کہ یہ کیسی نادانیاں تھیں! یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کے بچے آپس میں الجھتے جھگڑتے، بزرگ خاندان کے پاس آگئے ہیں جو بزرگ سن وسال ہی کے لحاظ سے نہیں، فہم ودانش کے اعتبار سے بھی) اور وہ چٹکی بجاتے

سارے جھگڑے چکا دیتا ہے لیکن ایسا جواب نہ محض شاعر کو سوجھ سکتا ہے نہ اکیلے مورخ کے بس کی بات ہے یہ وہی دے سکتا ہے جو ایک ہی وقت میں شاعر بھی ہو اور مورخ بھی اور ساتھ ہی نظر فلسفہ تاریخ ولسانیات پر بھی رکھتا ہو۔

فرماتے ہیں کہ بات یہ نہیں کہ جہاں ادھر کوئی دو قومیں بخت واتفاق سے اکٹھی ہوگئیں اور ادھر دونوں کی زبانوں سے مل جل کر ایک تیسری زبان وجود میں آگئی، بلکہ تجربہ تاریخی کا نچوڑ اور حکمت لسانیات کا عطریہ ہے کہ دو قوموں کے جغرافی اتصال کے ساتھ ساتھ ان کا ہم تمدن ہونا اور باہم مناسبت رکھنا بھی شرط ہے جب کہیں جاکر تیسری اور نئی زبان پیدا ہوتی ہے عجب نہیں کہ اس نظریہ اور کلیہ تک پہنچنے میں حکیم ناطق صاحب نے کام اپنے مدت العمر کے طبی تجربہ سے بھی لیا ہو۔ نر اور مادہ اگر مختلف النوع ہیں تو ایسے جوڑے کو بار ور ہوتے آج تک کس نے دیکھا ہے؟ بہرحال آگے شعر سنئے اور لفظی مناسبتیں جو آرہی ہیں ان کا مزہ دل ہی دل میں لیتے جائیے۔

ہند تیرہ سو برس سے مسلموں کا ہے مقام
واعظوں سوداگروں اور صوفیوں کا ہے قیام
اہل سند، اہل عرب ہیں سب کے سب ابنائے سام
ہم نسب، ہم جنس، اہند وکیا کبھی ہوتے نرام

شاعری کا لطف اپنے ذوق سلیم پر چھوڑیئے تاریخی اعتبار سے وہ نثر کے حواشی پڑھتے جائیے، جو ہر بند کے مقابل گنجان لکھے ہوئے پورے پورے صفحہ پر شروع سے آخر تک درج ملیں گے۔ پہلے شعر کے حاشیہ میں مسلمانوں کی آمد ورفت ہندوستان میں پہلی صدی ہجری کے [illegible] سے دکھائی گئی ہے اور [illegible] سے لے کر [illegible] تک ۱۲ مسلم فوجوں کے داخلہ ہند کی فہرست دیدی گئی ہے اور تیسرے مصرعہ پر مصنف کا حاشیہ ہے کہ حام کی نسل سے اہل حبش اور ہندوستان کے قدیمی باشندے ہیں۔ یافث کی اولاد سے

ترکی اور منگولین (مغل) اور سام کی نسل سے عرب، آرین یورپین اور ایرانی وغیرہ ہیں لہٰذا ہندوستان کے شرفا اور عربی و ایرانی ہم نسب ہیں۔" (ص)

یہ حاشیہ محض مصنف کی تحقیق اور نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے نقل کر دیا گیا۔ یہ غرض نہیں کہ تعارف نگار مصنف کے ایک ایک فقرہ اور لفظ کو آئت و حدیث سمجھ رہا ہے، اچھا تو مصنف پہلے یہ کلیہ قائم کرتے ہیں کہ

ہو گا جن قوموں کی فطرت میں ازل سے اتحاد
جب کبھی وہ ایک جگہ ہو جائیں گے آباد و شاد
دونوں قومیں ہم سخن ہم داستاں ہو جائیں گی
مل کے دونوں کی زبانیں یک زباں ہو جائیں گی

اور پھر ہند و عرب کے قدیم ترین تعلقات کو یوں بیان فرماتے ہیں ؎

میل میں صبح عرب سے کب تھی شام ہند کم
مختلف ہونے پہ بھی ملتے ہیں زلف و رخ بہم
دل ربائی کو بتان ہند پہنچے تا حرم
ہو گئے تھے ایک مل کر کعبہ و بیت الصنم

تیسرے مصرعہ پر حاشیہ ہے کہ عرب کے بعض بت ہندوستان سے گئے تھے اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا ؎

صورت و معنی کی آپس میں ملاقاتیں ہوئیں
پہلے مستعمل ہوئے الفاظ پھر باتیں ہوئیں
فارسی عربی کے اسما ہند میں داخل ہوئے
اور افعال و مصادر ہند کے شامل ہوئے

اور معاً اردو کی بنیاد پڑ گئی۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس ملاپ کی سب سے پہلی سرزمین

زمین پنجاب تھی سے

بس کہ قصر ہند کا پہلا ہی در پنجاب تھا،
اس لئے اردو کا اول مستقر پنجاب تھا

لیکن

جیسے خط رخ کا بڑھے ابر کی جدول چھوڑ کر
بڑھ چلا یوں نقش ثانی نقش اول چھوڑ کر
تخم جو الفاظ کے بوئے گئے پنجاب میں
لائے قطب الدین اس کو دہلی شاداب میں

اب دہلی مرکز بنا، اور اس مرکز سے ہر ہر صوبہ میں

ہر سپاہی اپنے ساتھ اردو کا لشکر لے گیا

سپاہی "اردو" اور "لشکر" لفظی لطافت کی داد بار بار کہاں تک دی جائے
خلاصہ یہ کہ۔

نقش یوں بیٹھا اودھ میں نام اردو چل گیا
تھے بہاری نرم دل، خیران پہ جادو چل گیا حد یہ ہے بنگال پر بھی اس کا جادو چل گیا
آج اگر آئی ادھر تو کل اُدھر چلتی ہوئی
اف یہ اتنی سی زبان اور اسقدر پھلتی ہوئی

مسدس کی لفظی و معنوی خوبیوں کے اندازہ کے لئے اتنے اقتباسات بہت ہیں ورنہ اب کیا پیش لفظ میں ساری کتاب ہی نقل کر دی جائے، گو جی یہی چاہتا ہے۔
شاعری کی ساحری آپ دیکھ چکے اب نثر کی فسوں کاری کا ایک نمونہ دیکھتے چلئے مصنف کو لسانی نکتہ یہ بیان کرنا ہے کہ ہندو مسلم اختلاط کے بعد جب اسماء عربی و فارسی زبانوں سے ہندوستان میں آنے لگے تو افعال و مصادر کہیں باہر سے نہیں آئے خاص اسی سرزمین سے پیدا ہوئے اس مسئلہ کو یوں تشبیہ و تمثیل کی زبان میں

بیان کرتے ہیں کہ گویا کسی علمی مسئلہ کی تحقیق نہیں ہو رہی ہے، بلکہ کوئی شفیق، مہربان ماں اپنے بچوں کو لوریاں سناتی جاتی ہے :۔

ان الفاظ و اسماء نے صرف اپنی ہی ذات کے لئے ہندوستان کو مستقل وطن نہیں بنایا بلکہ یہاں انھوں نے اپنے بال بچے پیدا کئے اور ان کے ہزاروں خاندان ہمیشہ کے لئے اس ملک میں آباد ہو گئے مثلاً تپ، فارسی اور سنسکرت میں بھی گرمی و بخار، ہندی میں آئی اس سے "تپنا" مصدر پیدا ہوا پھر اسی کا متعدی تپانا بھی بن گیا ان دونوں مصدروں کا خاندان یعنی پوری گردان الگ رکھئے "تپ" سے ایک لڑکی پیدا ہوئی "تپک" اس سے "تپاک" عالم وجود میں آیا یا مثلاً "چارہ" ہند میں آکر متوطن ہوا یہ پہلے تو عالی خاندان تھا "چارہ ساز و چارہ گر" اس کی نسل میں تھے مگر چھوٹی قوموں کی صحبت میں چارہ جانوروں کی غذاؤں میں شامل ہوا یہاں تک کہ چرواہے اور چرکٹے پیدا ہونے لگے بہت سے ایرانی النسل اور عربی النسب الفاظ و اسماء نے ہندی بچاروں سے بھائی چارہ پیدا کر لیا اور ایسا میل جول بڑھا لیا کہ دونوں کا ایک دوسرے سے جدا ہونا محال ہو گیا جیسے "بیلدار" "پیچکار" "سمجھدار" "سرجوڑ" "منہ زور" وغیرہ ایک قسم ایسے الفاظ کی ہے جن کی صورت ویسی ہی رہی، مگر سیرت بدل گئی، جیسے "مشکور" "جذبات" "شائق" "محرم" وغیرہ (صفحہ ۱۷۔ ۱۸)

اندازہ کے لئے ایک نمونہ بالکل کافی ہے مزید اقتباسات سے معاف ہی رکھا جائے اس لئے کہ تمہید کے حجم کو تصنیف کے مساوی بنانا ہرگز مقصود نہیں۔

البتہ بڑی ناانصافی ہوگی، اگر اصل تصنیف کے متن و حواشی (نظم و نثر) کے ساتھ فاضل مصنف کے مبسوط مقدمہ کا ذکر نہ کیا جائے اکثر اہل قلم اپنا سارا زور اصل تصنیف پر

صرف کردیتے ہیں اور چند سطریں چلتی ہوئی مقدمہ کے نام سے لکھ اس پر کسی طرح چپک دیتے ہیں یہاں یہ صورت نہیں۔ مقدمہ خود ایک مستقل تصنیف کی حیثیت داہمیت رکھتا ہے اور جو جو مسائل زبان ادب شاعری کے اس کے اندر آگئے ہیں ان کے لحاظ سے اول سے آخر تک پڑھنے کے قابل ہے۔

اردو غزل پر یہ اعتراض آپ نے بارہا سنا ہوگا کہ "آخر اس میں حزن وغم کے مضامین لانے کی کیا ضرورت ہے اسے تو شگفتہ ہونا چاہئے جواب حضرت ناطق کی زبان سے سنئے اور جواب کے بانکپن کی داد، دل اور زبان دونوں سے دیتے جائیے۔

"یہ ایسی بات ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ نوحہ ومرثیہ میں غم وماتم کی کیا شرط ہے۔ غزل کے معنی ہی یہی ہیں کہ با معشوق سخن گفتن و درد دل را نظم کردن" اس کے خلاف وہی شخص ہو سکتا ہے جو لفظ کے معنی بدل دینے کی قدرت رکھتا ہو اور اپنی عقلمندی سے یہ امید رکھتا ہو کہ اور لوگ اس کی تقلید کریں گے۔ اب رہا یہ امر کہ غزل کے ہر شعر میں اظہار غم وتمنائے مرگ بے شک مذموم ہے مگر غم سے کنارہ کشی ابی کا کام ہے جو اپنی اصل حقیقت سے بے خبر ہے عشق مجازی میں اظہار عشق عیب ہے سوا اس کے کہ معشوق طوائف ہو یا یورپین ان دونوں مقامات پر نہ اظہار عشق عیب ہے نہ دیر ہوتی ہے اور جب اظہار محبت فوراً ہو جائے تو جذبات کی دنیا میں آبادی بڑھنے نہیں پاتی۔ نہ غم کی حرارت دل کو پگھلا کر مرکز غم بناتی ہے عشق میں ایک مدت گزرتی ہو تو پیمانۂ صبر چھلکتا ہے اور جذبات پیدا ہوتے ہیں، انہیں کا نظم کرنا اور ایک ہی بحر وقافیہ میں محدود رکھنا غزل ہے۔

اردو ادب کی ہر تاریخ میں ایک لازمی بحث اس کی آئے گی کہ اردو شعر وادب کی ترقی میں دکن کا کیا مقام ہے مصنف نے اس مبحث کو جس عنوان سے چھیڑا ہے اسکے آغاز ہی سے اس کے انجام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کسی علم وفن کی وسعت اور چیز ہے، ترقی دوسری شے ہے۔ دکن میں اُردو کی توسیع تو اظہر من الشمس ہے مگر ترقی کے مدارج اس طرح معلوم ہوں گے کہ ہر ربع صدی کے شعراء کا تقابل کیا جائے اور پھر دیکھا جائے کہ بتدریج کتنے غیر ملکی قدیم اور نامانوس و غیر فصیح الفاظ نکال کے ان کی جگہ پر اردو الفاظ لائے گئے، کتنے الفاظ صرفی تبدیلی کرکے فصیح بنائے گئے اور جس قدر زمانہ گزرتا گیا، اسی قدر زبان صاف ہوتی گئی، ان اصلاحات کی رفتار بالکل سست رہی سب ایک ہی لکیر کے فقیر رہے؛ ان لسانی اور صرفی ونحوی اصلاحوں کے علاوہ معانی وبیان میں ارتقا کے منازل برابر طے ہوتے رہے یا نہیں؛ مثلاً حقیقت کا نقش ثانی مجاز ہے تشبیہ کا دوسرا زینہ استعارہ ہے، صراحت کا لطیف جوہر کنایہ ہے، سادگی کے اسباب زینت، ضائع وبدائع ہیں انہیں مدارج کے طے کرنے کا نام تکمیل ادبی ہے، میں ہر زمانہ کے اشعار پیش کرتا ہوں اور مختصر شرح و تبصرہ بھی کئے دیتا ہوں، ناظرین خود ہی ترقی وتنزلی کا اندازہ کرلیں گے۔"

اس کے آگے یہ مختصر شرح بیسیوں صفحات تک پھیلتی چلی گئی ہے اور دکنی شعرا کے کلام پر تبصرہ کے ساتھ ہی ساتھ زبان، ادب، عروض کے خدا اعلوم کتنے نکتوں کو اپنے دامن میں سمیٹتی گئی ہے۔

کوئی بشری تحقیق، لغزش وخطا سے محفوظ نہیں ہو سکتی لیکن بحیثیت مجموعی یہ عرض کرنا مبالغہ شاعرانہ سے پاک ہے کہ مسائل فن اور حسن بیان کی جامعیت کے لحاظ سے اردو میں کوئی دوسری کتاب اس موضوع پر اس تمہید نگار کے علم میں نہیں اور اگر کالجوں کے اعلیٰ اردو نصاب میں اسے جگہ مل جائے تو محض طلبہ کی نہیں اکثر اساتذہ کی بھی خوش نصیبی ہوگی!

---

# مسلمان اور آزادی کی جنگ[1]

## تقریب

مضامین اور مقالات، چھوٹے بڑے رسالوں کو چھوڑیئے، ایک مستقل ضخیم کتاب ہسٹری آف دی کانگرس کے نام سے کانگرس کی طرف سے انگریزی میں شائع ہو چکی ہے۔ نام اس ہسٹری آف دی کانگرس کا اگر ہسٹری آف ہندونیشلزم ہوتا، تو یقیناً صحت سے قریب تر ہوتا۔ ہند قدیم کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کی تاریخ پر افسانوں کا گمان ہو۔ ہند جدید کی خصوصیت شائد یہ ٹھہرے کہ اس کے افسانوں کیلئے تاریخ کا عنوان ہو!

ذہن میں کسی پرانے زمانہ کی فوج کے کوچ کا نقشہ جمائیے آگے آگے سپہ سالار پھر ترتیب وار رسالہ دار ہیں جمعدار ہیں، کمیدان ہیں، عام سپاہی ہیں اور ساری فوج کے گزر جانے کے بعد، اس کے عقب میں شاگرد پیشہ، کچھ مزدور، حمال، کچھ بہشتی سقے کچھ باورچی بکادل، کچھ نائی دھوبی وغیرہ یہاں بھی آزادی وطن کی فوج ظفر موج کے اس مرقع میں آگے آگے فیلڈ مارشل گاندھی ہیں اور جنرل تک کرنل نہرو اور سبحاش کیپٹن داس اور لفٹنٹ بوس، زرق برق وردیوں کے ساتھ پرچم لہراتے، تلواریں چمکاتے اور آخر میں، بہت آخر میں، دبے دبائے، کچھ شرمائے لجائے سے محمد علی اور انصاری اجمل خاں اور ابوالکلام، گویا میدان میں اپنے پیروں آ نہیں رہے ہیں، یہ کھینچے کر لائے

---

[1] از عبدالوحید خاں صاحب بی اے ایل ایل بی لاٹوش روڈ لکھنؤ تحریر نومبر ۱۹۳۸ء

جارہے ہیں! اور حسرت غریب کی تو سرے سے پرسش ہی نہیں حالانکہ وہ بیچارہ جیل اس وقت گیا تھا جب جیل تفریح گاہ نہیں واقعی قید فرنگ تھی اور اس نے قید با مشقت کی کٹھیاں اس وقت جھیلی تھیں جب جیل کے اندر قیدیوں پر برقندازوں کے ڈنڈے برستے تھے اور جیل کے باہر پھولوں کے ہار گلے میں نہیں ڈالے جاتے تھے بلکہ اپنی ہی قوم طنز اور طعن سے کلیجہ چھلنی کر دیتی تھی!

ہندوستان سے ہزارہا میل دور، انگلستان میں مستند اور ضخیم انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا تیار ہوتی ہے۔ جامعیت اور تحقیق کے بڑے بڑے دعوؤں کے ساتھ آخری (چودھویں) ایڈیشن کا جائزہ لے ڈالئے۔ ہندو لیڈروں میں، صف اول ہی کے نہیں، صف دوم کے ایک ایک لیڈر کا ذکر پڑھ لیجئے۔ ضمناً نہیں، اکثر صورتوں میں مستقل آرٹیکل کے تحت، لیکن آپ کے محمد علیؒ کا مقدر، اختیار، گمنامی، اور آپ کے محمود حسن کا نشان امتیاز، بے نشانی! یہ ہے اس دور میں پراپیگنڈا کی سحر کاری!

اللہ اللہ یہ کمال اخلاص! قبول خلق سے یہ استغنا! طمع فاتحہ سے یہ بے نیازی!

عشق من در پس من فاتحہ خوانم باقی ست

---

وقت کی پکار، مسلمانوں سے مدت سے تھی، کہ

کچھ تو کہئے کہ لوگ کہتے ہیں!

آج غالب غزل سرا نہ ہوا

اور حالات کا تقاضا تھا، کہ مسلمان، انگریزی میں نہ سہی، کم از کم، اردو ہی میں،

ہم بھی منھ میں زبان رکھتے ہیں

کا ثبوت دیں۔

آواز آخر کار ایک نوجوان گریجویٹ کے کان میں پڑی۔ قلم کی مشاقی اسے نہیں حاصل

تھی نہ سہی، فرض کا احساس، انتظار کی مہلت کہاں دیتا ہے جیسی کچھ بھی بن پڑی۔ جنگ آزادیٔ وطن میں مسلمانوں کی شرکت کی روداد لکھ ڈالی۔ فرض کفایہ اصطلاح فقہ میں اسے کہتے ہیں کہ اگر ایک ادا کردے تو سب کی طرف سے ادا ہو جائے اور کوئی نہ ادا کرے تو سب کے سب مجرم۔ سیاسیات و قومیات میں جو یہ فرض سب کی طرف سے اتار دے اسکا کیا کہنا اس کی سعی قابل مبارکباد، اس کی ہمت مستحق داد۔

مصنف کا قلم "آزادی کی جنگ" کا سرسری نقشہ اس سے قبل کھینچ چکا ہے نقش ثانی یوں بھی نقش اول سے بہتر ہوتا ہے پھر جب اس کا پشت پناہ مزید علم ہو، مزید تجربہ ہو، مزید مطالعہ ہو!

کتاب کا مسودہ پریس میں پہنچ چکا تھا جب جا کر اس پر نظر کرنے کا موقع ملا اور وہ بھی صرف جابجا سے، ضرور نہیں کہ تائید ہر بیان کی، اور تحسین ہر عنوان کی کی جائے صفحہ ۱۶۵ و ۱۶۶ جہاں ترکوں کی طرف سے حق وکالت ادا کیا گیا ہے اس پر ساڑھے تیرہ سو برس والا اسلام حیران ہے کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ لیکن بہرحال ایسے نشیب و فراز سے تو بڑے بڑے پختہ کار اہل قلم بھی نہیں بچ پاتے، ضرورت اس کی ہے کہ ہونہار مصنف کی حوصلہ افزائی دل کھول کر کی جائے اور اس کی کوششوں کا یہ ثمر گھر گھر پھیلایا جائے۔

---

# نواب جمیل الشان[1]

## دیباچہ

دنیا نے نصیحت کو نصیحت کی راہ سے شائد کبھی سنا ہی نہیں یہ کونین جب حلق سے اتاری گئی ہے تو شکر کی تہ یا مصری کے غلاف میں لپیٹ لپیٹ کر اچھے اچھے اطبا حاذقین بڑے بڑے جید معالجین سب کو یہی کرنا پڑتا ہے مثنوی معنوی کی حکایتیں منطق الطیر کی روائتیں گلستان کی کہانیاں اور بوستان کے قصے سب اسی کے نمونے گزرے ہیں سنائی اور عطار، رومی اور سعدی سب کو عمل اسی پر کرنا پڑا ہے کہ سِرّ دلبراں کے لئے حدیث دیگراں اختیار کی جائے اور ـــ

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

خود عارفانہ شاعری کیا ہے اول سے لے کر آخر تک مجاز زبان کا طلسم! حافظ اور خسرو اور مغربی اور عراقی جس کسی کے بھی آستانہ پر جائیے بادہ عرفان و معرفت چھلکتا ہوا ملے گا تو مجاز و استعارہ کے جام و ساغر میں، اور حقیقت کی جھلک نظر آئے گی تو شیشوں اور آئینوں کی وساطت سے۔ یہ بیسویں صدی کا زمانہ عشق و فسق کا زمانہ کھیل تماشہ کا زمانہ ناول اور ڈرامہ کا زمانہ تھیٹر اور سینما کا زمانہ ہے رندوں کی محفل میں شیخ غریب کا کہیں گزر ہو جائے تو دستار بھی سلامت نہ رہنے پائے یہاں تو حکمت یہی ہے کہ خود بھی مستوں کے سے نعرے لگائیے خود بھی صراحی اور گلاس ہاتھ میں لیجئے، پیجئے

---

[1] از عبد الرؤف عباسی صاحب ایڈیٹر روزنامہ حق لکھنؤ تحریر مئی ۱۹۲۲ء

اور پلائیے، ظرف وہی رہے شیشہ و پیمانہ میں کوئی فرق نہ آنے پائے، البتہ حلق کے نیچے جس چیز کے گھونٹ اتریں وہ شراب طہور ہو نہ کہ افشردۂ انگور!

جمیل الشان کے خوش نصیب مصنف نے اس نکتہ کو پا لیا جمیل الشان کہنے کو ایک ناول ہے اور کہنے کو کیا معنی، واقع میں ناول ہی ہے حسن وعشق کا قصہ، ایک ہیرا سے عاشقی، باہم رقابتیں، پولیس والوں کی گھاتیں، شاطروں کی چالیں، ہجر کی بے تابیاں، مصاحبوں کی کارستانیاں، بگڑے ہوئے نوابی کارخانے، شاہی خاندان کی آن بان، غرض ناول کی دلچسپی کے جتنے سامان ہوتے ہیں سبھی اکٹھے ہیں بجز زبان وحسن بیان، سبحان اللہ جہاں لکھنؤ کی زبان دکھائی ہے وہاں خالص لکھنوی جہاں بدایونی کی بولی بول چلے ہیں وہاں پورے بدایونی حیرت اس پر ہونے کو تھی کہ کاکوروی کو لکھنؤ کی زبان پر اتنی قدرت حاصل کیونکر ہوگئی کہ معاً یاد پڑ گیا کہ سجاد حسین (اودھ پنچ والے) مولوی حاجی نورالحسن (نوراللغات والے) اور ڈپٹی امیر احمد علوی آخر کس خطہ کے رہنے والے ہیں۔

پلاٹ اتنا دلچسپ کہ ایک واقعہ کے شروع کر دینے کے بعد بغیر ختم کیے رکنا دشوار۔ قصہ کے افراد مردہ اور مفروضہ نہیں جیتے جاگتے حقیقی، واقعی، زندوں سے بڑھ کر زندہ، بار بار دھوکہ یہ ہوتا ہے کہ لکھی ہوئی کتاب کے اوراق سامنے نہیں بلکہ اصل قصہ ان آنکھوں کے سامنے عملاً ہوتا ہوا گزر رہا ہے۔ فن (آرٹ) کے لحاظ سے طبیعت دو ایک مقام پر ذرا رکی بھی لیکن قصہ کی دلآویزی اتنی بڑھی ہوئی کہ پڑھنے والے کو رکنے اور غور و تامل کرنے کی مہلت ہی کب ملتی ہے۔

آخر تک پہنچتے پہنچتے بدکاری و ہوسنا کی بدانجامی، اور نیکی و پارسائی کی فتح، از خود بغیر بتلائے اور سمجھائے آئینہ ہو جاتی ہے اور مصنف کے حق میں دل سے دعائیں نکلنے لگتی ہیں مصاحبوں اور خصوصاً میر صاحب عینک فروش کا چربہ خوب اتارا گیا ہے اور نواب جمیل الشان

خان بہادر میراں بخش بدایونی اور نواب بنیاد حسین تینوں کی تصویریں اپنی اپنی جگہ پر مکمل ہیں صرف ہیروئن کی تصویر کشی میں کہیں کہیں مبالغہ کا قلم چل گیا ہے آخر کتاب میں جو دو خطوط اس کی طرف سے ہیں وہ ساری کتاب کا نچوڑ ہیں حد درجہ موثر اور بلندی خیالات کے لحاظ سے لاجواب، کتاب بھر میں یہی دو خط ہوتے اور کچھ نہ ہوتا، جب بھی بہت کچھ تھا، اب دعا صرف اتنی ہے کہ حسن قبول تصنیف اور مصنف دونوں کو نصیب ہو کتاب کو خلق میں اور کتاب نویس کو خالق کے ہاں!

---

# مُداواۃ[1]

## پیش لفظ

ترقی تو ادب میں ہونی ہی تھی اور حرکت جب ہر چیز میں ہے تو ظاہر ہے کہ شاعری کیسے ساکن وجامد رہ سکتی تھی، لیکن بے راہ روی کا نام ترقی رکھ دینا اور بے قیدی کو آزادی سے تعبیر کرنے لگنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کے جسم پر آماس ہو آئے اور ہم اسے دیکھ کر کہیں کہ دیکھو یہ کیسا موٹا تازہ، تیار و تنومند ہے۔ اونٹ جیسا حلیم و شائستہ جانور بھی جب شتر بے مہار بن جاتا ہے تو اس کے شتر غمزوں سے خدا کی پناہ!

پرانی شاعری اور پرانا ادب کوئی وحی آسمانی نہیں کہ اس کا کوئی نقطہ نہ بدل سکے، کوئی شوشہ نہ ٹل سکے خیالات بدلیں گے اسلوب بیان بدلیں گے اور بدلتے رہتے ہیں۔ ولی کی شاعری غالب کی شاعری نہیں اور فسانۂ عجائب کی زبان امراؤجان کی زبان نہیں چراغ سے چراغ جلتا ہی آتا ہے اور شاخ سے شاخ پھوٹتی ہی رہتی ہے بچہ جوان ہوتا ہے اور جوان بڑھاپے میں قدم رکھتا ہے قدرت کا دستور ہی یہ ہے لیکن کوئی زبردستی کھینچ تان کر اگر بچہ کو جوان اور جوان کو بوڑھا بنانے لگے تو یہ ارتقاء طبعی نہ ہوا یہ فطرت سے کشتی اور زور آزمائی ہوئی، جدت اگر محض جدت کی خاطر ہے تو اس کا نام ندرت نہیں بدعت ہے شگفتگی نہیں غرابت ہے۔

"ترقی پسند" ادیبوں کی فہرست میں نام منشی پریم چند آنجہانی اور قاضی عبدالغفار صاحب

---

[1] مداواۃ مؤلفہ غلام احمد صاحب فرقت بی اے کاکوروی شائع شدہ ۱۹۴۲ء

(مدیر پیام دکن) اور یہاں تک کہ 'بابائے اردو' ڈاکٹر عبدالحق کے بھی لئے گئے ہیں اگر ترقی پسندی کا یہی معیار ہے تو پھر ہم سب ترقی پسندی ہیں اور اس ترقی پسندی سے انکار کس کا ذکر ہو سکتا ہے، لیکن کاش اس دعویٰ میں خلوص ہوتا دریا کے مقابلے میں چند قطرے خرمن کے سامنے چند دانے ہستی ہی کیا رکھتے ہیں ترقی پسند ادب کے نام سے جو سیلاب عظیم نثر و نظم دونوں میں بد مذاقیوں عریانیوں اور گندہ بیانیوں کا چل پڑا ہے اس نے یہ حقیقت ہے کہ ہمارے پرانے ادب کے بڑے بڑے فحش نویس اور بڑے سے بڑے ہزل گو کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور نام از مرزا جان صاحب کا بلکہ بعض حیثیتوں سے میاں جرکین کا جگا دیا ہے! اناللہ ـــــ بدعقیدگی اور اخلاقی بے ہودگی کو چھوڑ دیجئے آخر مذاق سلیم اور تمیز داری بھی تو دنیائے ادب میں ایک چیز ہے ان ظالم لکھنے والوں اور لکھنے والیوں کے صفحات میں تو آنکھیں اس کو بھی ترستی ہی رہ جاتی ہیں ؎

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تیری صورت مگر ملے

بہ خوش ہوا کہ ملک میں اس طوفان بے تمیزی (طوفان "کو آپ مجاز کہہ لیجئے لیکن بے تمیزی کو حقیقت کے بجائے مجاز سمجھنا ظلم ہوگا) کے خلاف تحریک پیدا ہوئی ہے اور جا بجا مزاحی اور سنجیدہ دونوں رنگ میں کوششیں رد و اصلاح کی شروع ہوگئی ہیں انہیں کوششوں کی ایک عملی شکل یہ پیش نظر کتاب بھی ہے کاکوری کے جواں عمر و جوان ہمت فرقت بی اے کے قلم سے اسکے مسودہ کے دو چار صفحے مجھے بھی دکھلائے گئے یقین ہے کہ ساری کتاب اسی طرز و انداز کی ہوگی! لکھنؤ، زبان و ادب کی خدمت و اصلاح کے سلسلہ میں ممتاز شروع سے چلا آرہا ہے حق تھا کہ ایسی اصلاحی کتاب کی اشاعت بھی یہیں کی کسی اشاعت گاہ سے ہو۔

(۳)

# چند تبصرے

## مرزا بلگرامی[1]

مغرب کی عقل و ذہانت کا انتہائے کمال یہ ہے کہ ہر جھوٹ کو سچ کے لباس میں پیش کیا جائے مشرق کی نازک خیالیوں کی بلند پروازی یہ تھی کہ سچائیوں کو جھوٹ کے پردہ میں بیان کیا جائے لندن کی وقائع نگاری کا ظاہر سچ ہے اور باطن فریب، دہلی کی داستان گوئی کا باطن سچ تھا اور ظاہر تصنع۔ ٹائمس اور مارننگ پوسٹ ہر نیت کو ہبت کر دکھانے ہر رتی کو تاپ بنا دینے میں طاق ہیں الف لیلیٰ و انوار سہیلی والے حقیقتوں میں افسانے کا رنگ بھر دینے میں یکتا تھے، زولیمر اور مارگولیتھ، تاریخ اور سیرت نگاری کا نام لیکر ایسے ایسے واقعات لکھ ڈالتے ہیں جن کا وقوع نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا تھا۔ خواجہ حافظ اور امیر خسرو شاعری کی دنیا میں گل و بلبل کی زبان سے شراب و کباب کی اصطلاحوں میں، حکمت و موعظت، سچائیوں اور حقیقتوں کا دریا بہا جاتے ہیں، اپنا اپنا مذاق ہے، اور اپنا اپنا کمال فن اب اس کا فیصلہ کون کرے اور کیوں کرنے لگے کہ دونوں کی افسانہ گوئی میں بلند تر کمال اور پاکیزہ تر مذاق کس کا ہے!

افسانہ گوئی کی تعریف، مشرق میں یہی سمجھی گئی، کہ ظاہر جھوٹ ہو اور باطن سچ۔ اسم فرضی ہو، لیکن مسمیٰ واقعی۔ گلاس شراب کے ہوں، لیکن گلاس کے اندر بجائے شیرۂ انگور

---

[1] رسالہ الناظر (لکھنؤ) ۱۹۳۰ء

کے آب انار یا زبان "دشنہ وخنجر" کے تلفظ پر کھیلے، لیکن دل "ناز وغمزہ" کے معنی میں لگا رہے۔ گلستاں کی حکایتوں کی تاریخی تحقیقات کرنے بیٹھئے اور اس کھوج میں پڑ جائیے کہ فلاں حکایت میں جس بادشاہ کا ذکر ہے وہ کس ملک کا تھا کس سنہ میں تخت نشین ہوا کس تاریخ کو وفات پائی، کے شادیاں کیں، کتنی اولاد چھوڑیں، تو شاید ایک حکایت بھی سچی نہ نکلے، لیکن اگر پوست کو چھوڑ کر مغز کو دیکھئے، نقاب کے رنگ میں الجھنے کے بجائے چہرہ کے خط وخال پر نظر جائیے تو ایک ایک لفظ، سچ اور سچائی میں ڈوبا ہوا ملیگا صاحب مثنوی معنوی نے نہ صرف اس پر عمل کر کے دکھا دیا بلکہ اس کا فلسفہ بھی بیان فرمایا کہ "سر دلبراں" کچھ "حدیث دیگراں" ہی میں خوش تر وخوشگوار تر ہوتا ہے اور استاد غالب اپنی زبان میں فرما گئے ہیں ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

سنتے ہیں قدیم صوفیہ میں ایک فرقہ ملامتیہ تھا ظاہر خراب اور باطن آراستہ وضع رندانہ اور صورت مستانہ لیکن اعمال زاہدانہ اور سیرت فقیرانہ آج کل کے مسخروں پر ان قدیم ملامتیوں کو قیاس نہ کیجئے۔ یہ نیا سوانگ، طریق ملامت کے ساتھ تمسخر ہے ان ملامتیوں میں سے ایک ایک تھا دلی پوشیدہ اور کا فر کھلا۔

علی گڈھ بھی ایک چھوٹے پیمانہ پر عالم صغیر ہے یعنی عالم کبیر میں جو کچھ بھی ہے سب کا نمونہ بندے کی بسائی ہوئی اس نگری کے اندر موجود کم سے کم عالم اسلام کا تو اسے ایک زندہ عجائب خانہ (میوزیم) سمجھ لیئے۔ ہر نوع، ہر قماش ہر نمونہ انسانیت کو اس ننھی سی دنیا کے اندر آ کر دیکھ لیجئے کیسے ممکن تھا، کہ طریق ملامتیہ کے نمائندوں سے سرزمین محروم رہتی

آئیے آج آپ سے بیسویں صدی کے ایک "ایڈوڈیٹ"

علی گڈھی ملامتی کا تعارف کرایا جائے ظفر عمر کا نام آپ نے سنا ہے اسی بیچر گڈھ کا اولڈ بوائے

اور نیکنام سرکار کے نیک نام ترین محکمۂ پولیس کا ایک اعلیٰ افسر اسکی وضع قوم کی وضع سے الگ اِس کی کوٹھی مسجد کے حجروں سے دور اس کی کچہری خانقاہ کے حوق اور مدرسے کے قال اقول سے کہیں پرے لیکن خود قوم وملت خانقاہ ومسجد اسکے دل سے دور نہیں دل کے باہر بھی نہیں دل کے اندر، خاکی وردی اور کارتوس کی پیٹی، سفید ہلمٹ اور کمر سے لٹکتی ہوئی تلوار سب نے دیکھی لیکن رنگ جامہ سے نگاہ ہٹا کر انداز قد بھی کسی نے نہ پہچانا، نقاب الٹ کر چہرہ کے رنگ روپ کو بھی کسی نے نہ دیکھا، اگر کسی نے دیکھا ہو بھی تو زبان پر لانے کی اجازت کسے، اس ناتمام داستان کو یہیں تمام ہو جانے دیجئے۔

مستقبل اسلام اور حجروں کا کلب، نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری سے تو یقین ہے کہ آپ بھی بے خبر نہ ہوں گے "نیلی چھتری" کا حجرہ افسانہ ہوگا لیکن جس افسانہ کا نام نیلی چھتری ہے وہ تو افسانہ نہ رہا۔ ایک مستقل حقیقت بن گیا! جس مٹی اور پتھر کے کھنڈر کا نام نیلی چھتری ہے وہاں کوئی خزانہ مدفون ہو یا نہ ہو، لیکن جو نیلی چھتری، کاغذ اور قلم اور روشنائی کی مدد سے تیار ہوئی، وہ تو یقیناً اپنے ہمراہ دولت لیکر آئی اور بہرام اور مسعود اب نرے تخیلہ کے بے جان مخلوق نہ رہے بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے ہماری آپ کی آنکھوں کے سامنے راجہ اندر اور تاج الملوک، لال دیو، اور سبز پری، امیر حمزہ اور عمر عیار کی طرح اچھے خاصے گوشت و پوست کے بنے ہوئے جیتے جاگتے چلتے پھرتے جانے پہچانے ہوئے جاندار انسان بن گئے!

ناول پڑھنے کی اب نہ فرصت نہ ضرورت، نہ شوق نہ ہمت۔ خود اپنے افسانہ حیات کے مطالعہ اور حسرت مطالعہ سے کہاں مہلت اور کسے دماغ کہ گڑھی ہوئی کہانیوں اور جھوٹے قصہ کے سیر و تماشا کا وقت نکالا جائے اور خود اپنی ہستی کی ٹریجڈی کیا کم ہے کہ قیس کی نامرادیوں اور فرہاد کی حسرت نصیبیوں کا رونا بیٹھ کر رو دیا جائے اکبر علیہ الرحمۃ کے الفاظ میں۔

عبرت زدہ را کار بہ آزردگاں نیست

ناولوں اور افسانوں کا مطالعہ عرصہ ہوا چھوٹ چکا سرشار و شرر، جارج ایلیٹ اور میرڈیتھ کی گلکاریوں سے دل بہلاؤ کا شغلہ عرصہ ہوا ختم ہو گیا ؎

ماخانہ رسیدگان ظلمیم !! پیغام خوش از دیار ما نیست

لیکن ایک معتبر و ثقہ دوست نے ہاتف غیب کی طرح آکر سرگوشی کی، کہ نیلی چھتری کے خزانہ کے مالک کی ہمت اب اور بڑھی ہے اور اب کی اس نے علاقہ مالوہ کے لال کھٹور کی چھپن کروڑ کی دولت پر دھاوا بول دیا ہے! جی نہ مانا، تو یہ ٹوٹی اور حسن نظامی پریس لکھنؤ سے دو سو دو سو صفحہ کی چھوٹی سی خوبصورت و خوشنما کتاب کا پارسل آیا اسیوقت شروع سے آخر تک پڑھ گیا! لال کھٹور؟ آپ چونکیں گے اور منہ بنا کر فرمائیں گے کہ نام تو عجب قسم کا نامانوس اور غیر شاعرانہ ہے بجا ارشاد ہوا لیکن یہ تو فرمائیے کہ آج سے چند سال قبل نیلی چھتری کا نام کچھ کم نامانوس اور کچھ کم عجیب و غریب تھا، اور پھر عمرو عیار کی زنبیل اور دیوار قہقہہ اور چشمہ آب حیوان اور گل بکاؤلی کو آپ کیوں بھول جاتے ہیں، کیا ان ناموں سے دنیا روز ازل ہی سے مانوس چلی آرہی ہے؟

نیلی چھتری اگر آپ پڑھ چکے ہیں اور بہرام و مسعود کے کارناموں سے واقف ہو چکے ہیں تو اس جدید داستان کو آسانی سے سمجھ لیں گے بہرام اب معلوم و معروف مجرم نہیں بلکہ علیگڈھ کے "مشہور کھلنڈرے" مسعود کے ہمراہ اب مہلب جنگ کے نام سے دہلی میں ایک باعزت شہری کی حیثیت سے سکونت پذیر ہو گیا ہے یہ راز نہیں کھلتا کہ اسکی سکونت کے لئے مصنف نے بجائے دہلی کے مشہور و معروف محلہ کوچہ چیلاں کے ایک دوسرے مشہور محلہ بلی ماراں کا انتخاب کیوں کیا۔ اب وہ خلق خدا کا دشمن نہیں، بلکہ اس کا ایک مخلص خادم اور اب اس کی حیرت انگیز ذہانت (یا بہ زبان اخبارات سنسنی خیز ذہانت) جرم کرنے کے بجائے مجرموں کو سزا دینے اور انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے وقف

ہے اس کی مختصر ٹکڑی کا نام خدائی فوجداروں کی جماعت پڑگیا ہے اور اسکی بے جگری جانبازی و سر فروشی سے بڑے بڑے پرانے اور بیباک مجرم تھرانے اور پناہ مانگنے لگے ہیں مہراب جنگ کے خاص ملنے والوں میں قابل ذکر نام ڈاکٹر رحمٰن اور انسپکٹر وقار حسین کے ہیں۔ لال کٹھرا اگر نامانوس نام تھا تو یہ نام تو یقیناً آپ کے لئے نامانوس نہ ہونے چاہیئے ان خدائی فوجداروں کے ٹھیک مقابل اسی شہر دہلی میں چھٹے ہوئے بدمعاشوں اور انتہا درجہ کے چالاک اور بے درد مجرموں کا بھی ایک نہایت مضبوط جتھا قائم ہے جس کے سرغنہ و سردار دہلی کے ایک مشہور گیسو دراز اشتہاری صوفی وص ۱۱۲ ص ۱۲۹ ص ۲۲۵ مرزا بلگرامی ہیں جن کی قلمی تصویر کو دیکھ دیکھ بے اختیار یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

اے کہ با سلسلۂ زلف دراز آمدۂ

چشم بد دور کہ خوش شعبدہ باز آمدۂ

خدائی فوجداروں کو جو خلق اللہ کی حفاظت کرتے رہتے ہیں اور ایسے بدمعاشوں کو جنھیں پلیس بھی ان کے کیفر کردار کو نہیں پہنچا سکتی خود ہی معقول سزا بھی دے دیتے ہیں مقابلہ انھیں بزرگوار سے آپڑتا ہے اور ساری کتاب نور و ظلمت، حرم و تعزیر جرم کی کشمکش کی نذر ہے کتاب کے مرقع میں سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے زیادہ سبق آموز تصویر مرزا بلگرامی کی ہے ان کی تفصیلی زیارت اور ان کے ہتھکنڈوں سے پوری واقفیت کا اگر شوق ہو تو ڈیڑھ روپیہ میں کتاب نامی پریس لکھنؤ سے حاصل کیجئے لیکن مرزا کی اجمالی شکل و صورت، اور اس قابل زیارت چہرہ کے نمایاں خط و خال اگر آپ اس ریویو کے آئینہ ہی میں دیکھ لینا چاہتے ہیں تو بس اتنا سمجھ لیجئے کہ مرزا بلگرامی صاحب کوئی خدا نخواستہ معمولی اور ادنیٰ قسم کے مجرم نہیں جن سے ملتے ہوئے آپ شرمائیں کیا عجب کہ ان سے نیاز حاصل ہوجانا آپ اپنے لئے باعث شرف و عزت خیال فرمائیں یہ ذات شریف مریدوں کی ایک بڑی جماعت کے پیر و مرشد ہیں اپنے بعض مریدوں

اور معتقدوں کی جاں نثاری پر بجا طور پر فخر رکھتے ہیں ایک زنانہ اسکول کھول رکھا ہے بہت سے رسالوں کے مالک ہیں، پریس ہے کتابوں کا کاروبار ہے دفتر عین شہر دہلی کے وسط میں ہے لیکن یہ حضرت رہتے دہلی کے قریب ہی کسی ایسے مقام پر ہیں جہاں ایک مشہور درگاہ واقع ہے (ص۱۹) دفتر اور دفتر کی عالیشان عمارت دہلی بھر میں مشہور ہے (ص۱۲) یہ بزرگ اپنے کارناموں سے حسن بن صباح کی یاد اس بیسویں صدی میں تازہ رکھے ہوئے ہیں (ص۲۰ و ۲۱ نیز ص۶۲ و ۶۳)

باوجود قانون اور حکومت کی سخت گیری کے پایہ تخت دہلی میں بیٹھے ہوئے اپنی دغابازی اور عیاری کے زور سے خلقت کو مسحور کئے ہوئے ہیں (ص۲۱)

مرزا بلگرامی کے سر پر کاکلیں ہیں (ص۳۲) اور زینت و آرائش کے وقت ان لمبی کاکلوں میں خوب تیل لگا ہوا (ص۱۲۹) قوالی اور نعتیہ غزلیں سنتے رہتے ہیں (ص۲۱) خاص خبر ان کے روزنامچے ہیں جو ان کے اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں اور جن میں ان کے قلم سے بلگرامی باؤ کی تعریف و توصیف برابر نکلتی رہتی ہے (ص۱۶) قومی اور مذہبی معاملات میں خاص دلچسپی لیتے رہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر تبلیغ کے سوانگ میں سرگرم ہیں۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ سہراب جنگ جب ایک مشہور قومی لیڈر کی طرح مشتعل ہو کر مرزا بلگرامی کو مخاطب کرتا ہے تو کہتا ہے کہ اے اشتہاری صوفی اور تبلیغ کے صفر کے سردار (ص۱۹۱) اور مسعود کی زبان میں اس صوفی اشتہاری اور دغاباز پیر (ص۱۹۱) کا جامع اور مختصر تعارف یہ ہے کہ

مرزا بلگرامی ایک تاریخی خانقاہ کا مجاور، تبلیغ و اشاعت مذہب کے کاموں میں پیش پیش، کئی ایک اخباروں کا ایڈیٹر، اور مدرسوں کا مہتمم ہونے کے علاوہ پیری مریدی کے سلسلہ میں بھی مشہور (ص۱۲۵)

ان بزرگوار کو اپنے اثر اور اپنے رسالوں اور کتابوں کی اشاعت پر ناز بھی ہے

ایک جگہ اپنی زبان سے فرماتے ہیں :۔

"میرا کاروبار تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے میرے مرید ہر جگہ بکثرت ہیں اور میری کتابیں اور رسالے تمام ملک میں شائع ہوتے ہیں میری اخباری نکتہ چینی سے بڑے بڑے والیان ملک کانپتے ہیں اور ان کے درباروں میں کھلبلی پڑ جاتی ہے۔ جہاں جاتا ہوں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہوں (ص ۱۰۹) اور ساتھ ہی یہ کھلا ہوا راز بھی زبان پر آجاتا ہے، کہ

"دنیا کے لئے میں زاہد خشک ہوں لیکن آپ یقین کریں کہ باوجود ان سب باتوں کے میرا دل اچھی صورت کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اچھی آواز کان میں جاتی ہے، تو میں مسرور ہوتا ہوں خدا نے آپ کو حسین بنا دیا ہے اور علم موسیقی میں آپ اسقدر مہارت رکھتی ہیں۔" (ص ۱۷۶ و ۱۸۰)

فرمایئے، مرزا ملگرامی کی دلچسپ شخصیت سے اب بھی آپ کو دلچسپی پیدا ہوئی یا نہیں، لیکن ذرا ٹھہریئے بعض دلچسپ تر خصوصیات ابھی ظاہر ہونا باقی ہیں آپ لاکھ ذہین سہی، لیکن یہاں تک تو آپ کا ذہن بھی نہ پہنچا ہوگا ـــــ اور کیسے پہنچتا، نہ آپ محکمہ پولیس کے کوئی افسر، نہ کوئی پیشہ ور سراغرساں، کہ یہ جو اطراف ملک میں بیسیوں بلوے، کشت و خون اور فسادات ہوتے رہتے ہیں، یہ

"انہی حضرت کی بدولت ہوتے ہیں اور مختلف طریقوں سے روپیہ ان کے ذاتی خزانہ میں جمع ہوتا رہتا ہے دہلی کے کئی قتل جن کا آج تک پتہ نہ چلا ان میں مرزا کے گرگوں کی شرکت تھی، کتنے ساہوکاروں اور کارخانہ داروں کا دیوالہ نکل گیا، وہ بھی مرزا کی بدولت" (ص ۲۹)

یہ ذات شریف جب آخری بار مسعود کی گرفت میں آتے ہیں اور اپنے کیفر کردار تک پہنچنے کے قریب ہوتے ہیں، اسوقت وہ علی گڑھ کا مشہور "کھلنڈرا" انہیں مخاطب

کرکے ان کی فردجرم یوں سناتا ہے :۔

"لال کنھور پر قبضہ کرنے اور دولتمند بننے کا جنون تم پر سوار تھا، تم موجودہ زمانہ کے حسن بن صباح ہونا چاہتے تھے، ہندو مسلمانوں کو تم نے آپس میں لڑایا، پیری مریدی کے گورکھ دھندے سے ہزارہا آدمیوں کو گمراہ کیا، مدتوں پولیس کی آنکھ میں خاک جھونکی، قتل پر قتل کئے اور خلقت کو لوٹا" (صفحہ ۲۳)

آپ کہتے ہونگے کہ ایسا چھپا ہوا مجرم تو پولیس کی نظر میں خوب چڑھا ہوا ہوگا اور ملک کے امن و نظم کے دعویدار، ذمہ دار حکام سرکار تو اسے ملک کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہوں گے لیکن تو بہ کیجئے آپکا دماغ بھلا مرزا بلگرامی کی ذہانت کو کہاں پا سکتا ہے؟

"اس خیال سے کہ حکام وقت کو اس کی مجرمانہ حرکات کی جانب شبہ نہ ہو، وہ وقتاً فوقتاً اپنے اثر و ذہانت کو ان کی خدمت میں پوشیدہ طور پر صرف کرتا تھا" (صفحہ ۲۹)

پولیس والے کیا پتہ لگاتے طلسم ٹوٹنے پر، ایک انسپکٹر صاحب خود دنگ رہ جاتے ہیں اور ان کی سمجھ میں کسی طرح نہ آتا کہ

"مرزا بلگرامی جو عوام میں اس قدر عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور حکام دہلی جس کے اثر سے اکثر کام لیتے ہیں ایسا خطرناک مجرم ہے" (صفحہ ۵۵)

ایک مرتبہ جب انسپکٹر صاحب ایک اہم تلاشی کے لئے ناوقت مرزا صاحب کے دفتر میں داخل ہوتے ہیں تو مرزا صاحب کیا فرماتے ہیں۔

"آپ ہیں انسپکٹر صاحب! خیریت تو ہے جو ایسے وقت تکلیف فرمائی؟ کیا ڈپٹی کمشنر پاکستان صاحب نے ہندو مسلمانوں کے تعلقات میں مجھ سے مشورہ کرنے کے لئے آپ کو بھیجا ہے، آپ جانتے ہیں کہ میں گورنمنٹ کی خدمت کے لئے ہر وقت حاضر رہتا ہوں" (صفحہ ۱۶۲، ۱۶۳)

یہ جاسوسی کوئی مالی منفعت کی چیز نہیں اس کا اصلی فلسفہ یہ ہے کہ اس ذریعہ سے مجرمانہ سرگرمیوں پر پردہ پڑا رہتا ہے ایک شریک کار اور راز دار تخلیہ میں دریافت کرتے ہیں کہ آخر جاسوسی تو کہیں نہیں گئی اس کا کیا حال ہے؟ (صہ۲۸) تو جواب ملتا ہے کہ اس کی قدر بھی اسی وقت تک تھی جب تک میری اخباری، ٹہل کامیاب تھی پھر اس میں ملتا ہی کیا ہے، وہ تو محض دوسری سرگرمیوں کی پردہ پوشی اور رفع شر کے خیال سے مفید تھی" (صہ۱۱)

ان مرزا بلگرامی سے بھی کہیں بڑھ کر پراسراران کے "سانپ" ہیں جو ہر مخالف کو ڈس کر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ دہلی کا بینک بابو ایک تھا اس بیچارہ کی جو شامت آئی تو اسے یہ پتہ لگ گیا کہ بینک میں مرزا صاحب نے تبلیغ کے نام جو روپیہ جمع کرا دیا ہے، اسے اپنی ذات پر صرف فرما رہے ہیں اور اس نے دھمکی دی کہ جلسہ تبلیغ میں یہ راز فاش کر دیا جائے گا بس یہ کہنا تھا اس بابو غریب کا خاتمہ تھا (صہ۸۹) ایک اور اجل گرفتہ احمد جان صاحب تھے جو مرزا کے شریک کار رہ کر پنجاب اور سندھ سے مدرسہ صوفیہ کے لئے بہت سا چندہ جمع کرلائے تھے۔ روپئے کی تقسیم پر جھگڑا ہوا ان کے پاس مرزا کے کچھ خطوط تھے جن کے شائع کرنے کی انھوں نے دھمکی دی، شام کے وقت پارک گئے۔ گھر واپس نہ آنے پائے تھے کہ راستہ میں سانپ نے ڈس لیا، اور جب پولیس آئی تو خطوط جیب سے غائب ہو چکے تھے (ایضاً)

سب سے زیادہ پرلطف مرزا صاحب کا اپنے ان کارناموں سے تجاہل ہے پولیس کے ایک افسر صاحب مرزا صاحب کو آگاہ کرتے ہیں کہ آپ کے سانپ کا راز، اب راز نہیں رہا ہے، تو معصومیت اور بھولے پن کی کس دلفریب ادا سے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ

"سانپ کیسا؟ کیا میں کوئی سپیرا ہوں؟ صاف بتائیے، معموں میں بات

نہ کیجئے " (ص ۱۹)

"سانپ کیسا، کیا میں کوئی سپیرا ہوں"؟ کیا خوب ارشاد ہوا ہے جتنی بار جی چاہے دہراد ہرا کر اس فقرہ کا مزہ لیتے رہئے۔

آپ کہیں گے کہ مرزا بلگرامی کو آخر تعزیرات ہند کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی کی ضرورت ہی کیا پیش آئی، مزے سے اپنے تبلیغ کے کاموں میں لگے رہتے اور گھر بیٹھے معقول آمدنی کماتے رہتے۔ لیکن ان کی بدقسمتی کو کیا کیجئے کہ دہلی میں ایک مولوی صورت اور بھیری سیرت ایڈیٹر نے اس ہوائی قلعہ کی بنیادیں تک اپنی گولہ باری سے مسمار کردی تھیں ایک راز دار خلوت میں پوچھتے ہیں، کہ یہ تو فرمائیے، اب تبلیغ واشاعت مذہب کے گورکھ دھندے کا کیا حال ہے؟ جواب میں ٹھیک کوسنے والوں کے انداز میں ارشاد ہوتا ہے:۔

فی الحال اس کی بھی کسا د بازاری ہے خدا سمجھے اخبار انیس کے مولوی نما کرشان صفت ایڈیٹر کو۔ اس نے ایسا بھانڈا پھوڑا ہے کہ اب وہ چشمہ بھی خشک ہوتا جاتا ہے اس کے علاوہ ہندو مسلمان بھی ایک دوسرے کے خون کے اب ایسے پیاسے نہیں رہے جیسے پہلے تھے باوجود کوشش کے نہ کہیں بلوے ہوتے ہیں نہ مقدمہ بازی" (ص ۲۷)

اتنی جلوہ آرائیوں کے بعد کیا اب بھی آپ کو یہ گلہ باقی رہے گا کہ ریویو نگار نے مرزا بلگرامی کے چہرہ سے نقاب کے گوشہ الٹنے میں بخل سے کام لیا ہے؟

مصنف نے غائت ستم ظریفی یا فرط انکسار سے کام لیکر اپنا رستم داستان مہراب جنگ ہی کو ٹھہرایا ہے اور اس کے بعد پھر مسعود کو بھی ابھارنے کی کوشش کی ہے عام تماشائی یقیناً اس نظر بندی میں گرفتار ہو جائیں گے لیکن بزم آخر محض تماشائیوں ہی سے تو بھری ہوئی نہیں، ع

بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی!

ان اہل نظر کی نظر تو بس مرزا بلگرامی ہی کے چہرہ پر پڑیگی اور وہ ساری کتاب کو اسی ایک متن کا حاشیہ قرار دیں گے۔ ایک پرانے افسانہ نویس نے بھی آج سے سینکڑوں برس قبل اپنی داستان کا نام داستان امیر حمزہ رکھ دیا تھا لیکن پڑھنے والوں کے دل سے کوئی پوچھے کہ وہ امیر حمزہ کی داستان ہے یا عمرو عیار کی؟ اس کتاب میں بھی مرکزی شخصیت اور سب سے زیادہ دلچسپ شخصیت مرزا بلگرامی ہی کی ہے۔ دوسرے نام اس میں محض اس طرح آگئے ہیں جیسے بکاؤلی کے قصہ میں لکھا بسوا، اور زین الملوک یا داستان امیر حمزہ میں کبتک اور لندھور! البتہ دل کو تذبذب اس میں ہے کہ اس چھوٹی سی دلچسپ و خوشنما کتاب کی حیثیت کیا قرار دی جائے، اور اسے لٹریچر کی کس صف میں رکھا جائے۔ تاریخ یا سوانح عمری اسے قرار دیتے ہوئے تو دل دھڑکنے اور قلم لڑکھڑانے لگتا ہے۔ پھر کیا ہے؟ افسانہ؟ اچھا افسانہ سہی۔ مصنف کو اگر اسے افسانہ کہنے، اور ناظرین کو اسے افسانہ سمجھنے پر اصرار ہے تو افسانہ ہی سہی لیکن پھر وہی سوال ہوگا، کہ افسانہ جھوٹا ہے یا سچا؟ تو اب کیا ہر سوال کا جواب ریویو نگار ہی دے؟ ماشاءاللہ آپ کے بھی آنکھیں ہیں، اور آپ کے پاس بھی عقل و دماغ ہے سوال کا جواب اپنے ہی سے آپ کیوں نہیں حاصل کرتے۔

---

# میٹھی کنین یا افسانۂ جمیل[1]

گرجستان یا آرسینیا کے نہیں اسی شہر لکھنؤ کے رہنے اور بسنے والے نواب جمیل الشان بہادر ہماری آپ کی آنکھوں کے سامنے ابھی کل تک زندہ سلامت موجود تھے اور عجب کیا کہ ہم میں سے بہتوں کو زیارت بھی نصیب ہوئی ہو ایک ضعیف سے آدمی، شاہی خاندان کی یادگار، چہرہ پر جھریاں اور خضابی بال، عمر کچھ اوپر ساٹھ سال جسمانی قوی میں ضعف و انحطاط لیکن طبیعت وہی رنگین اور مزاج بدستور شوقین تمنائیں اور آرزوئیں جوان، دل کے گوشہ گوشہ میں نوجوانوں کے سے ارمان آخر دور آخر کے نواب ہی تھے معقول وثیقہ اور گرانقدر پنشن تھی کس، دل کے لئے رئیسوں کی آن بان، نوابوں، شہزادوں کی شان، اور بے گل ہوتے ہوئے چراغ کی لو تیز کرنے بجھتے ہوئے انگاروں کو ہوا دینے کے لئے مصاحب ایک نہیں دو دو حاضر و مستعد۔ ایک مرزا سیتا دوسرے میاں علی حسین۔ ایک روز باتوں باتوں میں ایک بازاری حسن کا وہ سبز باغ دکھایا اور شوق و اشتیاق کا وہ لام باندھا کہ بھلا شہزادہ اعادہ شباب کے کسی عذر دوسی آپریشن کے بغیر، اپنے کو عام تصور میں جوان رعنا سمجھ بیٹھا اور دل کسی کوہ قاف کی پری پر نہیں شہر ہی کی ایک ٹکھا بیسوا پر آگیا۔ یہ بی صاحبہ، تصیٹر میں کام اور تماشبینوں میں نام پیدا کئے ہوئے اتفاق سے اس وقت ایک خان بہادر کی پابند تھیں۔ خان بہادر سن رسال میں تو تھے شہزادہ صاحب کے لگ بھگ لیکن خوب مضبوط، اور تانیٹے۔ ساٹھے پاٹھے۔ بڑے حکام رس اور با اثر، غضب کے زیرک اور صاحب ہنر۔ رہنے والے لکھنؤ کے نہیں خاک پاک بدایوں کے وہی بدایوں

---

[1] صدق مورخہ ۲۲ر اپریل ۱۹۵۱ء

جس کا کلمہ استاد مصحفی بھی پڑھ گئے ہیں ؎

قاتل تری گلی بھی بدایوں سے کم نہیں

اسی ڈیرہ دار کے عشق سراپا فسق میں ڈیرے ڈنڈے لکھنؤ میں ڈالے ہوئے چوک کے قریب چھاؤنی چھائے ہوئے۔

اب شروع ہوئی بازار کی شہائی پرچین جھپٹ یا شاعروں کی زبان میں رقابت۔ ادھر سے بلا کے جوڑ۔ ادھر سے قیامت کے توڑ۔ ادھر کے جیالے اگر اپنے وقت کے "جالینوس" تو ادھر کے شاطر بھی اپنی حکمت و فطرت کے لحاظ سے پورے "فلیسوف"۔ کبھی اِن کرمات، کبھی اُن کو شکست فاش، ایک کو اپنے خاندانی جاہ و حشم کا غرّہ، دوسرے کو صاحب لوگوں کی خدمت میں ڈالی پیش کرنے اور شکار کھلاتے رہنے کا آسرا۔ ادھر خان بہادر نے پولس کپتان کو گانٹھا، ادھر شہزادے نے ڈپٹی کمشنر کو جا کر شیشہ میں اتار لیا۔ آج عتاب نازل ہوا پولیس کے داروغہ پر اور بیچارے کا درجہ ٹوٹ کر رہا، کل نزلہ گرا کوتوال شہر پر اور غریب کو لکھنؤ چھوڑ کانپور جانا پڑا۔

شہزادہ سے نپٹ لینے کے لئے خان بہادر بالکل کافی تھے لیکن ہوا یہ کہ شہزادہ کو کمک پہنچ گئی اپنے رفیق قدیم نواب بنیاد حسین خاں آنریری مجسٹریٹ اور رئیس اعظم کانپور کی۔ ٹھہرے سوجھ بوجھ میں خان بہادر سے بھی بڑھے چڑھے، اور حکام رسی اور خوش تدبیری میں ان سے کہیں آگے اڑتی چڑیا کے پرگن لینے والے اب نقشہ جنگ یہ کہ ایک طرف لکھنؤ کے شہزادہ اور کانپور کے رئیس اور مجسٹریٹ اور دوسری طرف بدایوں کے خان بہادر اور کانپور کے کوتوال محاذ جنگ بھی اب کھنچتے کھنچتے لکھنؤ سے کانپور اور کلکتہ اور بدایوں تک وسیع ہو گیا اور واقعات کے اسٹیج پر پہلے تو وہی جانے بوجھے دو ہی چار شخص تھے اب نئی نئی صورتیں نمودار ہوئیں ایک سے ایک بڑھ کر دلچسپ۔ نواب خورشید مرزا اور قمر مرزا اور خورشید دلہن اور فرحت مرزا

اور سعود شاہد اور سب سے بڑھ کر میرزین العباد چشمہ فروش ان بزرگوار سے ایکبار بھی تعارف ہو جائے تو عمر بھر ساتھ چھوڑنے کو جی نہ چاہے ایک روز شہزادہ صاحب معہ اپنی اور خان بہادر کی مشترک محبوبہ کے غائب ہو جاتے ہیں، پھر یکایک کانپور میں انکا نزول اجلال ہوتا ہے بجائے اس بیسوا کے ایک خوش جمال و شوخ دیدہ کشمیری لڑکے حسن جان کے ساتھ چند روز کے بعد حسن جان بھی "لاپتہ" یا مفقود الخبر!

---

"میری زندگی بھی عجیب زندگی ہے مجھے اس زندگی سے کبھی دلچسپی نہ تھی، ہمیشہ کراہت رہی کئی دفعہ اس مخمصہ سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر ہمیشہ ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا یہ سچ ہے کہ روپیہ دولت کی چاٹ بُری چاٹ ہے اور عادت پڑجانے کے بعد بدکاری میں لذت ملتی ہے مگر تاکے دس پانچ برس کے بعد کیلئے کیا ہو جانا پڑے گا باسی ہار کو لوگ پیروں سے ملتے ہیں عشاق کہہ یا چاہنے والے، سب جوانی کے ساتھی ہیں وہ ڈھلی، اور ان کی نظریں پھریں چھیڑ چھیڑ کر کترائی کرتے ہیں، وضعدار ہوئے تو کچھ دنوں نبا با رفتہ رفتہ آنا جانا کم کیا پھر چھٹ رہے"

یہ ایک ہلکی سی جھلک ہے ان خیالات کی جو اس بیسوا کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں جسے آپ ابھی اس عالم میں چھوڑ آئے تھے کہ

دلے برصید کریک باشد و صیادے چند!

جی ہاں، یہ خیالات اور ایک بیسوا کے! بیسوائیں بھی آخر اسی مٹی کی بنی ہوئی ہیں جس سے غیر بڑی بڑی عصمت کی پتلیوں کا ہوتا ہے اور بندی اسی قادر مطلق کی ہوتی ہیں جو شریف بہو بیٹیاں پیدا کرتا رہتا ہے اس کی رحمت کی جب ہوا چلتی ہے تو وہ محلہ کے سڑے ہوئے گھورے پر مہکتے ہوئے گلاب اور لہلہاتے ہوئے چنبیلی اور جوہی کے پھول کھلا دیتی ہے اور اسکی صنعت جب بہار پاتی ہو تو کترے اور کھردرے پتھروں کو ہیرے اور جواہر بنا دیتی ہے ناپاکی کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے، دنیا میں حقیر و ذلیل، آخرت میں ماندہ و درماندہ جوانی کی بہار کے دن کی ؛ دولت کا خواب کے

گھڑی کا ؛ جوان جہان عورت اپنے انجام کو سوچتی جاتی ہے اور دل ہی دل میں روتی ہے "بی صاحب سنوں سے اتریں اور چاہنے والوں کی کمی ہونے لگی، دولت کے پر لگے۔ یہ گئی اور وہ گئی مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ دن کے جلیس اور رات کے مونس ایک ایک کرکے رخصت ہو گئے حیا دار ہوئیں تو مل بیں ! نہیں تو برقعہ پہن کر بھیک مانگنے کی ٹھہری آئے دن کے واقعات ہیں پچاسوں مثالیں اس قسم کی اسی شہر میں کیا ہر شہر میں موجود ہیں کسی کی ناک گئی اور کسی کی جان گئی اہتمام یہ ہے کہ اولاد نہ ہونے پائے بوڑھا پا آجائے گا چھوٹے بچے کو دیکھ کر ماں کو جو دلی خوشی ہوتی ہے وہ ان کے مقدر میں نہیں، جوان مریں تو کوئی دو آنسو بہانے والا نہیں۔ نہ فاتحہ نہ درود کرنے والا !"

پاک زندگی کی لطافتیں گھر گرہست شریفانہ زندگی کی مسرتیں، میاں اور اولاد کی محبتیں ان بچاریوں کو کب نصیب یہ بدنصیب کیا جانیں کہ گھر کی ملکہ ہونے کے معنی کیا ہیں اور شوہر کی کمائی کی موٹی جھوٹی میں بھی اللہ نے کیا لطف اور کیسے مزے رکھ دیئے ہیں۔ عصمت جو غریب سے غریب عورت کا سب سے بڑھ کر بیش بہا خزانہ ہے، اور حوا کی بیٹیوں کے پاس اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے اس کی نا قدری کی سزا قدرت کی طرف سے اسی دنیا میں یہ مل کر رہتی ہے کہ عورت محبت سے محروم کر دی جاتی ہے اب نہ اسکے دل میں کسی کی محبت رہ جاتی ہے نہ کسی کے دل میں اس کی۔ اور یہ نہ ہو تو دنیا میں آخر نور و ظلمت، خوشبو و بدبو، پاکیزگی و گندگی ایک ہی ہو کر نہ رہ جائیں !

---

نمانہ کچھ ادر لکھ سکتا ہے واقعات پلٹوں پر پلٹے کھاتے ہیں کمو جان کو آخرکار بڑی لمبی جدوجہد کے بعد خان بہادر کی قید سے رہائی نصیب ہوتی ہے شہزادہ صاحب دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں شریف جیسا اپنی نام کی ماں کے نام خط لکھنے بیٹھتی ہے خط میں کیا لکھتی ہے اپنی اور اپنی ساری برادری کے نامہ اعمال کی نقل کاغذ کے اوراق پر کر دیتی ہے۔

"امی جان" کمرکی بندگی قبول کیجئے مجھ نصیب جلی کو آپ چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں اور اپنے کاٹ بیچ سے باز نہیں آتیں آپ سے بار بار کہہ چکی ہوں کہ یہ ناپاک زندگی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی، معلوم وہ کون سی منحوس گھڑی تھی کہ جب معلوم نہیں کس نے مجھے آپکے سپرد کیا اور آپ نے مجھے پالا پوسا میں مانتی ہوں کہ آپ نے مجھ پر بہت کافی روپیہ صرف کیا لیکن جتنا صرف کیا اس سے چوگنا آپ نے بھتیرا اس سے وصول کرلیا آج اسی شہر میں بیگم بنی بیٹھی ہوتی، اور چین سے پڑا رہتی، وہ بنا بنایا کھیل تمھیں نے بگاڑا اور لکھنؤ لے کر چلی آئیں تم نے چاروں طرف سے خوب دولت گھسیٹی، لاکھوں کی آدمی ہو پرالٹا چاہا تو مرتے وقت بھیک کا ٹھیکرا ہاتھ میں ہوگا کیا کروں، منھ سے کرنا ہی نکلتا ہے خیر تم پر اور تمھارے گھر پر نے لعنت بھیجی اور موقع پاتے ہی بھاگ نکلی"

الفاظ سوز دل کی روشنائی سے لکھے ہوئے اس کے قلم سے نکل رہے ہیں جس کی برادری کو بڑے بڑے جبہ و عمامہ والے حقارت کے ساتھ دھتکارتے ہیں اور معززین و شرفا کبھی شرارت سے کبھی شقاوت سے گندگی کے اندھیرے غاروں کی گہرائیوں میں ڈھکیلے چلے جاتے ہیں۔ اللہ جزائے خیر دے بہت بہت جزائے خیر دے "صاحب حق" (روزنامہ حق لکھنؤ کے ایڈیٹر) عبدالرؤف عباسی صاحب کو انھوں نے نفرت و حقارت کے بجائے انسانیت و ہمدردی کے ساتھ اس طبقہ کے جذبات کی ترجمانی کی اور شستہ زبان اور میٹھی بول چال میں، اس داستان دلستان کے پردہ میں حقائق کو ۰۸ صفحات کی ضخامت میں مرتب کرکے اس میٹھی کونین کو عمر میں وقف عام کر دیا یہ کام کرنے کا تھا علما و صالحین کا لیکن اللہ جس سے جو خدمت چاہے لے لے اور جسے جس منصب پر چاہے سرافراز کرے۔

خط ابھی ختم کیا سنئے، آدھا بھی نہیں ہوا چند سطریں اور سن لیجئے:-

"یہ ہے وہ پاک پروردگار سری نستا تو میں کیا کرتی، بدایوں شہر خان بہادر صاحب کا سارا ٹیں، حاکم ان کے اثر میں، پولیس ان کے کہنے میں لاکھوں کروڑوں کے مالک

جو چاہیں کر ڈالیں کوئی پوچھنے گچھنے والا نہیں، میری بات سنو، چلتے چلاتے میں تمھارے ساتھ دوستی کئے جاتی ہوں، ننھی جان اب میں تمھیں ننھی جان ہی کہوں گی پچاس کے لگ بھگ ہو گئی ہو، کبھی اس کا بھی خیال آیا ہے کہ اب موت کے دن قریب ہیں خدا کو ظاہر میں بہت مانتی ہو، نذر نیاز بھی کرتی رہتی ہو لیکن کبھی بھولے سے بھی اسکا وہم آتا ہے کہ کتنے گھر تم نے کھائے ہیں اور کتنے خاندان تم نے تباہ کئے ہیں ان سب کا وبال تمھاری جان پر پڑے گا یا نہیں، یاد رہے کہ تمھارے اعمال قبر میں کالے بن کر ڈسیں گے اور یہ حرامکاری کے پیسہ کی نذر و نیاز ایک کام نہ آئے گی توبہ کرو توبہ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے"

کسی بڑے شہر کے جنکشن اسٹیشن کے باہر، خصوصاً تیسرے درجہ کے مسافر خانوں کے دروازہ پر، جب جی چاہے یہ تماشائے عبرت اپنی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے کہ سامنے فقیرنیوں بھیک منگنیوں کا ایک غول کا غول جھیترے لگائے ہوئے، میلی کچیلی، گھناؤنی بیمار اور لاغر ان میں کتنی ایسی ہیں جو ابھی کل تک جوان تھیں، بنی ٹھنی ہوئی، اپنے حسن و جوانی پر نازاں اور اللہ کی اس امانت کو بازار میں دوکان لگا کر بیچ ڈالنے والیاں۔ بی بی آسیہ کا نام کس نے نہیں سنا ہے؟ بیوی کس کی تھیں، اللہ کے دشمن فرعون مصر کی، اللہ کے دشمنوں ہی کے درمیان پلیں بڑھیں، فرعون ہی کے محل میں رہیں بسیں، اس کے باوجود جب اللہ کی طرف جھکیں، سجدہ میں گریں تو مرتبہ کیا پایا؟ قرآن تک میں ذکر آیا فرشتوں کو رشک آیا اللہ اللہ تائب کے مرتبہ اور سرفرازیوں کا کیا پوچھنا! اور پھر یہ بہکی ہوئی ہماری بہنیں اور بھٹکی ہوئی بیٹیاں تو منکر نہیں مومن ہیں باغی نہیں صرف غافل ہیں آج یہ اپنے خوش نصیب شوہروں کے گھر آباد کئے ہوتیں تو خود بھی کیسی ہنسی خوشی چین اور سکھ کی زندگیاں گزارتیں اور ان کی گودوں میں پل پل کر ہمارے سرور سردار کے لشکر میں کتنے وفادار اور جانباز سپاہیوں کا اضافہ ہوتا! محمد مصطفےٰ کو برحق ماننے والیاں، اس نبی کی امت کہلانے والیاں اس کی شفاعت سے آس لگانے والیاں، کیا خدا نخواستہ ان کے کلیجے پتھر کے ہیں؟ جنت کی

کھڑکی اپنے سامنے دیکھیں گی اور ادھر سے آنکھ بند کرلیں گی، منہ پھیر لیں گی، لپکتے ہوئے شعلوں سے بچانے والا ہاتھ ان تک پہنچے گا اور اسے اپنی ٹھوکروں سے ٹھکرا دیں گی ؟ گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھیں گی اور آگ بجھانے کے انجن والوں کو اپنے پاس سے دھکّے دے دے کر نکال دیں گی۔

طول طویل خط کا ایک آخری ٹکڑا اس کر کتوب اور کتاب دونوں کو بند کر دیجئے: "گھر گرہست اور پاک زندگی کے مزے تم گویا جانو تمھارے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتے امیروں کی تو بڑی بات ہے بیسوں ماماﺋیں، اصیلیں، مغلانیاں ہر وقت منہ دیکھتی رہتی ہیں غریبوں کو لو میاں کے دل پر اگر بیوی بیٹھ گئی اور کیوں نہ بیٹھے گی، بیوی جوان اور وہ بھی جوان زندگی کی خوشی ہر وقت ہاتھ باندھے حاضر رہے گی، درد دکھ، خوشی و راحت۔ رنج وغم میں دونوں شریک، ایک دوسرے کی ہر حالت میں اور ہر جگہ ہمدرد آدمی آج خود مفلس اور فلانے ہوا تو کیا، اولاد کو خون جگر کھا کے حوصلہ سے پالتا اور پرورش کرتا ہے۔ اس امید پر کہ وہ جوان ہوگی تو اسکا ہاتھ بٹائے گی یہ ریت کی عمارت نہیں ہوتی سینکڑوں مثالیں اس کی میری اور تمھاری آنکھوں کی دیکھی ہوئی موجود رہیں۔ کیا تم ایمان سے کہہ سکتی ہو کہ کسی مردی ٹکاہی یا تم سی بڑی ڈیرہ دار طوائف کے پہلو میں ایسی امید ہوتی ہے قصہ طویل ہے اگر خدا نے کچھ بھی عقل دی ہے تو اس خط سے سبق لو"

سبق قصہ کی اس نائکہ نے لیا یا نہیں۔ اسے چھوڑیئے، سبق لینے کے قابل ہے پڑھنے والوں کے اور پڑھنے والیوں کے بوڑھوں کے اور جوانوں کے، تماش بینوں کے اور تماشہ گروں کے، بھپنسنے والوں کے اور پھانسنے والیوں کے، نوابوں کے، رئیسوں کے، امیروں کے، کوٹھوں والیوں کے، فلم ایکٹرسوں کے، ریڈیو اسٹاروں کے، غرض ہمارے آپ کے سب کے صحت کو، عزت کو، دولت کو، برباد کرنے والے اور برباد کرنے والیاں کاش آنکھیں کھولیں اور سوچیں کہ اب تک کس طرح زندگی کا نام کا فور رکھے ہوئے ہیں۔

کوتوال شہر اپنی سراغرسی میں کہاں تک کامیاب رہے؟ حسن جان کا کچھ پتہ لگا؟ میرزین العابدین پر کیا گزری، نواب ضیاء حسین خاں کی خوش تدبیریوں اور ہوشمندیوں نے

کیا کیا گل کھلائے ؟ خورشید مرزا نے سارے کھیل میں کیا حصہ لیا ؟ خورشید دلہن کی اصلیت کیا نکلی ؟ شہزادہ صاحب کی خبر اکبری بیگم صاحبہ نے کس بری طرح لی ؟ میر صاحب حشمہ فروش کی افسوں نوازی کیا رنگ لائی ؟ اس طرح کے سارے سوالات کا حل کتاب میں تلاش کیجئے اور اسکا اطمینان رکھئے کہ جو لوگ مغز کلام کی طرف سے آنکھیں بند کر کے قصہ کو محض لطف زبان اور حسن بیان کیلئے پڑھنا چاہتے ہیں وہ بھی گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔ یہاں تو صرف مصنف سے یہ کہنا ہے کہ اگر انھوں نے اس خداداد نعمت کی پوری قدر کی اور جس طرح اس کتاب میں لطیف و جمیل پیرایہ میں اور دلکش انداز سے نیکی کی فتح بدی پر اور پارسائی کی بے عصمتی پر دکھائی ہے آئندہ اگر اسی رنگ میں دین کی فتح بے دینی پر دکھائی، تو عجب نہیں کہ کل خود ان سے سوال ہو جائے۔

## نغمۂ زندگی[1]

از سید فضل احمد کریم فضلی، بی لٹ (آکسن) آئی سی ایس، چھوٹی تقطیع ضخامت تقریباً ۳۰۰ صفحے، مجلد قیمت باختلاف جلد ۲؎ ۱۲؍ ۔ پتہ دفتر انجمن ترقی اردو دریا گنج دہلی

کتاب کہئے یا ننھے منے سے قد، ہلکی پھلکی قامت کی مناسبت سے کتابچہ، اردو دیوان ہے ایک آئی سی ایس شاعر کا، اور مجموعہ ہے ایک "آکسن" کے اردو کلام کا۔ اپنی نوعیت میں شائد پہلی اور انوکھی چیز!

جدت اور ندرت صرف اسی حیثیت سے کب ہے ؟ قدرۃً نظر سب سے پہلے فہرست پر پڑی اور پہلا عنوان "تصویر شاعر" نظر آیا، ورق الٹا لیکن اُمیں، تصویر کہاں ؟ کسی نے تصویر والا صفحہ پھاڑ تو نہیں ڈالا ؟ جی نہیں صفحہ سالم لیکن درج بجائے تصویر کے صرف ایک شعری تصویر لاحول ولا قوۃ کیا دھوکا ہوا آگے چلئے دوسرا عنوان "دیباچہ"۔ اچھا صاحب دیباچہ تو پڑھنے میں آئیگا لیکن تو یہ اب کی بھرپور دھوکا۔ دیباچہ الفظ، اور اسکے بعد میں دو شعر درج۔ غرض مصنف اور تبصرہ نگار کے

[1] صدق ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء

درمیان آنکھ مچولی شروع ہوئی شیوہ طرز شاعر ہے کہ قدم قدم پر بات دیتا اور بھولا بھالا ناقد ہے کہ مات پر مات کھاتا چلا جاتا ہے! یہاں تک کہ اصل دیوان غزلیات کا شروع ہو گیا وہی ردیف وار اب کہیں استاد غالب سے مشورے ہو رہے ہیں کہیں خواجہ حافظ سے سرگوشیاں کہ صفحہ ۵۷ آگیا اور اب دوبدو ہونے لگی فارسی کے استاد منوچہری سے۔

صفحہ ۹۰ پر غزلوں کا جلسہ ختم ہوا صفحہ ۹۱ سے نظم خوانی کی محفل آراستہ کہیں رباعیاں ہیں کہیں قومی نظمیں اور سب سے آخر میں نظم "آکسفرڈ" میر حسن کی بدر منیر کے وزن پر آکسفرڈ کی سرگزشت اور آکسن کی خود گذشت خدا معلوم اس مثنوی کو مثنوی کہنے میں شاعر نے کیوں تکلف سے کام لیا وہی روانی، وہی شرح بیانی، وہی رمز کنائے وہی حرت وحکایت جو مثنوی کی جان ہوتی ہیں غرض بجز عریانی وفحش نگاری کے اور سب کچھ سب سے بڑی اور شاعر کے نقطہ نظر سے سب سے اہم نظم (یہ بھی مثنوی ہی ہے) کا عنوان ہے "فلم کا جادو" یہاں پہنچکر شاعر نہیں رہتے، واعظ وخطیب بھی بن جاتے ہیں۔ وعظ وخطابت سینما کی ہجو میں نہیں، اچھی پاکیزہ، اصلاحی وانقلابی فلم سازی کی حمایت میں۔ رند میں محتسب کی شان، زبان شاعرانہ، تیور مصلحانہ!

شاعر نے شہد کی مکھی بن، رس خدا معلوم کن کن پھولوں کا چوسا ہے کن کن کلیوں کا چوسا ہے۔ اقبال کا اثر سب سے زیادہ نمایاں، شروع میں بھی، آخر میں بھی، وسط میں بھی، لیکن اپنی خودی کو لئے دیئے ہوئے اپنی شخصیت سب سے الگ تھلگ کئے ہوئے رنگ میں کسی کے بھی پیرو اور مقلد نہیں۔ سب سے آزاد، بس اپنے ہی اوپر اعتماد۔ یہ اور بات ہے کہ قدیم الخیال ریویو نگار کی نظر میں کچھ عیب ہی سا ہے۔

صلاحیتیں اب بھی موجود ہیں خدا کرے عمر میں اضافہ اور مشق میں پختگی کے ساتھ نظر بھی حکیمانہ وعارفانہ ہوتی جائے۔ شاعری تمام تر ایمانی وعرفانی بن جائے، اور حضرت اقبال کی عمر تک پہنچتے حضرت فضلی پورے "اقبال سندھ" ہو جائیں ___ اور زبان؟ وطن کے لحاظ سے پنجابی اور سکن کے لحاظ سے بنگالی، بھلا کیسے ممکن ہے کہ اتنی شاعری صحیح اردو میں کر جائے نکتہ چینی کی

نگاہ اس تلاش میں دوڑی، پھری، گھومی، لیکن بجز ص۹۵ کے آخری شعر کے شائد کہیں بھی جگہ لگنے اور رکنے کی نہ پائی۔

## نقد و نظر[1]

از پروفیسر حامد حسن صاحب قادری، صفحات ۲۰۲ مجلد قیمت سے ر
پتہ :۔ شاہ اینڈ کمپنی، پبلشرز حکیم جی روڈ آگرہ

"نقد و نظر" پر تبصرہ کرنے کے لئے خود بڑے صاحب بصیرت ہونے کی ضرورت ہے۔ لیکن سرے سے آنکھ چرا جانا بھی بڑی بے بصری ہے۔

کتاب پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے زیادہ تر ایسے جو پہلے کسی رسالہ میں شائع ہو چکے ہیں لیکن اب اس مجموعہ میں قرینہ سے سج سجا کر نکلے ہیں تو سب نئے معلوم ہوتے ہیں پندرہ میں سے چند عنوان ملاحظہ ہوں

غالبؔ کی شرحیں، میاں نظیرؔ اکبر آبادی، آگرہ کا ایک قدیم مشاعرہ، مخمانۂ ریاض، زبان کے چند نکتے، تنقید کے نئے زاویئے، عروضی غلطیاں۔

تنوع کے سرسری اندازہ کے لئے یہ عنوانات کافی ہونگے اندازہ "سرسری" اسلئے کہ ادب، انشار، تنقید، عروض، سخن فہمی کے جتنے عمیق نکتے اور جتنے وسیع مبحث کتاب کے اندر پھیلے ہوئے ملیں گے، ان کا پورا اندازہ تو بس کتاب ہی کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے فہرست مضامین کا نقل کرنا یا کوئی چھوٹا موٹا سا تبصرہ بھی اس کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ کتاب شروع سے آخر تک ایک مشرقی کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے مشرقی طلبۂ فن کے لئے اور مشرقی عام ناظرین کیلئے قادری صاحب یہ نہیں کہ ہر مزا اور ورجل کے ناموں سے نا آشنا ہوں۔ وہ واقف بائرن، شیلے سب سے ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان میں سے کسی سے مرعوب نہیں وہ جو کچھ لکھتے ہیں اپنے دل و دماغ سے لکھتے ہیں

[1] صدق ۴ر جنوری ۱۹۵۴ء

اور اہنوں کے لئے لکھتے ہیں صدیہ ہے کہ مجموعہ کا مضمون مطالعہ شاعری ان کا طبعزاد نہیں بلکہ میتھیو آرنلڈ کا ترجمہ ہے لیکن اس کو بھی اپنا لیا ہے، انگریزی نما اردو نہیں بلکہ اردو لکھ کر اور اشعار کا اپنی طرف سے جابجا اضافہ کرکے۔ البتہ وہ ناواقف ایک فن سے ہیں انہیں یہ نہیں آتا کہ اپنے افلاس دماغی پر پردہ پرشوکت اور مرعوب کن ناموں کا ڈال لیں کتاب متوسط اور منتہی طلبہ کے تو خاص کام کی ہے ہی باقی عام شائقین ادب بھی اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور پورا لطف و دلچسپی بھی حاصل کرسکتے ہیں بلکہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بہت سے درس دینے والے اساتذہ بھی اگر کسرشان نہ سمجھیں تو اسکے مطالعہ سے مستفید ہوسکتے ہیں تین سو سے اوپر کی کتاب کیلئے یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اسکے ہر تبصرہ، ہر ہر خیال سے دوسروں کو اتفاق ہو، شرح درد والے مضمون میں تو خصوصیت کے ساتھ فاضل مبصر کے تبصرے نظر ثانی کے محتاج نظر آئے لیکن بہ حیثیت مجموعی اتنی سلجھی ہوئی، سنبھلی ہوئی، ہموئی ہوئی کتاب فن تنقید پر اردو میں عرصہ کے بعد دیکھنے میں آئی عجب طبیعت دوسرے رنگ کی، صاحب آدرسرکاری رنگ کی تنقیدی کتابوں سے اچھی خاصی الگ ہیں سکی تھی!

ایک بڑا سبق ان صفحات سے یہ مل جاتا ہے کہ تنقید و تبصرہ کا لب ولہجہ کیا ہونا چاہئے اور یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ شاعروں، ادیبوں، نقادوں سے اختلاف، اور شدید اختلاف شریفانہ انداز میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ اور ہاں ایک بات تو رہی جاتی ہے تضمین کلام غالب وغیرہ کے ضمن میں قادری صاحب نے جہاں جہاں خود اپنا کلام درج کیا ہے، وہاں تو بے اختیار دل سے یہ نکلتا ہے کہ واہ حضرت آپ تو چھپے رستم نکلے سخن فہمی کے ساتھ سخن گوئی میں بھی طاق۔

ایں سعادت بہ زور بازو نیست

## جزیرۂ سخنوراں[1]

از غلام عباس صاحب، ۱۴۴ صفحات، مجلد خوشنما قیمت ایک روپیہ۔

---

[1] صدق ۲۱ راکتوبر ۱۹۴۱ء

پتہ :- کتاب خانہ ہزار داستان ہم سو بازار لین نئی دہلی۔

یہ ایک افسانہ ہے نئے اور البیلے رنگ کا پلاٹ یورپ سے لیا ہوا لیکن قصہ بالکل اردو میں اپنایا ہوا! ایک جزیرہ ہے، جزیرۂ سخنوراں، تمام تر شاعروں اور ان کے مداحوں سے آباد، اخلاق کی قیود سے آزاد۔ وہاں پر سیاح صاحب معہ اپنی ہم سفر ایک حسین خاتون کے اتفاق سے جا پہنچتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں باتوں باتوں میں مجلس شوریٰ تک پہنچا دیئے جاتے ہیں مجلس کے تین ارکان ہیں ایک ادھیڑ سن کے بزرگ فصیح الفصحا، شاعر بے بہا ملا منشی انوار الحسن یکتا دوسرے ایک طرحدار نوجوان بلبل داستان سرائے گلشن معانی رشک انوری و خاقانی، حضرت افقی؛ تیسرے خود صدر مجلس حقیر پر تقصیر، خاکسار ذرۂ بے مقدار مائل؛

شاعروں کی دنیا، شاعری کی دنیا سے بھی بڑھ کر عجیب اور قابل دید سرکاری مہمان خانہ کا نام دار الخیال، باغوں بازاروں، گلی کوچوں کا نام خیابان میر، غالب بازار، آتش باغ گلزار سرور، کوچۂ سوسن خاں وغیرہ، یہاں کے معشوق کا حلیہ۔

"نصف عورت، نصف لڑکا، ایک طرف محرم، چوٹی، موباف دوسری طرف کلاہ، چیرہ، اور سبزخط، طبیعت میں سفاکی اور جلادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہونٹوں پر عاشقان باوفا کا لہو لگا ہوا کسی پر کمند پھینکی کسی کے پاؤں میں زنجیر ڈالی، کسی کو شہید تیغ ناز کیا کسی کو بحر ظلمات میں دھکا دیا کہ عمر بھر ٹاک ٹوئیے مارتا رہے، کسی کو چاہ ذقن میں غرق کیا، کہ جیتے جی سر نہ اٹھا سکے، نہ انسان مامون نہ وحوش وطیور مصئون" ص ۵۶ و ۵۷

رہا عاشق بیچارا:- "سو وہ مصیبت کا مارا، صدق و وفا کا پتلا، غریب الوطن، فلک ناہنجار کا ستایا ہوا، بھوکا پیاسا، ننگ دھڑنگ، آج یہاں تو کل وہاں، کبھی دریا میں، ناخدا چھنیلی اڑائے تو کبھی صحرا میں آہوؤں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلے، بھیس بدلنے کے فن میں استاد، کبھی مجنوں کا روپ دھار صحرا میں محمل کے گرد چک پھیریاں لے تو کبھی فرہاد بن کر کوہ بے ستون پر تیشہ تیز کرے کبھی انسان، تو کبھی جانور، کبھی گھڑی کی کال کوٹھڑی میں تو کبھی درخت پر کسی گھونسلے میں ص ۵۷ و ۵۸

بیاں کی زبان، صنائع کی جان، بدائع کی کان۔ ایک صاحب اپنی ملازمہ کو گھڑک رہی ہیں: "اری موئی سوئی نہیں ملتی تو گوئی مار کیوں پیچ کھاتی ہے (پیچ پک پیک) ایک عاشق صاحب یوں داد فصاحت دے رہے ہیں:۔

"اے سنگدل تیری سنگدلی پر پتھر پڑیں ہم تو تیرے چہرہ بلوریں لعل لب دُر دنداں کو یاد کر کے، کوہ و بیاباں میں پتھروں سے سر پھوڑیں اور تو غیروں کے سنگ گل چھرے اڑائے سہ

رات آہوں کے شرارے مرے بے ڈھنگ اڑے
کوہ سے سنگ چیخ کر کئی فرسنگ اڑے

معشوق صاحب جواب میں یوں بلاغت کے شرارے چھوڑتے ہیں:۔

"ارے نادان، میزان عشق میں باسنگ ہونا محال، کیوں من من بھر کی باتیں چھانٹتا ہے۔ سنگسار ہونے کی نیت ہے کیا؟"

یہ فاسقانہ عاشق معشوقی میں "سنگ ساری" کا ضلع بہت خوب بہت خوب! (ص۵)

(ص۱) پر غالب کے دو شعروں کی جو شرح کی گئی ہے وہ پرلطف ہونے میں اپنی نظیر آپ ہے مشاعرہ کا منظر بہترین ہے شعر و ادب کے دیوانوں کے لئے ایسے دلکش و رنگین مرقع کا سودا ایک روپیہ میں مفت ہے:۔

## خنداں[۱]

از رشید احمد صاحب صدیقی صفحات ۲۸۱ مجلد قیمت دو روپئے آٹھ آنے۔

پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

یہ اردو کے مشہور ظریف و شوخ نگار، رشید احمد صاحب صدیقی کے چالیس ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے یہ تقریریں عرصہ تک دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوتی رہیں اور اب مکتبہ جامعہ کے

[۱] صدق ۲۲ دسمبر ۱۹۴۲ء

حسن اہتمام سے کتابی شکل میں آگئی ہیں۔ رشید صاحب کی پرلطف طرز نگارش اب پڑھے لکھے حلقوں میں قطعاً کسی سفارش کی محتاج ہے، نہ تعارف کی۔ ان کا ایک خاص اپنا رنگ ہے، دوسروں سے ممتاز۔ اور وہ پختہ ہو چکا ہے۔ بغیر کسی کی دل آزاری بلکہ دل شکنی کے، بلا فحش و ابتذال کے شائبہ کے ہجو اور بیبا کی سے پاک، وہ چھوٹے بڑے اپنے پرائے، سب کے خاکے اس دلچسپ انداز میں کھینچتے چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا ہر سطر پر لطف لیتا جائے مسکراتا جائے، جھومتا جائے اور کہیں کہیں بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

نشریہ تیار کرنے میں مصنف کا قلم آزاد نہیں ہوتا ریڈیو بہرحال ایک سرکاری محکمہ ہے اور محکمہ کی طرف سے طرح طرح کی قیدیں اور پابندیاں عائد ہوتی ہیں ظرافت کی بے تکلفی بھلا ان قیود کا تحمل کہاں کر سکتی ہے لیکن رشید صاحب کی معجز بیانی نے ان پابندیوں میں بھی اپنے کمال کو برقرار رکھا اور اس ضخیم مجموعہ کے ہر ہر صفحہ کو زعفران زار بنائے رکھا ہے بھرتی کا صفحہ تو شاید کوئی بھی نہ ملے اور بعض خاکے تو خاص طور پر دلچسپ اور پرلطف ہیں، ایسے کہ پڑھنے والے انہیں بار بار پڑھیں گے کتاب عوام اور کم استعداد سواد خوانوں کے کام کی نہیں یہ عیب ہو یا ہنر، بہرحال واقعہ یہ ہے کہ رشیدیات سے لطف اٹھانے کیلئے خود بھی اچھا خاصہ پڑھا لکھا ہونا چاہیے۔ ادبی اور شخصی تلمیحات بکثرت ہوتی ہیں۔ کتاب اس قابل ہے کہ ادب اردو کے ہر صاحب ذوق شائق یا طالب علم کے مطالعہ کی میز پر نظر آئے مکتبہ جامعہ نے اس مجموعہ کی اشاعت سے اردو کی ایک خدمت انجام دی ہے۔

---

## گنج ہائے گرانمایہ[1]

از جناب رشید صاحب صدیقی ضخامت ۱۹۲ صفحے قیمت عہ؍
پتہ اردو بک ایجنسی علیگڈھ

---

[1] صدق، ستمبر ۱۹۶۴ء

خنداں کے بعد گریاں! رشید صدیقی کا نام سب جانتے ہیں، یہ علم کم لوگوں کو ہوگا کہ وہ اگر ہنس سکتے اور ہنسا سکتے ہیں، تو رو بھی سکتے ہیں رلا بھی سکتے ہیں۔ انکے مزاحیہ مضمونوں کے مجموعے پہلے نکل چکے ہیں یہ تازہ مجموعہ ان کے تعزیتی مضامین کا ہے۔ ظریف کے آنسو! آنسو نہیں، ہوتی کے دانے ہوتے ہیں۔ اردو کا یہ شرخ نگار آج سوگوار ہے اپنے محبوبوں کے مزار پر عقیدت و محبت کے پھول ہاتھ میں لئے فاتحہ پڑھنے نکلا ہے، اسکا اداس چہرہ، اس کا اداس بشرہ، اس کا حسرت انگیز لہجہ سب قابل دید ہیں۔

محبوبوں کے نام آپ سنیں گے، ان میں سے بعض تو یقیناً آپ کے بھی محبوب ہوں گے محمد علی۔ ڈاکٹر انصاری۔ مولانا سلیمان اشرف۔ مولانا ابو بکر محمد شیث۔ اصغر گونڈوی۔ ادیب عباسی۔ اقبال۔ احسن مارہروی۔ اقبال۔ محمد علی انصاری کو تو ایک دنیا جانتی ہے۔ اصغر بھی کچھ ایسے گمنام نہیں۔ دونوں مولانا بھی علی گڑھ کے حلقہ میں خوب مشہور رہے ایک ادیب عباسی سے دنیا ناواقف تھی، اب واقف ہو جائے گی۔

مضمون بڑا کوئی بھی نہیں۔ سب لکھے ہوئے ہیں لکھوائے ہوئے نہیں ہیں۔ لیکن محمد علی والا مضمون مختصر ہونے کے باوجود سب میں ممتاز ہے، اپنی مثال آپ ہے لکھنے والے کے لئے باعث فخر بھی، موجب اجر بھی، ایک بار سچ مرحوم میں نکل چکا ہے مستحق اس کا ہے دوبارہ چھپے بار بار چھپے۔

کتاب سب کے پڑھنے کے قابل ہے نوجوان طلبہ کے لئے خصوصاً وہ دیکھیں اور سمجھیں کہ جو قلم لطیف مزاح پر قادر ہے وہ تعزیت سے معذور نہیں۔ اور جو قلم لطف و مسرت کی گدگداہٹ کا خزانہ ہے وہ درد و غم کی بھی کسک سے خالی نہیں۔ ادیب بننے سے پہلے شریف ہونا ضروری ہے اور یہ کتاب ایک خادم ادب کی شرافت کی دستاویز ہے۔

---

## ہم اور وہ[1]

از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی ضخامت ۲۱۸ صفحات ۔ قیمت ۱۲/
پتہ ۔ مکتبہ جامعہ دہلی (خود مصنف سے بھی ٹیا محل دہلی کے پتہ پر مل جائے گی)

"قدیم" جدید کی بحث اب خود قدیم ہو چکی ہے اور کوئی جدت اس میں باقی نہیں رہی اس پر بھی جب کوئی زندہ شخصیت اس میں ٹھہرتی ہے تو بحث کی مردہ ہڈیوں میں نئے سرے سے جان پڑ جاتی ہے ۔ مدت سے یہ کہا جا رہا تھا کہ دلی اب دلی والوں سے خالی ہو گئی ۔ اور زبان دانی اس خطہ سے رخصت ہو گئی" ہم اور وہ" نے ثابت کر دیا کہ دلی میں دلی والے اب بھی پڑے ہوئے ہیں اور دلی کی زبان اب بھی ماشاء اللہ اسی آب و تاب سے اسی آن و بان سے زندہ ہے قائم و پائندہ ہے درخشاں و تابندہ ہے ۔ مصنف نے ایک اچھوتے طرز پر قدیم و جدید کی بحث کو اٹھایا ہے اور محاکمہ کا حق ادا کر دیا ہے" نتائج تک پہنچتے پہنچتے ممکن ہے کہ قلم کا رخ کہیں کہیں غلو و مبالغہ کی جانب جھک گیا ہو لیکن بحیثیت مجموعی بات جو بھی کہی ہے ، سچی ، کھری ، سیدھی ، خدا لگتی ۔ اور حسن بیان و لطف زبان کے لحاظ سے تو اپنی نظیر آپ ۔ فصاحت سطر سطر پر بلائیں لیتی جاتی ہے حسن انشا کا ایسا نمونہ دیکھنے کو اب آنکھیں ترسا کرتی ہیں اللہ ان کی عمر میں بہت برکت ، ان کے قلم کو بہت قوت عطا کرے کہ گلشن اردو کو ایسی نہروں سے سیرابی کی ضرورت ابھی مدتوں باقی رہے گی ۔

---

## دلی کا سنبھالا[2]

از خواجہ محمد شفیع دہلوی ۔ ۱۵۰ صفحے قیمت عہ/ پتہ مکتبہ جامعہ دہلی ۔

کتاب کا تعارف ذرا مشکل ہے بس یہ سمجھ لیا جائے کہ گویا ایک آئینہ ہے جس میں اگلے

---

[1] صدق ، ۲۸ ؍ اکتوبر ۱۹۳۷ء [2] صدق ۱۲ ؍ اپریل ۱۹۳۷ء

دلی والوں (کچھ دلی والیوں کی بھی) کی زندہ تصویریں چلتی پھرتی، بولتی چالتی نظر آرہی ہیں اور پھر اس مجمع میں سب ہی طرح کے لوگ ہیں۔ عالم و فاضل بھی اور رند داو باش بھی۔ زاہد و مرتاض بھی، اور شوخ و طرار بھی ایک طرف شاہ عبدالقادرؒ شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، اسمٰعیل شہیدؒ، اور سرسید، حالی، نذیر احمد، حکیم محمود خاں تو دوسری طرف فلاں گویئے اور فلاں ستار نواز اور فلاں بی صاحبہ مصنف کا مقصد تاریخ نگاری نہیں اس لئے ایسی فروگذاشتوں کو نظر انداز کیجئے کہ مولانا اسمٰعیل شہید نے "علم جہاد" حکومت برطانیہ کے خلاف بلند کیا تھا (ص۱۱) مصنف کا مقصد اپنی زباندانی کا جوہر دکھانا اور پرانی دلی کا جیتا جاگتا نقشہ کھینچ دینا ہے اور ان دونوں مقصدوں میں وہ اس طرح کامیاب رہے ہیں کہ گویا امتحان کے پرچوں میں تو نمبروں میں پورے تو پائے ہیں۔ زبان کی صحت اور زبان کا حسن دو الگ الگ چیزیں ہیں یہ ضروری نہیں کہ جو اہل قلم دلچسپ فقرے لکھ لیتے ہیں وہ ترکیبوں، محاوروں، بندشوں کی صحت ادا پر بھی قادر ہوں دونوں کا اجتماع اس وقت کے اردو لکھنے والوں میں خال ہی خال نظر آتا ہے۔ خواجہ شفیع صاحب ان مثالوں میں سے ایک ہیں۔

اور پھر اسلوب بیان کی دلکشی نہیں، دلبری اس پر قیامت۔ یہ ممکن نہیں کہیں سے کوئی صفحہ کھل جائے، اور پھر ختم کئے بغیر آپ کا چھوڑنے کو جی چاہے۔

ایک دو فقروں پر نگاہ اچٹتی سی ڈالتے چلئے۔

"اہل دربار مؤدب کھڑے ہو گئے دلی ماتا نے تعظیم دی۔ یہ کون تین بھائی آرہے ہیں کہ ملاء اعلیٰ طبقات فورئے ساتھ ساتھ ہیں۔ نقیب نے آواز دی مولانا شاہ عبدالقادر صاحب مترجم کلام پاک، مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب، تفسیر فتح العزیز کے مولف مولانا شاہ رفیع الدین صاحب بھاٹ نے عرض کی ؎

خاموشی در ثنائے تو حد ثنائے تست

رفعت علم تالب فرش لینے آئی صف علماء میں مرتبۂ بلند پر لے جا بٹھایا۔ مولوی میاں نذیر حسین اپنے معتقدین کے ہمراہ دفاتر احادیث مقدسہ لئے تشریف لائے۔ درجہ اعلیٰ پر بصد ادب بٹھائے گئے۔ شاہ اسمٰعیل صاحب صراط المستقیم کی تلقین فرماتے تشریف لائے اہل دربار نے تعظیم دی دلّی ماتا نے نظر عنایت دیکھا اور کہا سر پر خود شہادت پرتو فگن ہے۔ ان کا مستقبل بتاؤ، منجم قدرت نے دلّی ماتا کی پیشگوئی کی شہادت دی "

علم و تقدس کی اس شہ نشین سے اتر کر اب ضلع جگت کے میدان میں آئیے۔

"ہر روز محفل آراستہ ہوتی ہے شہر بھر کے تیز و طرار شوخ گفتار جمع ہوتے اکثر زبان دراز دور دور سے مقابلہ کے لئے آتے ہیں استاد کی سب سے چھوٹ ہوتی ہے، جو منھ آتا ہے منھ کی کھاتا ہے ظالم ایک نہ ایک فقرہ ایسا چست کرتا ہے کہ بڑے سے بڑا منھ زور منھ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ جواب نہیں بن پڑتا، اپنا سا منھ لے کر چلا جاتا ہے استاد چلتے چلتے فقرہ کستا ہے دیکھنا جیسے پیٹھ دکھائی، ایسے منھ بھی دکھانا پھر بھی آنا جو ایک دفعہ مقابلہ پر آجاتا ہے اس کا پھر منھ نہیں پڑتا، کہ منھ دکھائے۔ استاد ایسا منھ توڑ دنداں شکن فقرہ کہتا ہے کہ منھ پھیر دیتا ہے "

زبان و ادب کے معیار سے ایسی کتاب مدت کے بعد دیکھنے میں آئی اور عام متفرق معلومات کے لحاظ سے بھی کتاب گھٹیا نہیں۔

## شرح درد [1]

از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی، ۱۴۴ صفحے قیمت عہ۔ خود مصنف سے ٹٹیا محل کے پتہ سے ملے گی۔

خواجہ محمد شفیع دہلی کے رہنے والے ہیں اور نئی دہلی کے دور میں پرانی دہلی کی

[1] صدق، ۲۰ نومبر ۱۹۴۱ء

یادتازہ رکھنے والے خواجہ میر دردؔ کے کلام کی یہ شرح، شرح دردؔ اپنے رنگ میں فرد انھیں کے قلم کی ہے۔

کلام کی شرح تو خیر ایک چیز ہی ہے شارح کی نثر بجائے خود ایسی ہے کہ فصاحت لوٹی جاتی ہے دیباچہ کی ابتدا کھجور کے درخت سے ہوتی ہے، جی ہاں کھجور کے درخت سے! ان رسیلی، شربتی، شیرہ ٹپکتی ہوئی لال لال کھجوروں کا مزہ تو بعد کو چکھیئے گا ابھی ذرا ہری بھری ٹہنیوں، خوشوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کی سیر کرتے چلئے۔ صحرائے عرب کا نخل، کھجور کا درخت، ہر رگ و ریشہ کام کا، پھول پتی کارآمد پھل غذا، گٹھلی دوا۔ جڑیں مضبوط، بلند و بالا، استوار، باد سموم کے تھپیڑوں سے جھک جائے۔ دم کے دم پھر سیدھا، مرکز سے جنبش نہیں، اپنی بقا کے لئے کم از کم کا طالب دوسروں کی بقا کے لئے زیادہ سے زیادہ حیات بخش، فروعات سے معرّیٰ چوٹی پر ایک گتھا ہوا گلدستہ پھول پھل سب ایک جگہ، ایک جہتی، اور سلوک کا نمونہ، سایہ دور تک پھیلے، جگہ کم سے کم گھیرے، برگ و بار کی ہر فصل یا نسل اس کو ایک پوری بلندکر جائے خود سپرد خاک ہو، کھاد بن جائے، آنے والوں کے لئے بلند تر مقام کی بنا بنے۔ (صفحہ)

بارہ کی اس گنتی میں ماہ ربیع کی بارھویں کی بہار۔ بارہ برجوں کے خالق کی قدرت کا رمز اس سے آشکار، نئی تشبیب اور نئی گریز۔ مجاز سے حقیقت کی طرف آیئے، اور لفظی بندشوں میں معنویت کی مٹھاس پایئے۔

"جس خطہ نے ان خصوصیات کا متحمل درخت پیدا کیا اسی دیس سے ایک دین چلا، کارآمد فطری اصول کا حامل۔ قوی الاساس۔ رفیع النظر۔ راستی و راست بازی کا حامل۔ دب دب کر ابھرنے والا، لیکن تسلیم و رضا کا طلبگار۔ فرقہ بندی سے غیر متاثر وحدت کا پرستار، مرکزیت کا دلدادہ، اتفاق کا حامی، رسم و رواج کی بہنائیوں سے معریٰ، ہلکا پھلکا دور رس۔ ترقی کا راستہ دکھانے والا، فنا میں بقا کا سبق

دینے والا، یہ وہ مذہب تھا جو رسول عربی لے کر آئے"۔ ملا

زبان کی ان لطافتوں، ادب کی ان نزاکتوں کی، جو قدر نہ کرے وہ یقیناً اردو سے بارہ پتھر باہر۔

## ناکام[1]

ازخواجہ محمد شفیع دہلوی، ضخامت ۱۶۰ صفحے، قیمت ۱۲ آنے
مصنف کے پاس سے، شمائل دہلی کے پتہ سے مل جائے گی۔

دہلی کے جدید انشا پرداز خواجہ محمد شفیع کا نام اب نہ اردو کے طلبہ کیلئے نامانوس رہا ہے نہ ناظرین صدق کے لئے "ناکام" ان کا تازہ ترین افادہ قلم ہے سرسری نظر میں ایک دلکش افسانہ گہری نظر میں حکمت و اخلاق کا خزانہ، اور ہر صورت میں ادب و انشا کا ایک گنج شائگاں زہرہ ایک مشہور بیسوا ہے حسین و حاضر جواب مغنیہ اس کا سابقہ ایک نوجوان کاظم سے پڑ گیا ہے کاظم ذہانت میں فرد، حاضر جوابی میں استاد ہر رنگ میں رنگا ہوا گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے لیکن اپنے کو لئے دیئے ہوئے، نفس کو قابو میں کئے ہوئے۔ اس کا دل اس کے کہے میں، وہ خود دل کے کہے میں نہیں۔ بیسوا نے خوب خوب کمندیں پھینکیں، ہر ہر طرح جال ڈالے، وہ ظالم ایک بار بھی نہ پھنسا، ہر بار خود شکاری ہی کو شکار کرتا گیا اور چوٹ کھائے ہوئے غرور و تمکنت پر چرکے دیتا گیا۔ لفظ و عبارت میں سے و شاہد کی وہ سخن آرائیاں کہ دھوکا دیوان حافظ کا ہونے لگے معنی و مفہوم میں اخلاق و موعظت کی وہ گل افشانیاں کہ گمان گلستان سعدی کا گزرنے لگے۔

زبان کے جوہر دیکھنے ہوں تو کاظم کا معرکہ ایک رئیس کی محفل میں میراثی صاحب

---

[1] صدق ۲۴ر فروری ۱۹۳۲ء

سے ملاحظہ ہو رئیس صاحب اپنی بے فنی اور بدآوازی پر نازاں، سرمحفل چنگھاڑ رہے ہیں۔ ساری محفل ان کے بنانے یا داد دینے پر متوجہ، چوٹیں کاظم اور میراثی کے درمیان چلنے لگیں۔ ہلکی سی جھلک دیکھتے چلئے :۔

"میراثی پھیکا پڑا جا رہا ہے، ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا، دماغ سے اتار اتار کر باتیں لا رہا تھا۔ بولا سرکار شانوں سے سُر نکل رہے ہیں۔ کاظم نے کہا "عالی جاہ مجسم موسیقی ہیں، ہر بن مو سے سر برس رہے ہیں۔" میراثی نے بہت زور مارا، باپ دادا کی ساری طاقت سے کام لے کر کہا۔

سرکار شاہ موسیقی ہیں۔" وہ حاضر دماغ بولا عالی جاہ شہنشاہ موسیقی ہیں، لحن داؤدی پائی ہے اس فن کے پیغمبر ہیں۔ میراثی نے زمین پر ہاتھ ٹکا دیئے، اور بولا "تان سین قبر میں پڑا تڑپ رہا ہے۔ کاظم نے عرض کیا "بیجو باورے کی روح قدم بوس ہونے آئی ہے اگر ہاروت کو یہ فن آتا تو زہرہ کے راگ میں نہ آتا۔ سر ہاتھ باندھے کھڑے ہیں موسیقی دامن سے وابستہ سرکار راجہ اندر ہیں۔ موسیقی آپ کے دم قدم سے ہے اعجاز ہے اعجاز۔ شجر و حجر جھوم رہے ہیں مردہ دل زندہ ہوئے جاتے ہیں سر نہیں نفس عیسوی ہیں۔" میراثی کچھ بھی ہو میراثی تھا تابڑ توڑ فقرے سن کر تیورا سا گیا جب زبان نہ چلی تو سر پیٹنا شروع کیا اور لگا حال کھیلنے یہ رنگ کاظم کے بس کا نہ تھا میدان جاتا نظر آیا، بازی ہرتی نظر آئی پرواہ رے دماغ فوراً بولا "سروں کا زور ہے آگ لگ جائے گی۔ پانی ڈالو جلدی کرو۔" اور ساتھ ہی ساتھ برف کے پانی کا بھرا ہوا جگ اٹھا بدنصیب میراثی پر ڈال دیا، میراثی حال سے بے حال ہو گیا گھگھی بندھ گئی

(صدق ۱۵۹ء)

گنہگار عورت کے دل کی چبھن دیکھنا ہو تو ورق الٹیے، بیسوا کے کوٹھے پر کسی نے ایک پراثر قصہ میں مناسب تمہید کے بعد یہ شعر جو منسوب اکبر الہ آبادی کی جانب ہے

سنا دیا ہے ؎

کون خوش بخت زمانہ میں ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

اس پر سیوا کے تاثرات :-

"کان یہ سن رہے تھے، آنکھوں کے سامنے ازدواجی زندگی، اپنے مناظر پیش کر رہی تھی اور میں اس تماشہ میں غرق تھی، ایک عجیب لطف تھا عجب کھٹک تھی، نرالی کاوش تھی، اچھوتی خراش، میں ان کیفیات میں ایسی محو تھی جیسے بھوکا روٹی کے تصور میں یا بچہ اولاد کے خیال میں سینہ میں ایک چیز تھی، جو کچھ مانگ رہی تھی پہلو میں ایک خلا تھا، جو آج میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا میرا ہر قطرۂ خوں کسی کی تلاش میں رواں، میری نسائی فطرت میں ایک طوفان بپا تھا، آج مجھ میں وہ عورت جاگ اٹھی تھی جو بیوی بننے کے لئے پیدا ہوئی جو ماں بننے کے لئے پیدا ہوئی ہے آج وہ خلقت انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی جسے افیون دیکر سلا دیا گیا تھا آج وہ حقیقت اپنا حق مانگنے آن پہنچی تھی جس کو کذب ریا اور غلط فضا کے انبار میں دبا دیا گیا تھا رنڈی کا جامہ چاک کر کے عورت برآمد ہونے کو تھی عورت جو گھر کو پانا سمجھتی ہے عورت جو اپنا خون چڑھا کر نسل انسانی کو پالتی ہے عورت جو شفقت سے خمیر کی گئی ہے عورت جو ماں سے تعبیر کی گئی ہے میں آدم و حوا کے نمائندوں کو دیکھ رہی تھی" آج میں فطرت تھی فطرت تھی ماحول سے مبرّا فضا سے بالا تر (صفحہ ۱۹۱)

غرض کتاب کیا ہے ایک تجربہ۔ صورت رندوں کی، سیرت زاہدوں کی، چہرہ پر شوخی و ظرافت کی نقاب، نقاب کے اندر پیشانی پر زہد کے سجدوں کے نشان بیسویں صدی

کے ہر نوجوان کے ہاتھ میں جانے کے قابل افسانہ نام کا ناکام لیکن ہر اعتبار سے کامیاب۔

## نزول رحمت معروف بہ میلاد شریف[1]

از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی قیمت ۴ر ملنے کا پتہ (۱) خود مصنف ٹیا محل دہلی (۲) مکتبہ جامعہ دہلی

دہلی کا ہونہار اور مشہور انشا پرداز خواجہ محمد شفیع، مولوی بن، چوکی بچھا، لوبان سلگا، اگر کی بتی جلا، خوش عقیدگی کا جبہ پہن پہنا، حسن عقیدت کا کیوڑہ گلاب چھڑک چھڑکا، محفل میلاد پڑھنے بیٹھا ہے اور ختم محفل کے بعد جب تبرک کی تقسیم کا وقت آیا تو حلقۂ صدق کو بھی اس کی "وہابیت" کے باوجود محروم رکھنا گوارا نہ کیا۔

خواجہ کے منہ سے نکلے ہوئے بول، یوں بھی آپ واقف ہیں کیسے ہوتے ہیں میٹھے رسیلے، پھر جب ذکر بھی ٹھہرا، عزیز لذیذ، دلپذیر، محفل میں آ بیٹھنے والے خود تجربہ کرکے دیکھیں۔ بہتوں کے عجب نہیں کچھ عقائد ہی درست ہوجائیں بہتوں کے کان میں کام کی باتیں پڑجائیں اور جی فریفتہ ہے کہ سب ہی کا لگ جائے۔ مشک کے اوصاف عطار کی زبان سے سننے میں لطف ہی کیا ہے ایک ذری سا نمونہ ہتھیلی پر رکھ کر خود ہی سونگھ لیجئے نہ؟

"اہل عرب کی عقلوں پر بت پرستی کے پتھر پڑے تھے، ہٹ دھرمی ضد اور بے جا بہادری کے فولادی خود دماغوں پر چڑھے تھے حرص و ہوا کی سیاہی ان کے دلوں پر طاری تھی جوئے نے ان کی قسمت کا پانسہ پلٹ رکھا تھا عیش پرستی نے ان کو اندھا کر دیا تھا یہ دو دروزہ آنی جانی بزرگی و برتری کے

---

[1] صدق ۴ر جنوری ۱۹۲۳ء

دلدادہ مخالفت اسلام پر آمادہ ہو گئے، ایک طرف مٹھی بھر کلمہ گو، دوسری طرف جاہلوں کے جتھے، ظالموں کے گروہ گو بظاہر شیر بکری کی لڑائی تھی، لیکن اس بکری کا رکھوالا، زمانہ بھر کا بالنہار وہ آقائے روزگار تھا، جسے وہ رکھے اسے کون چکھے، نہ دشمنوں نے اپنی کرنی میں کوئی کسر رکھی، نہ دوست نے دوستداری میں۔

ع دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تر است

خدا کے ہاتھوں صحابہ کی کوشش سے اسلام کی کھیتی دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی چلی گئی۔ کفار نکہ نے سخت ظلم ڈھائے، بڑے بڑے فساد مچائے۔ سیل فنا کی طرح چڑھ چڑھ کر آئے لیکن یہ اسلام کی دیوار ریگ کی نہ تھی جو بہہ جاتی ہر ریلے کے بعد پختہ سے پختہ تر ہوتی گئی۔ مشرکین نے اہل دین پر جو ظلم توڑے اور جیسی جیسی آفتیں ڈھائیں، ان کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے اور بیان سے دل دہلتا ہے"
(ص۳۵ و ص۳۷)

چلیئے میلاد خوان کی آواز کان میں پڑ گئی اور آپ بھی داخل حسنات ہو لئے، جی لگا ہو تو محفل میں شروع سے آخر تک شریک ہوں۔ سودا کل چار یا پانچ آنے کے ٹکٹ میں مہنگا تو ہرگز نہیں۔

---

## چند افسانے[1]

از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی، ۱۰۸ صفحے مجلد قیمت ایک روپیہ
پتہ:۔ اردو مجلس ملیا محل دہلی

دہلی کے سحر طراز انشاپرداز اہل زبان خواجہ شفیع سلمہ، اب اس منزل سے

---

[1] صدق ۸ مارچ ۱۹۴۳ء

گزر چکے ہیں کہ ان کی کسی نئی کتاب کے تفصیلی تعارف کی ضرورت ہو اب ان کا نام خود ہی ایک مکمل تعارف ہے مضمون کے پاکیزہ، شستہ و لطیف ہونے کی ضمانت زبان کی صحت سلاست و شیرینی کی دستاویز!

مجموعہ (جی میں آتا ہے اسے گلدستہ کے نام سے پکاریئے) میں دو نظمیں ہیں اور کوئی دس بارہ ہلکے پھلکے افسانے۔ پُربہار جیسے موسم گل، دلآویز جیسے نغمۂ بلبل افسانوں کے پلاٹ کہیں مسجد و خانقاہ کے نہیں، وہی بازاروں کے اور ہوٹلوں کے کالج کے لڑکوں کے اور بیسواؤں کے کوٹھے کے لیکن مجال کیا جو دامن خیال بھی معصیت سے آلودہ ہونے پائے اور طبیعت کی پاکیزگی پر کوئی داغ دھبہ، فحش و ابتذال کا پڑنے پائے۔ خواجہ اپنے ہاتھوں سے خوب بھر بھر کر آپ کو پلائیں گے؛ گلاس پر گلاس چھلکائیں گے، بوتل پر بوتل لنڈھائیں گے آخر میں آپ کی زبان سے نکلے گا تو یہ کہ سبحان اللہ یہ تو عجب اسرار تھا۔ کلوار کی بھٹی کی جگہ جنت الفردوس میں پہنچ گئے اور پیل دیکھ کر جن شیشوں پر جانی واکر[1] کے قدحوں کا گمان تھا، وہ شراب طہور کے جام نکلے" زبان دہلی کی مستند اور ٹکسالی، اور ادب سے مذاق رکھنے والوں کے حق میں ایک نعمت ــــ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ کتاب "عوام پسند" طبقہ میں شامل ہونے کے قابل نہیں، اچھی خاصی استعداد اور اردو کے نسبتاً بلند مذاق کے بغیر کتاب پڑھنے والے کوئی خاص لطف شائد محسوس نہ کر سکیں۔[2]

## شیش محل

از شوکت تھانوی ضخامت ۳۴۰ صفحے قیمت ۸/ مجلد گرد پوش

پتہ:۔ اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ لاہور

---

[1] برطانیہ کا ایک مشہور و قدیم کارخانہ شراب۔

[2] صدق یکم نومبر ۱۹۴۲ء

شوخ نگاری و ظرافت دوسروں کے لئے پطرس بلکہ رشید صدیقی تک کے لئے ایک مشغلہ تفریح رہی ہے شوکت نے اسے اپنا مستقل فن بنا لیا ہے، اور وہ انکی نگاہ ایک فن کار کی نگاہ ہو گئی ہے ان کا قلم ایک فن کار کا قلم ہے۔

"شیش محل" ان کے مطالعہ بشری کا ثمرہ ہے اپنے ملنے والوں میں سے ۱۱۲ کے چہرے حروف تہجی کی ترتیب سے انھوں نے اس قلمی آئینہ میں دکھا دیئے ہیں سب کے سب کسی نہ کسی حیثیت سے ادب ہی سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ از راہ نازک خیالی سے کہیں صرف کتب فروشی کو بھی اس تعلق کے لئے کافی سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ قلمی نگارخانہ یوں کہئے کہ ایک عجائب خانہ ہے بعض ان مشاہیر میں اتنے مشہور کہ انکا تعارف بھی ان کی توہین، بعض ایسے گمنام کہ اتنی تعریف و تعارف کے بعد بھی مجہول کے مجہول ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی، بعض ایسے ہیں جو سب کچھ ہیں بعض ایسے بھی ہیں جو کچھ بھی نہیں، ایسے بھی جن کا پیچھا شہرت نہیں چھوڑتی ایسے بھی جو شہرت کی تلاش میں دوڑتے دوڑتے تھک چکے ہیں۔ غرض ریاض خیرآبادی، ڈاکٹر عبدالحق، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی سے کر افقر موہانی امید امیٹھوی اور صدیق بکڈپو تک ہر ردیف ہر قافیہ، ہر وزن، ہر بحر کے نمونے اس دیوان میں بشاعر کہیں تو خالی مصرعہ طرح پڑھ کر چپ ہو گیا ہے اور کہیں دو غزلہ بلکہ سہ غزلہ چھیڑ دیتا ہے نگارخانہ ظریف کا ہے مزاح دشوخی ہر چیز پر مقدم ہے لیکن حقیقت وصداقت بھی عموماً دوش بدوش عموماً کا لفظ خیال میں رہے ظرافت کی گلکاریاں شوخ نگاری کی رنگ آمیزیاں سورخ کے کیمرے اور فوٹوگرافی کی قائم مقام نہیں ہو سکتیں۔ چہرے یقیناً دلچسپ و دلکش سب کے ہیں اور یہی فن کار کا کمال ہے۔ البتہ کوئی چہرہ اترا ہوا، کوئی ذرا لٹکا ہوا کسی پر رعنائی و زیبائی کا نقاب پڑا ہوا کسی پر روغن حسن افزا کا غازہ پھیرا ہوا کسی کی پیشانی پرشکن، کسی کے چشم وابرو پہ

غضب کا بانکپن۔

ظریف نے ہنسنے ہنسانے کا سامان قدم قدم پر کیا ہے لیکن کہیں کہیں اندازہ کرنے میں خود بھی چوٹ کھا گیا ہے۔ نازک خیال اور پھر لکھنؤ و جوار لکھنؤ کے نازک خیال نازک مزاج بھی کچھ کم بستے ہیں۔

حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم

لیکن معاملہ دوسرا ہے، خوب کیا شوکت صاحب نے دیباچہ ہی میں سب سے معافی مانگ لی، ورنہ عجب نہیں جو "بزم رزم" میں تبدیل ہو کر رہتی اور

اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں

کی شاعری حقیقت بن کر رہتی (یہ اسد خدانخواستہ اسد اللہ خاں غالب نہیں، وہ دوسرے بزرگ ہیں جن کا یہ مصرعہ شہرت دوام حاصل کئے ہوئے ہے

ع مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

صلہ سے صلہ تک ایک بزرگوار کا ذکر جس رنگ میں ہے، یقین تو ہے کہ شوکت صاحب نے بازو پر امام ضامن باندھ کر لکھا ہو — شیش محل پر بے تحاشا پتھراؤ اس کے بعد کچھ بھی بعید نہیں رہ جاتا ہے!

چیز محض تفریح اور دل لگی کی نہیں۔ کل اس سے بڑے بڑے سنجیدہ مورخ خوشہ چینی کریں گے۔ آخر آج بھی کتاب الاغانی کے حوالے کس شدومد کے ساتھ مغرب و مشرق کے بڑے بڑے سنجیدہ مؤرخ دے رہے ہیں پھر کیا یہ ادیب اور شاعران گردوں کے سازندوں، اور ڈھاڑیوں سے بھی گئے گزرے ہوئے۔

کمی اور بڑی کمی اس کتاب میں یہ ہے کہ نگارخانہ خود مصور کے مرقع سے خالی ہے — مجنوں کا ڈراما بغیر مجنوں کے پارٹ کے یا بارات بغیر نوشہ کے! عرضی دعویٰ بغیر تعلیم خود! — ظریف کی ستم ظریفی!

# اعمال نامہ

از سر سید رضا علی ایم، ایل، اے ضخامت، ۲۷۵ صفحے تقطیع ۲۰×۲۶ مجلد مع تصاویر، قیمت آٹھ روپیہ، پتہ ہندوستانی پبلشرز (دہلی)

اعمال نامہ! نام سن کر ذہن پولیس اور تھانہ کی طرف منتقل نہ ہو اور نہ کراماً کاتبین کے نامہ اعمال کی طرف! کتاب کا تعلق ان دونوں میں سے کسی سے بھی نہیں ایک زندہ دل علیگڈھی کی کہانی اسی کی زبانی ہے اور بہتر ہوتا کہ یہی عبارت اندرونی سرورق پر بطور کتاب کے عنوان تحتانی کے لکھ دی جاتی۔

مرادآباد کے سید رضا علی سے علی گڑھ کے حلقہ میں کون ناواقف ہے بڑے منچلے بڑے ہونہار شروع ہی سے بتے بی اے کیا، ایل ایل بی ہوئے، محسن الملک مرحوم کے پرائیوٹ سکریٹری رہے، وکالت میں نام پیدا کیا، لیگ کے سلسلہ میں شہرت حاصل قومی لیڈری اور سرکاری جاہ و منصب کے اونچے اونچے مرتبے طے کرتے ہوئے اب "سر" ہیں، سی، بی، ای ہیں سنٹرل اسمبلی کے ممبر ہیں مسلم لیگ کے سابق صدر ہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔ اور اب جاکر یہ کھلا کہ قانون اور سیاست کی خشکیوں کے باوجود یہ بوڑھا لڑکا (کسی نے اولڈ بوائے کا یہ ترجمہ خوب کیا ہے) ایک خوش ذوق سخن فہم اور اچھا خاصہ اہل قلم بھی ہے ؎

وہ نام خدا شعر بھی کرنے لگے موزوں

افسانۂ حیات پُرشور دلچسپ کس کا نہیں ہوتا؛ بشرطیکہ بدمذاقیوں سے خود ہی

---

سلہ صدق ۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء

تاثیر اور دلچسپی کا خون نہ کر دیا جائے اور پھر یہ تو محض آپ بیتی نہیں جگ بیتی بھی ہے محسن الملک اور وقارالملک، جسٹس محمود اور بک اور ماریسن، سر علی امام، مظہرالحق راجہ صاحب محمود آباد، نواب صاحب ڈھاکہ، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر ضیاءالدین احمد، مولانا شبلی، اکبر الہ آبادی محمد علی، شوکت علی سے لیکر کلکتہ کی مشہور مغنیہ تک خدا معلوم کتنوں کی قلمی تصویریں آپ کو اس مرقع میں ملیں گی، اور کتاب کہنا چاہئے کہ انگریزی تعلیم یافتہ اسلامی ہند کی چالیس پچاس برس کی ایک سرسری تاریخ بن گئی ہے مگر ایسی تاریخ جس میں قدم قدم پر شعر و ادب مداخلت کرتے نظر آرہے ہیں شائد مداخلت بے جا کی حد تک!

سید صاحب مذہباً شیعہ ہیں مگر ایسے شیعہ جو سنیوں میں گھلے ملے ہوئے ہیں اور یہ اثر ایک تو علی گڑھ کی تربیت کا ہے اور پھر اس کا بھی کہ ان کے بزرگوں میں اہل سنت بھی رہے ہیں، سید صاحب تجدد سے بھی متاثر ہیں، پردہ کی بحث میں کھل کھیلے ہیں لیکن ان کا تجدد کچھ بجھا ہوا سا ہے ایک اور مرادآبادی کی طرح جو ہندوستان میں اس مسلک کے نقیب ہیں ان کا تجدد نہ خود مشتعل ہے نہ دوسروں کے لئے اشتعال انگیز اور صبر آزما۔ سیاسیات میں بھی سید صاحب کی روش کچھ مرنجان مرنج سی ہے کہیں کہیں گرما گرم بھی لیکن بحیثیت مجموعی سب کو سموئے ہوئے، مروت کی نظریں ہر طرف کئے ہوئے۔

کتاب حسن ترتیب کے اعتبار سے کچھ زیادہ ممتاز نہیں، خلط مبحث جا بجا ہو گیا ہے لیکن حسن ترتیب ہے بھی مشکل چیز اور کہنہ مشقی کے بعد ہی میسر آتا ہے جو پیشہ ور مصنف نہیں، ان کے ہاں آسانی سے نظرانداز کیا جا سکتا ہے، کتاب متفرق معلومات کے کشکول کی حیثیت سے بڑی دلچسپ اور پر لطف ہے اور شعر و ادب کے بکثرت مباحث میں کہیں کہیں تو سید صاحب بڑے پتہ کی کہہ گئے ہیں، کاش ادب ہی کو انہوں

اپنا مستقل موضوع رکھا ہوتا! ایک بڑی بات، ہندوستان کی موجودہ ذہنی فضا کے لحاظ سے بہت بڑی بات یہ ہے کہ کتاب سوانح عمری محض دماغ کی نہیں بلکہ دل کی بھی ہے "گفتنی" کی تصریحات کے ساتھ ساتھ اشارات "ناگفتنی" کے بھی جا بجا پھیلے ہوئے ہیں اور "بُرونِ در" کی نقاشی کے پہلو میں مصوری "درونِ خانہ" کی بھی اچھی خاصی ہوتی گئی ہے۔

یہ صرف پہلا حصہ ہے دوسرا عجب نہیں کہ اس سے دلچسپ تر ہو۔

---

## رسالہ کلیم دہلی[1] (ماہوار)

ایڈیٹر جوش صاحب ملیح آبادی، قیمت سالانہ چھ روپے ضخامت ۶۰ صفحے

جوش صاحب ابتک "شاعرِ انقلاب" تھے اب کلیم کے صفحات میں داعیٔ انقلاب کی حیثیت سے نظر آرہے ہیں پہلے ہی نمبر میں اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت پر ایک پُرجوش مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے اس کو شروع یوں فرماتے ہیں:۔

"نوعِ انسان کے مصلح بننے کا خیال کس قدر مضحکہ خیز خیال ہے انسان انسان کی اصلاح کرسکتا ہے؟ کیا یہ واہمہ نہیں؟"

لیکن یہ نہ ارشاد ہوا کہ دعوتِ اصلاح اگر تمام تر مضحکہ خیز ہے تو دعوتِ انقلاب کو سنجیدگی اور حقیقت سے کس قدر تعلق ہے۔

دعوت انقلاب بار بار پڑھنے کے بعد بھی انقلاب ادبی کا کوئی نمونہ اس صحیفۂ انقلاب کے اندر نہیں ملتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی جگہ "بنام قوت وحیات" کو رائج کر دینا کیا کوئی معمولی انقلاب ہے؟ تو عرض ہے کہ قوت یا

---

[1] صدق ۱۱ مارچ ۱۹۳۶ء

شکتی اور حیات کو مستقل دیویاں تو مشرک قومیں مدتوں سے مانتی چلی آئی ہیں اور ہندوستان میں ان کی پرستش ہزار ہا ہزار سال سے چلی آرہی ہے اس میں انقلاب، کی کیا بات ہوئی زیادہ سے زیادہ ارتجاع یا ارتداد ذہنی کہہ لیجئے، رہیں نیم برہنہ زنانی تصویریں سو یہ شرف بھی لاہور، دہلی وغیرہ کے بعض رسالوں کو مدت سے حاصل ہے۔ انقلابیت اس میں بھی کچھ نہ ٹھہری۔ مدیر کلیم کی نثر میں تازہ کلام کا اندازہ اقتباس ذیل سے ہوگا ہندو مسلمان دونوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:۔

میں تمھاری صفوں میں سے آندھی کی طرح گزروں گا، تمھاری بے مغز سری پر کڑی کمانوں کی طرح کڑکونگا اور طوفانی بادلوں کی طرح گرجونگا۔ تم پر میرا غیظ و غضب بھرے ہوئے دیوتاؤں کا غیظ و غضب ہے — اے مورکھ ہندوؤ — اور اے نادان مسلمانو! دین دین، دھرم دھرم، کلیجہ پیپ ہوا جاتا ہے ان جھوٹی اور کھوکھلی آوازوں سے — اے دھوتی اور پائجامہ کے گرد ہوا ے لوٹنے اور بدھنے کی انجمنو، اے داڑھی اور چٹیا کے اداردو، تمھاری کس کس حماقت پر رحم کروں "

یہ جوش و خروش، غیظ و غضب اگر محض تخلص کی مناسبت سے ہے اور یہ گرج اور چمک اور یہ پوشر با تجلیات آتشیں اور سب سے بڑھ کر بقول ایک صاحب کے "بین ترانیاں" اگر اسم کلیم کی شاعرانہ رعایت سے ہیں تو اس حسن ادا کی داد نہ دینا ظلم ہے لیکن اگر ان کے سوا کوئی اور صنعت ملحوظ رکھی گئی تو اتنا رسا دماغ کوئی کہاں سے لائے۔

مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر کے اور بعض دوسرے صاحبوں کے ادبی مضامین اچھے ہیں، خود جوش صاحب بھی تو بہت اچھے ادیب بن سکتے ہیں اگر چاہیں۔

---

# انشاء[1]

از مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی ۱۰۷ صفحے قیمت ۱۲؍ آنے
پتہ :۔ مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی
مشہور صاحب طرز شاعر و نثار، انشاء اللہ خاں انشا کی شاعری پر یہ ایک دلچسپ تبصرہ ہے اس وقت کے صاحب طرز انشاپرداز مرزا فصاحت اللہ بیگ دہلوی کے قلم سے دو لفظی تعارف یوں کیجئے کہ انشا انشا پرداز کی نظر میں "

اس سے زیادہ کچھ کھل کر کہنا کتاب کے لطف و لطافت دونوں کو غارت کرنا ہے فرحت کو افسوس ہے کہ اردو دنیا میں وہ وسیع شہرت حاصل نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق ہیں :۔

---

# چند ہم عصر[2]

مولوی عبدالحق صاحب کے چند مقالات، مرتبہ شیخ چاند ایم اے مرحوم طبع ثانی ۲۸۸ صفحات۔ تقطیع ۱۸×۲۲ قیمت مجلد ۶؍ غیر مجلد عہ؍
پتہ انجمن ترقی اردو دریا گنج دہلی۔
یہ ۱۷ معاصرین کے تذکرے اور ان کی زندگیوں پر تبصرے مولوی عبدالحق صاحب کے قلم سے ہیں۔ معاصرین میں سے اکثر تو مشاہیر ہی ہوئے ہیں مثلاً امیر مینائی، خبیث سید محمود

---

[1] صدق ۱۲ر جولائی ۱۹۴۲ء [2] صدق ۱۳ر جولائی ۱۹۴۲ء ۔

مولانا محمد علی، حالی اور بعض ایسے گمنام جیسے ایک باغ کا مالی نامدیو نامے اور بعض کا شمار نہ مشاہیر میں ہوسکتا ہے نہ گمناموں میں مثلاً وحیدالدین سلیم۔

یہ تذکرے زمانے کا بہت وسیع رقبہ گھیرے ہوئے ہیں یعنی ابتدا ۱۹۰۰ء سے ہوئی ہے اور انتہا ۱۹۴۳ء پر ظاہر ہے کہ ۴۰ و ۴۴ سال کی مدت میں انسان کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے اور اس کا قلم بھی کیا سے کیا ہو جاتا ہے اسکے علاوہ بعض صاحب ایسے تھے جن کے سامنے خود مولوی عبدالحق بچے تھے مثلاً امیر مینائی اور بعض ایسے جو خود ان سے جونیئر (چھوٹے) تھے مثلاً محمد علی یا ابن مسعود یہ کتاب کوئی مستقل تصنیف نہیں محض متفرق مضامین کا مجموعہ ہے چاہئے تو یہ تھا کہ اس کے مختلف حصوں میں بڑا تفاوت پایا جاتا اور نشیب و فراز کی مثالیں کثرت سے ملتیں۔ لیکن حیرت ہے کہ ایسا نہیں اور طرز اسلوب کی یکسانی و یک رنگی بڑی حد تک قائم ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب عموماً سادہ نویس و سنجیدہ نویس ہیں گویا حالی کے مثنیٰ لیکن جب مخلی بالطبع بول چال پر آتے ہیں تو مولویوں کے لئے بے تکلف (جعادری) کا لفظ بھی بول جاتے ہیں۔

ختم شد

دلی کے یادگار مشاعرے داستان پارینہ بن چکے ہیں
لکھنؤ کے تاریخی مشاعرے ماضی کی بھولی ہوئی یاد سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے
حیدرآباد کے امتیازی مشاعرے انقلابات زمانہ کے شکار ہو گئے — اور
رامپور کے شاہی مشاعرے تاریخ کی ایک رنگین کہانی بن کے رہ گئے ہیں
لیکن اگر آپ —
ان تمام مشاعروں کا ایک ہی نشست میں حظ اٹھانا چاہتے ہیں — اور
ولی دکنی سے آرزو لکھنوی تک ہر مشہور شاعر کا کلام خود انکی زبان سے سننا چاہتے ہیں — تو
نسیم بک ڈپو کی پہلی لاثانی ادبی پیشکش
مشاعرہ عالم ارواح
کا مطالعہ کیجئے
ایک ایسا چارٹ بھی جو ایک ہی نظر میں آپ کو بتا دے گا
نسیم بک ڈپو کا چیلنج
قیمت — چار روپئے